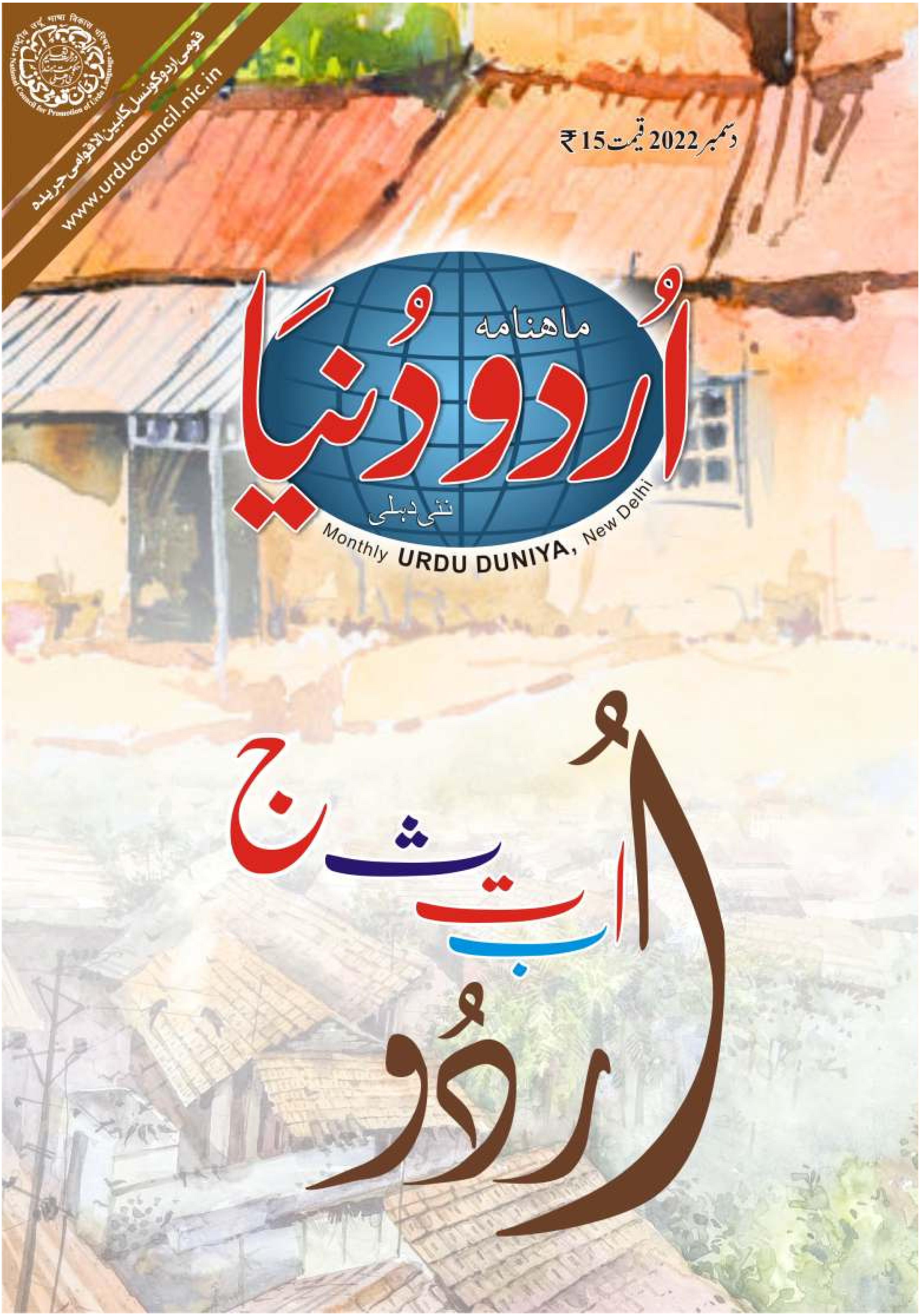

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in
دسمبر 2022 قیمت 15₹
ماہنامہ
اردو دنیا
نئی دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi
ا ب ت ث ج
اردو

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ بچوں کی دنیا دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
دلچسپ کہانیاں
سائنس و ٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین
صحتِ اطفال
بچّوں کا کتب کا خانہ

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ زبان شناسی

میرا بچپن ◆ بچوں کے بڑے ادیب

بچوں کی پینٹنگ ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

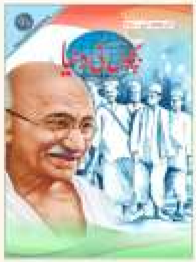

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے　　سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرتعاون سالانہ 100 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002 فون: 24415194 - 040

ماہنامہ
اردو دنیا
دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد: 24، شمارہ: 12، دسمبر 2022

مدیر : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد
مشیر : حقانی القاسمی
معاونین : عبدالرشید اعظمی، نایاب حسن

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارتِ تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند

مطبع:
ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت -/15 روپے سالانہ -/150 روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر
فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025
فون: 49539000 شعبۂ ادارت: 49539009

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی۔110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد۔500002
فون: 040-24415194

مشمولات

اداریہ
ہماری بات 4

خطوط
ربط والتفات — قارئین کے خطوط — 5

ادب: زاویے اور جہات
صغرا ہمایوں مرزا اور ان کی اصلاحی و ادبی خدمات — منظر اعجاز — 7
شبنمی نگاہ کا لافانی شاعر: میر تقی میر — امام اعظم — 11

آصف جاہی نظم و نسق میں فارسی اصطلاحات — جنید احمد — 13
اردو شاعری میں استادی اور شاگردی کی روایت — محمد صالح انصاری — 16
تانیثیت اور رشید جہاں کا تانیثی شعور — محمد ارشاد — 19

تحقیق میں مفروضے کی اہمیت — محمد عاطف — 22

یاد نارنگ
گوپی چند نارنگ کا لسانی و لسانیاتی شعور — درخشاں زریں — 25
نارنگ کی یاد میں — محمد موسیٰ رضا — 29

زبان و تعلیم
اکیسویں صدی اور ہمارا نصاب تعلیم — محمد اطہر حسین — 32

چراغ منزل
ہندوستان کا میزائل مین: ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام — ڈاکٹر جہانگیر احمد — 34

گہوارہ علم و دانش
دلی کالج کی تین صدیاں — شاہانہ مریم شان — 38

میور سنٹرل کالج اور الہ آباد یونیورسٹی — ندیم راعی مراد آبادی — 41

زبان اور زمینی صورت حال
زبان کی موت قوم کی موت ہے — خطاب عالم شاذ — 43

تاریخ
ایران کے صفوی سلاطین اور ان کے اجداد — امرین عزیز — 46

لعل و گہر
زلیخا حسین — محمد امان اے کے — 50
متین اچل پوری اور ماحولیاتی ادب — امیر حمزہ — 53

نگر نگر اردو
لداخ میں اردو فکشن — محمد شریف — 56

نیا آسماں نئے ستارے
ڈاکٹر محی الدین زور قادری کی لسانی خدمات — سوشیل کمار — 60

کتابوں کی دنیا
تعارف و تبصرہ — ادارہ — 65

خبر نامہ
اردو دنیا کی خبریں — ادارہ — 81

ہماری بات

یہ سچ ہے کہ نامساعد حالات کے باوجود اردو زبان و ادب کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو رہا ہے۔ بہت سے اجنبی علاقے اردو کے لیے مانوس ہوتے جا رہے ہیں۔ نئی بستیاں بھی آباد ہو رہی ہیں، دوسری زبانوں سے وابستہ افراد بھی اردو زبان و ادب کے تعلق سے گرم جوشی کا ثبوت دے رہے ہیں۔ انھیں یہ زبان بہت پیاری اور شیریں لگتی ہے اس لیے وہ نہ صرف اس زبان کی لفظیات بلکہ تراکیب سے بھی خصوصی دلچسپی لے رہے ہیں۔ روزمرہ کے استعمال میں بھی اردو الفاظ کی کثرت ہے۔ پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا میں بھی اردو الفاظ کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ اردو کے لیے یہ نیک فال ہے مگر جب ہم زبان کی زمینی صورت حال پر غور کرتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ بہت سی سطحوں پر ہمارے یہاں سرد مہری ہے۔ ہم زبان کے بنیادی مسائل و متعلقات پر گفتگو کرنے کے بجائے غیر ضروری اور فروعی مسائل میں الجھ کر رہ جاتے ہیں، خاص طور پر نظریات، تحریکات میں ہی توانائی صرف ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے زبان کی ترقی کے مسائل پر ہم سنجیدگی سے غور نہیں کر پاتے۔ اگر ہم صحیح طور پر محاسبہ کریں تو ہمیں پتہ چلے گا کہ اس زبان میں فروغ اور ترقی کے سارے امکانات موجود ہیں، پھر بھی ہم ان امکانات کی تلاش کے بجائے اپنا وقت اور سرمایہ ان پروگراموں میں صرف کرتے ہیں جن سے اردو زبان کو زیادہ فائدے کی امید نہیں ہوتی۔

اس وقت اردو زبان کی زمین کو زیادہ سے زیادہ مضبوط اور مستحکم کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے ہمیں ایک مربوط لائحہ عمل تیار کرنا ہوگا اور اس پر مکمل طور پر عمل کرنے کی کوشش کرنی ہوگی۔ ہمیں اردو زبان کے تعلق سے ایک بیداری مہم کا آغاز کرنا پڑے گا اور اس کے لیے پہلا پڑاؤ وہ علاقے ہیں جہاں اردو تعلیم کا ذرا بھی بندوبست نہیں ہے، خاص طور پر ان بچوں کو اس بیداری مہم کا محور و مرکز بنانا پڑے گا جو جھگی جھونپڑیوں یا آدی واسی علاقوں میں رہتے ہیں مگر ان کے لیے ذرائع اور وسائل میسر نہیں ہیں۔ ہمارے لیے ایک اچھی صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان بستیوں میں رہنے والی ایک بڑی آبادی کو اس کی طرف متوجہ کریں جن کی تعلیم و تربیت کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ اگر ہم ان بچوں کی تعلیم پر توجہ دیں، انھیں ہر طرح کی سہولیات بہم پہنچائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ اردو زبان و تعلیم سے اپنا تعلق نہ جوڑیں۔ ان کے درمیان اردو تعلیم کو رائج کرنے کی مضبوط اور منظم طریقے سے کوشش کی گئی تو مستقبل میں یہی اردو کے محافظ بن کر سامنے آئیں گے اور انہی کے ہاتھوں میں اردو زبان و ادب کا ورثہ محفوظ رہے گا کیونکہ ہمارے یہاں کا اشرافیہ طبقہ اب شاید اردو زبان سے اتنی دلچسپی نہیں لے رہا ہے کہ انھیں اپنے بچوں کا مستقبل پیشہ ورانہ کورسز یا دوسری زبانوں میں نظر آتا ہے۔ وہ اپنا اسٹیٹس قائم رکھنے کے لیے بھی اس زبان سے دوری بنائے ہوئے ہیں۔ اس لیے موجودہ وقت میں ضرورت ہے کہ ہم اپنا رخ تبدیل کریں اور ان علاقوں کی طرف جائیں جہاں اس زبان کے تعلق سے کسی طرح کا تحفظ اور تعصب نہیں ہے بلکہ انھیں ایک ایسی زبان کی ضرورت بھی ہے جس کے ذریعے وہ اپنے مافی الضمیر کا اچھی طرح اظہار کر سکیں اور اس زبان میں تعلیم حاصل کر کے اپنے مستقبل کو روشن کر سکیں۔

ہمارے یہاں اردو کی بہت سی تنظیمیں، ادارے ہیں جو اردو کے فروغ کے لیے کوشاں بھی ہیں اور ان کے اندر جذبہ بھی ہے، جنون بھی ہے۔ اگر ایسے ادارے ترجیحی طور پر جھگی جھونپڑیوں اور پسماندہ بستیوں میں اردو زبان کی تعلیم کا نظم کریں تو یہ اردو کی ایک بڑی خدمت ہوگی اور یہ وسائل و ذرائع کا بہترین مصرف بھی ہوگا۔ ہندوستان میں غربت کی شرح زیادہ ہے اور غریب طبقات تعلیم سے محروم ہیں، انھیں تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنا اور زندگی کے آداب سکھانا ہماری ذمے داری ہے۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ اپنی ذمے داریوں کو محسوس کرتے ہوئے ان طبقات کی طرف رجوع کریں اور ان کی زندگی کے معیار کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کریں اور اس کے لیے ایک ذریعہ زبان بھی ہے۔ انھیں اردو کے ساتھ دوسری زبانیں بھی سکھائی جائیں تاکہ وہ ہمارے ملک کی تہذیبی، ثقافتی وراثت کی قدر و قیمت کو محسوس کر کے اس کا تحفظ بھی کر سکیں۔

عقیل احمد

شیخ عقیل احمد

ربط والتفات

ماهنامه 'اردو دنیا' میں 'ربط والتفات' کے تحت قارئین کے خطوط شائع کرنے کا مقصد یه نهیں هوتا که محض ستائشی اور تحسینی کلمات لکھے جائیں بلکه رسالے کے مشمولات کے حوالے سے نئے مباحث پر گفتگو کو آگے بڑھانا هوتا هے۔ ماضی میں مکتوبات بهت سے مضامین سے بھی زیاده بیش قیمت هوتے تھے که ان میں مشموله مضامین کے تعلق سے نئے نکات و مباحث کی نشاندهی کی جاتی تھی۔

قارئین سے گذارش هے که ماهنامه 'اردودنیا' کے مشمولات کے حوالے سے بحث انگیز خطوط ارسال کریں اور ان نئے موضوعات، عنوانات، شخصیات اور علاقوں کی نشاندهی کریں جنهیں نظرانداز کیا جاتا رها هے۔ آپ کے خطوط همارے لیے بهت اهمیت کے حامل هوتے هیں، ان سے همیں رسالے کو خوب سے خوب تر بنانے میں مدد ملتی هے۔ (اداره)

✍ 'اردو دنیا' نومبر کے خوبصورت سرورق پر نیل گوں پہاڑوں پر دودھیا برف کے حسین پس مناظر کے ساتھ معیاری ومنتخب مشمولات سے یہ ناچیز ازحد متاثر ومرعوب ہوا ہے۔

اس میں محترمہ عرشیہ جبیں کا ساحرلدھیانوی کی شاعری میں پیکر تراشی جیسے نازک خیال پر ایک عمیق مطالعے کا ضامن مضمون شائع کیا گیا ہے۔ اس شاعر کی شاعری میں جذبات کی نا امیدی ((سورج کے لہو میں لتھڑی ہوئی وہ شام') کے ساتھ ہمیشہ ہمیں رجائیت پسندی ('کس کے روکے رکے گا وہ سویرا') کا مطلوبہ توازن بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ یہی وہ وصف ہے جو اس شاعر کو دیگر شعرا سے الگ مقام دیتا ہے۔ بقول ساحر 'دنیا نے

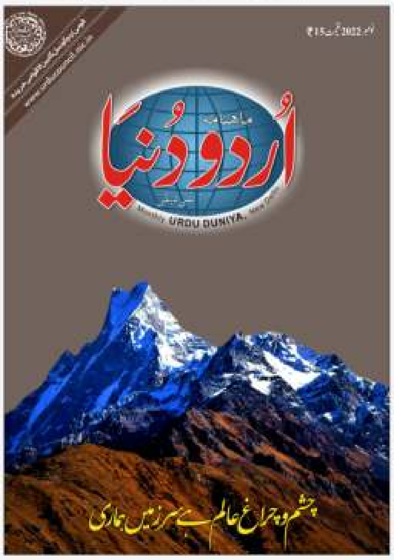

تجربات وحوادث کی شکل میں، جو کچھ مجھے دیا ہے، وہ لوٹا رہا ہوں میں۔''

شمارے میں ندا فاضلی کی شاعری میں جدید نظم نگاری کے زاویے سے جذبات کو تو مرتسم کیا ہی گیا ہے، مستزاد، شہری ماحول کی عکاسی کرتے ہوئے دیہی کرداروں کو بھی بخوبی نشان زد کیا گیا ہے، مثلاً ''یاد آتی ہے چوکا، باسن، چمٹا، پھکنی جیسی ماں۔۔''

شمارے میں محترمہ حسینہ خانم کا مضمون 'طاؤس چمن کی مینا': جذباتی رشتوں کا پُر اثر بیانیہ' بہت وقیع ہے۔ ہندوستان پر تقریباً دو تین سو سال تک انگریزی حاکموں کا حکومت کرتے ہوئے ہندوستانیوں پر تسلط قائم کرنا اور ظلم وتشدد کی تاریخ رقم کرنا تھا۔ اسی تاریخ کو نیر مسعود نے اپنے افسانے 'طاؤس چمن کی مینا' میں راوی کالے خاں اور اس کی دختر فلک آرا کو ایک علامت سے قارئین کے روبرو کیا ہے، جو کہ کمال کی ایک فنی ترکیب ہی گردانی جائے گی۔ محترمہ حسینہ خانم نے ان کے افسانے 'طاؤس چمن کی مینا' کا تبصرہ کرکے گویا ایک جینوئن ادیب کی بے بہا شخصیت کو روشن کرنے میں کامرانی حاصل کی ہے۔

✍ **ڈاکٹر کرشن بھاؤک** : کوٹھی نمبر 201-A، گورونانک نگر گلی نمبر 18-K، 201-A، پٹیالہ (پنجاب)

✍ ماہنامہ اُردو دُنیا نومبر 2022 کے خوبصورت سرورق کے ساتھ اندرونی صفحات پر جو جاذبیت ودلکشی پیدا کی گئی اس سے طبیعت میں فرحت آئی۔ نومبر کے شمارے میں شائع ہونے والی اکثر تحریریں کلاسیکی ادب کی تاریخ دہراتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ ہماری بات میں ڈائرکٹر شیخ عقیل احمد نے ہندوستان کی عظمت پارینہ کے سنہرے اوراق دہرائے۔ ربط والتفات میں شامل ڈاکٹر کرشن بھاؤک، ڈاکٹر محمد ناظم علی کے خطوط جامع اور نہایت معلوماتی ہیں اور مختصر تبصرہ کی صورت میں ہیں۔ محمد وحید الدین کا مضمون داستانوں کے مافوق الفطری تصورات کا ٹیکنالوجی میں اطلاق، انتہائی شاندار اور بہت زیادہ معلوماتی وقت کی رفتار پر مبنی ہے۔ مرزا غالب نے داستان کے تعلق سے جو لکھا اسے حوالے کے ساتھ فاضل مضمون نگار نے نقل کیا اچھا لگا۔ ''داستان طرازی من جملہ فنونِ سخن ہے۔ سچ یہ ہے کہ دل بہلانے کے لیے اچھا فن ہے۔'' ڈاکٹر محمد وحید الدین نے جس طریقے سے کھل جا سم سم، سنسر کی مدد سے ازخود کھلنے والا دروازہ، الہ دین اور چراغ، روبوٹ، مشینی گھوڑا، ہوائی جہاز کے گیئر کاک پیٹ، جدید ٹیکنالوجی میں اس کا استعمال، اڑنے والا غلیچہ یا قالین، جمشید کا پیالہ، ہم شکل اختیار کرنا جیسے فکر انگیز موضوعات پر مدلل گفتگو کی ہے۔ اپنے مضمون کے آخری پیراگراف میں لکھتے ہیں یہ بات صد فیصد درست ہے کہ سائنس اور فکشن دو متضاد تصورات ہیں، سائنس حقیقی عناصر سے بحث کرتی ہے جبکہ فکشن خیالی وتصوراتی ہوتا ہے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ جب تک سائنس کو کوئی تصور نہیں ملتا وہ اس حقیقت تک نہیں پہنچ سکتی۔ یہ مضمون قابل مطالعہ ہے اور لائق استفادہ بھی کیونکہ وقت کے ساتھ ادب کی ضرورت اس مضمون کا ہر ایک پیراگراف ہے، سائنسی

ادب ہمارے مزاج کا بھی حصہ ہے، اس لیے ایسی تحریروں سے خاص قلبی لگاؤ رہتا ہے، محمد وحید الدین کو مبارکباد۔ نایاب حسن نے اپنے مضمون میں رضوان اللہ فاروقی قصہ ٔ ما مشعلے روشن کندراہِ صواب! میں کئی اہم جانکاری دی، مجھ جیسے نہ جانے کتنے طفل مکتب اس تحریر سے رضوان اللہ فاروقی (مرحوم) کے تعلق سے معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ 'زبان اور زمینی صورت حال' میں منظور احمد گنائی سے ملاقات کے بعد کشمیر کے تعلق سے اردو زبان کے فروغ، ترویج واشاعت اور ترقی کے امکانات کا اندازہ لگا۔ کتابوں کی دنیا تعارف وتبصرہ سے اردو زبان وادب کی سمت ورفتار اور قلمکاروں کے تخلیقی رجحانات کا اندازہ ہوتا ہے، یہ سلسلہ بہت ہی مقبول ہوتا جارہا ہے، خدا کرے نظر بد نہ لگے، مدیر مشیر اور معاونین ستائش کے حقدار ہیں۔ اس مرتبہ 12 کتابیں شامل کی گئیں، کتب کا انتخاب واقعی غیر معمولی کام ہے، اس کے لیے شعبۂ ادارت کے علاوہ کمپوزنگ اور ڈرائنگ کے کام سے جڑے حضرات بھی مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں اردو دنیا میں دیا جانا واقعی بڑا ہی جانفشانی اور عرق ریزی کا کام ہے۔ اردو زبان کے ارتقائی سفر پر اس طرح گہری نظر رکھنا قومی اردو کونسل سے وابستہ جملہ احباب کا ہی کام ہے، علمی وشعوری، فکری صلاحیتوں کا ہر مہینے امتحان اس ادارے کو دینا ہوتا ہے، سبھی لوگ اپنے اپنے کام دلجمعی سے کرتے ہیں تبھی اردو دنیا اردو کی دنیا میں مقبول ہے۔

ماسٹر حبیب سیفی: پہلی منزل، E1251B، حوض رانی، مالویہ نگر، نئی دہلی 17

مدیر صاحب نے ہماری بات میں قومی یکجہتی اور مشترکہ قدروں کو پروان چڑھانے کی بات کی ہے، یہاں کی تہذیب، کئی ہزار سال پرانی ہے، ہمارا ملک قدرتی وسائل سے مالا مال ہے، یہاں کی فضا پر سکون ہے، ہمیں کما حقہ استفادہ کرنا چاہیے۔ چکبست کی نظم خاک وطن کا بند جس میں وطن پرستی کے جذبات ہیں آج ضرورت ہے کہ ہم تمام باشندگان ہند ہندوستان کی عظمت پارینہ کی بازیافت کے لیے کوشش کریں اور اس ملک کی قدیم تہذیبی ثقافتی روایت کو زندہ کریں کہ اس سے ہمارے ملک کی پوری دنیا میں شناخت ہے۔ ربط والتفات کا کالم تنقیدی تحقیقی شعور عطا کرتا ہے۔ کچھ تو نئے انکشافات ونکات ملتے ہیں۔ منظور احمد گنائی نے اپنے انٹرویو میں کہا کہ زبان کو زندہ رکھنے کے لیے مقتضائے وقت اور عصری مطالبات کا التزام ضروری ہے۔ بے شک وہی زبان زندہ رہے گی جو عصری حالات سے ہم آہنگ ہوجائے۔ وقت کا تقاضا بھی ہے کہ اردو بھی عصری تکنالوجی اور عصری بدلتے حالات کے شانہ بہ شانہ چلے۔ م ن سعید نے ڈراما انارکلی میں ڈرامائی کنایہ مضمون میں ایک نئی جہت سے آشکار کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں ڈرامائی کنایہ ڈرامہ نگاری میں کسی مطلق حیثیت کا حامل نہیں ہوتا لیکن کسی ڈراما کی ڈرامائیت کو فزوں تر کرنے کا سبب ضرور بن جاتا ہے۔ عرشیہ جبین نے 'ساحر لدھیانوی کی شاعری میں پیکر تراشی' ایک عمدہ مضمون تحریر کیا ہے۔ ڈاکٹر شاہ عالم کا میراجی کی فکری جہات پر عمدہ مضمون ہے۔ مجاہد الاسلام نے اردو کے دخیل الفاظ اور رشید حسن خاں میں لفظ مخرج، املا، تلفظ پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ ان کے علاوہ شمارے میں شامل دیگر مضامین بھی پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد ناظم علی: مکان نمبر 335-7-17، برہمن واڑی، یاقوت پورہ، حیدرآباد، تلنگانہ

■

جن کتابوں نے متاثر کیا

ماہنامہ 'اردو دنیا' کا نیا سلسلہ

ہزاروں کتابوں میں چند ہی کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو آپ کے ذہن و دل کی دنیا بدل دیتی ہیں۔ ایسی کتابوں کی قوت، اہمیت و معنویت کو قارئین سے شیئر کرنے کے لیے 'اردو دنیا' میں ایک نیا سلسلہ شروع کیا جارہا ہے جس میں مختلف اصناف پر مشتمل نئی اور پرانی کتابوں کے بارے میں صاحبانِ علم و ہنر یہ بتائیں گے کہ کن کتابوں نے انھیں متاثر کیا ہے۔

صاحبانِ ذوق کتاب کے اسلوب، موضوع اور دیگر تلازمات کے علاوہ یہ بھی بتائیں گے کہ یہ کتابیں کیوں پڑھنی چاہئیں۔ آپ نے ابھی تک جتنی کتابیں پڑھی ہیں ان میں سے چند کا انتخاب کیجیے اور اپنے مطالعاتی سفر میں ان افراد کو بھی شامل کیجیے جن تک شاید ان کتابوں کی رسائی نہیں ہوپاتی ہے۔ منتخب کتابوں کے تعلق سے اپنے منطقی و معروضی خیالات اور تاثرات ہمیں لکھ بھیجیے۔

بیگم صغرا ہمایوں مرزا اور ان کی اصلاحی ادبی خدمات

منظر اعجاز

بیگم صغرا ہمایوں مرزا اصلاحی تحریک سے متاثر تھیں۔ ان کے ناول، افسانے اور مضامین اصلاحی اور اخلاقی نوعیت کے ہیں۔ لیکن وہ ڈپٹی نذیر احمد اور مصورغم راشدالخیری کے حصار اثر سے نکلتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اردو کے حوالے سے وہ 'نسائیت کی تحریک' کی علمبردار ہی نہیں، بلکہ بنیاد گزار بھی قرار دی جاسکتی ہیں۔ عورتوں کی صلاحیت و قوت کی افزودگی یعنی Women Empowermenکے نقطہ نظر سے ان کے کارنامے بے مثال اور لازوال ہیں۔

اردو کی خواتین فکشن نگاروں میں اولیت کا سہرا رشیدۃ النسا بیگم کے سر ہے جن کا ناول 'اصلاح النسا' انیسویں صدی کے ربع آخر میں تخلیق وطبع ہوا۔ ان کا تعلق سرزمین بہار سے تھا۔ لیکن بیسویں صدی کے اوائل میں جن خواتین نے اردو فکشن کی تخلیق اور ترویج وتوسیع میں خصوصی دلچسپی لی ان میں بیگم صغرا ہمایوں مرزا منفرد شخصیت اور ممتاز مقام ومرتبے کی حامل ہیں۔ اس لیے کہ ان کا دائرہ کار ناول نگاری اور افسانہ نویسی تک محدود نہیں، وہ شاعرہ بھی تھیں۔ حیا تخلص کرتی تھیں۔ شاعری کے سلسلے میں انہیں علامہ اقبال سے تلمذ کا شرف حاصل ہوا۔ لیکن سب سے بڑھ کر قومی اور ملی خدمات بالخصوص تحریک تعلیم نسواں کے سلسلے میں ان کے کارنامے آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔ فارسی اور اردو کے علاوہ وہ انگریزی تعلیم سے بھی بہرہ ور تھیں۔ انھوں نے ہندوستان کے مختلف خطوں کے علاوہ مشرق ومغرب کے کئی ممالک کی بھی سیر وسیاحت کی جس کے گواہ ان کے کئی سفرنامے ہیں۔ ان کی تصانیف کی مجموعی تعداد پندرہ بتائی جاتی ہے جن میں سفرناموں کے علاوہ ناول، افسانے اور مضامین و مقالات بھی ہیں۔ علاوہ بریں وہ کئی کتابوں کی مرتبہ بھی رہیں۔ کئی کتابوں کے دیباچے اور تبصرے بھی لکھے۔ اور یہ کارنامہ انہوں نے نہ صرف اردو میں بلکہ انگریزی میں بھی انجام دیا۔ وہ اپنے زمانے کی سب سے زیادہ پڑھی لکھی خاتون تھیں۔ شاد عظیم آبادی انھیں سرتاج خاتونانِ ہند کے لقب سے یاد فرماتے تھے۔

بیگم صغرا ہمایوں مرزا اصلاحی تحریک سے متاثر تھیں۔ ان کے ناول، افسانے اور مضامین اصلاحی اور اخلاقی نوعیت کے ہیں۔ لیکن وہ ڈپٹی نذیر احمد اور مصورغم راشدالخیری کے حصار اثر سے نکلتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اردو کے حوالے سے وہ 'نسائیت کی تحریک' کی علمبرداری نہیں، بلکہ بنیادگزار بھی قرار دی جاسکتی ہیں۔ عورتوں کی صلاحیت وقوت کی افزودگی یعنی Women Empowerment کے نقطۂ نظر سے ان کے کارنامے بے مثال اور لازوال ہیں۔

بیگم صغرا ہمایوں مرزا حیدرآباد کی بیٹی اور عظیم آباد کی بہو تھیں۔ ان کی ولادت 1884 میں حیدرآباد میں ہوئی۔ والدہ کا نام مریم بیگم تھا جو سید علی رضا صاحب کمانڈنگ افسر ڈی لارنس کی بیٹی اور ڈاکٹر صفدر علی مرزا صاحب سرجن کیپٹن افواج باقاعدہ سرکار عالی کی زوجہ تھیں۔

صغرا بیگم ہمایوں مرزا کی شادی 1901 میں سید ہمایوں مرزا متوطن عظیم آباد سے ہوئی جو بیرسٹرایٹ لا اور ادیب وشاعر بھی تھے تخلص حقیر تھا۔ وہ سید شاہ الفت حسین فریاد عظیم آبادی کے صاحبزادے تھے۔ انھوں نے حیدرآباد ہی میں مستقل سکونت اختیار کرلی تھی۔ جب کہ بمقام گنج عظیم آباد میں وہ 1870 میں پیدا ہوئے تھے۔ حیدرآباد میں ان کے نام پر ہمایوں نگر آباد ہوا۔ اخیر عمر میں فالج گرا۔ تقریباً ڈھائی سال تک ذی فراش رہے۔ 1938 میں انتقال ہوا۔ ہمایوں نگر میں مدفون ہیں۔ ان کی بیگم صغرا ہمایوں مرزا نے عالیشان مقبرہ تعمیر کرایا۔ ان کی خودنوشت سوانح عمری 'میری کہانی میری زبانی' کو اپنے دیباچے کے ساتھ شائع کیا۔ 1959 میں صغرا ہمایوں مرزا کا بھی وہیں انتقال ہوا۔ ان کی تصنیف 'تعلیم نسواں' کا قطعہ تاریخ طبع شاد عظیم آبادی نے فارسی میں تحریر کیا تھا جو 'باقیاتِ شادؔ' مرتبہ سید نقی احمد ارشاد میں بھی شامل ہے۔ اس کے مطالعے سے الفت حسین فریاد، ہمایوں مرزا اور بیگم صغرا ہمایوں مرزا کی شخصیتیں بے کم وکاست ہمارے سامنے آجاتی ہیں۔ استفادۂ عام کی غرض سے قطعہ تاریخ پیش خدمت ہے۔

اخی سید ہمایوں میرزا نام　　نگہدار دخدا او را بہ عزت
ادیب وفاضل وبیرسٹرایٹ لا　　گلے از گلبنِ باغ سیادت
ہمایوں یادگار اوستادم　　چہ استادے کہ او خضرِ طریقت
جناب حضرت فریاد مغفور　　ملک در شکل انساں فی الحقیقت

سید ہمایوں مرزا چونکہ شاد کے استاد فریاد کے فرزند ارجمند تھے اس لیے انہیں شاد نے بھائی کہا ہے اور ان کے لیے تعریفی وتوصیفی کلمات استعمال کیے ہیں جن سے مدح سرائی کا جذبہ مترشح ہے۔ بعد کے چند اشعار میں ملک سرشت فریاد کے علم وفضل پر شاد نے اس طرح روشنی ڈالی ہے۔

محقق ہم چو او نایاب در دہر　　ہما نادر ادب سعدی سریاست
ہزاروں بہ زمن تلمیذ او را　　فزائی شان اویارب بہ جنت
کئی محشور با آباش او را　　زتربت چوں برآید در قیامت

آخری دعائیہ مصروں پر فضائل ومناقب فریاد کا باب بند ہوتا ہے۔ اس کے بعد سید ہمایوں مرزا کی بیگم صغرا ہمایوں مرزا کا تعارف اور ان کی کتاب کا ذکر ہے۔ کلمات

تعارفی اور اسلوب مدحیہ ہیں۔ تعداد اشعار اتنی ہی یعنی سات ہے جتنی کہ فریاد اور ہمایوں مرزا کے لیے وقف ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں۔

غرض خاتونِ آں اخِ گرامی
کہ آمد حجلہ پردازِ سعادت
ادیب و شاعرِ انشا نگارے
الٰہی بر خورد از عمر و دولت
عجب زیبا کتابے کرد تصنیف
کہ باشد مایۂ صد گونہ حیرت
گرامی نسخۂ ''تعلیمِ نسواں''
ہمایوں نامۂ پند و نصیحت
چو شد مطبوعِ عالم گشت مطبوع
جہاں را تازہ شد نورِ بصیرت
مرا اے شاد در دل حاصل آمد
ازیں تصنیف صد فخر و مسرت
بگفتم سال طبعش از سرِ جاں
فزودہ از پئے اخلاقِ زینت [1]
1321ھ = 3 - 1324ھ

اس لحاظ سے تعلیم نسواں کی تاریخ طبع 1321ھ ہے۔ جب کہ سال رواں 1435ھ ہے۔ گویا ہجری سنہ کے لحاظ سے یہ کتاب آج سے ایک سو چودہ سال پہلے طبع ہوئی۔ یہ کتاب ہے یا کتابچہ؟ نہیں کہا جاسکتا کیوں یہ میری نظر سے نہیں گزرا اور یہ صغرا ہمایوں مرزا کی تصنیفات و تالیفات کی فہرست میں بھی شامل نہیں۔ البتہ صغرا بیگم کی تصنیف 'تحریر النسا' کا ایک باب 'تعلیم نسواں' ہے۔ 'تحریر النسا' کا تیسرا ایڈیشن 1930 کا مطبوعہ ہے۔ اس کا مقدمہ خط نویسی کی تدریس پر مشتمل ہے جو 25 اگست، 1909 کا مرقومہ ہے۔ کتاب ڈیمائی سائز کے 120 صفحات پر مشتمل ہے۔ ممکن ہے اس کتاب کے باب 'تعلیم نسواں' کو کتاب یا کتابچے کی صورت میں الگ سے کبھی شائع کیا گیا ہو یا پھر تسلیم نسواں کا عنوان مجوزہ عین طباعت کے وقت بدل کر 'تحریر النسا' کر دیا گیا ہو۔ یہ سب محض قیاس آرائیاں ہیں۔ لیکن اس حوالے سے اتنی بات یقینی طور پر سمجھی جاسکتی ہے کہ بیگم صغرا ہمایوں کا محورِ فکر اور مرکز نگاہ ان مختلف النوع اور مختلف الاصناف تحریروں میں، عورتوں کی اصلاح ہے۔ یہ اس زمانے کا غالب ادبی رجحان تھا جس کی ابتدا ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں سے ہوئی تھی اور مصورِ غم راشد الخیری نے جسے پروان چڑھایا تھا۔ اس رجحان کو فروغ دینے میں خواتین اہل قلم بھی سرگرم و فعال تھیں۔ اور خواتین کی اس فعالیت کا اظہار پہلی بار رشیدۃ النسا کے ناول 'اصلاح النسا' سے ہوا تھا۔ لیکن اصلاح النسا نذیر احمد کے دائرۂ اثر سے باہر نہ تھا۔ نذیر احمد کا دائرۂ فکر ونظر مشرقی روایات تک محدود تھا۔ راشد الخیری نے اس روایت کی توسیع ضرور کی لیکن انھوں نے بھی خود کو مشرقی روایات کا پابند رکھا۔ اور اپنے اثرات کا دائرہ وسیع کرتے رہے۔ چنانچہ بیسویں صدی کے رُبع اول میں جن خواتین ناول نگاروں اور افسانہ نویسوں نے اپنے قلم کے جوہر دکھائے، ان پر نذیر احمد اور راشد الخیری کے نقطہ نظر اور تخلیقی رجحان کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ بعض خواتین مثلاً نذر سجاد حیدر اور حجاب امتیاز علی کے یہاں قصے کی فضا پر جدید دور کے اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ ماحول اور معاشرہ تبدیل ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ انگریزی مصنوعات کے استعمال کی طرف ایلیٹ مسلم سوسائٹی کا بڑھتا ہوا رجحان نظر آتا ہے۔ مثلاً گراموفون، بائیسکل، ٹیلی گرام، ٹیلی فون وغیرہ۔ حجاب امتیاز علی ہوائی جہاز اڑاتی ہیں۔ یعنی یہ خواتین اپنے قصے، کہانیوں میں مثالی نسوانی کردار کے طور پر ضرور ابھرتی ہیں لیکن طبقۂ نسواں کے مشیر کے طور پر کردار ادا نہیں کرتیں جب کہ بیگم صغرا ہمایوں مرزا کا بنیادی اختصاص یہی ہے۔ ان کا زور بطور خاص مشرقی اور مغربی روایات کی ہمکاری اور امتزاج پر ہے لیکن روایات سے مراد وہ معاشرتی اور اخلاقی قدریں ہیں جو باہم متضاد اور متصادم نہیں۔ یہاں مغربی تعلیم و تہذیب کے عناصر اور اثرات مشرقی سوسائٹی میں جلوہ ریز ہیں۔ لیکن مشرقی روایات کے فرسودہ تکلفات سے بیزاری اور انحراف بلکہ احتجاج کی صورت بھی دکھائی دیتی ہے حالانکہ فکر میں سنجیدگی اور اسلوب و لہجے میں متانت اور شائستگی بھی نظر آتی ہے۔

بیگم صغرا ہمایوں مرزا کا ناول 'زہرہ' جو 'مشیر نسواں یا زہرہ' کے نام سے بھی روشناس حلقۂ ادب ہے، گرچہ میری نظر سے نہیں گزرا لیکن اس کے حوالے کئی کتابوں میں ملتے ہیں۔ اس کا اشتہار، اکابر کے تاثرات اور تبصرے یا ان کے اقتباسات نظر سے گزرے ہیں۔ یوسف سرمست نے 'بیسویں صدی میں اردو ناول' میں اس کا ذکر کیا ہے۔ متن سے مختصر حوالہ بھی دیا ہے۔ اور کتابیات کی فہرست میں اس کا سال اشاعت 1906 درج کیا ہے۔ وہ اس ناول کے بارے میں لکھتے ہیں:

''زہرہ میں انگریزی وضع پر آراستہ مکان ملتے ہیں اور ساتھ ہی یہ تعلیم بھی دی جاتی ہے کہ کسی قوم کے رسم و رواج کی آنکھیں بند کر کے تقلید کرنی فضول ہے۔ البتہ اس کے ہنر دیکھنے چاہئیں۔''[2]

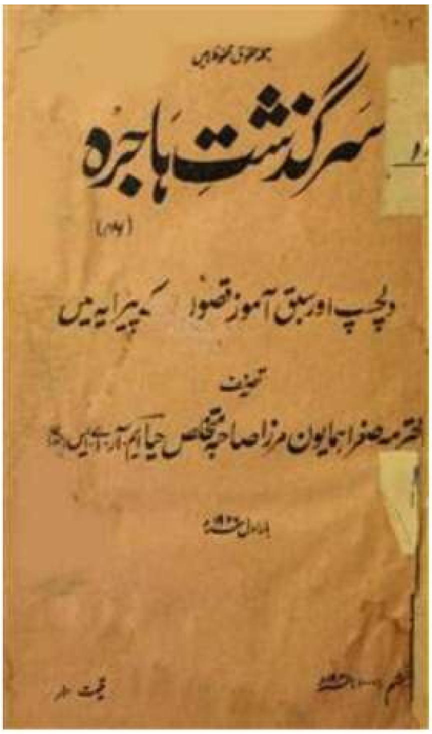

بیگم صغرا ہمایوں مرزا کا ناول 'سرگذشت ہاجرہ' 1926 میں شائع ہوا۔ 'بیسویں صدی میں اردو ناول' کی فہرست کتب میں یہی سال درج ہے۔ میری نظر سے اس کا دوسرا ایڈیشن (دفتر 'عصمت'، دہلی، 1930 کا مطبوعہ) گزرا ہے۔ دوسرے ایڈیشن میں پہلے ایڈیشن کا دیباچہ شامل ہے اور دوسرے ایڈیشن کا دیباچہ بھی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلا ایڈیشن چار سال قبل یعنی 1926 میں شائع ہوا تھا۔ اس دوسرے ایڈیشن میں اکابر ادب کی رائیں، تاثرات اور اخبارات و رسائل کے تبصرے یا مختصر اقتباسات 'سرگذشت ہاجرہ' اور 'زہرہ' کے سلسلے میں بھی درج ہیں۔ 'زہرہ' کے سلسلے میں دفتر عصمت کے مالک کا یہ نوٹ قابل لحاظ ہے:

''مشیر نسواں یا زہرہ'' ایک دلچسپ اخلاقی ناول (ہے) جس میں لڑکیوں کو بہت سی بیش بہا اخلاقی باتیں بتائی گئی ہیں۔ قصہ دلچسپ اور نتیجہ خیز ہے۔ طرز بیان بے حد آسان۔ اکابرین قوم نے جسے پڑھ کر حسب ذیل ریویو کیے ہیں۔ علامہ شبلی نے اسے پڑھ کر فرمایا تھا کہ ''یہ کتاب محاسن سے مملو اور معائب سے بالکل پاک ہے۔''[3]

مخبر دکن کا ریویو: ''عورتوں کے لیے نہایت دلچسپ ناول ہے۔''[4]

شوکت اسلام کا ریویو: بے نظیر ناول ہے جس میں عورتوں کی ہر حالت اور ہر عمر کے متعلق نصائح اور معلومات کا ذخیرہ نہایت دلچسپ اور پر لطف طریقہ سے بیان کیا گیا ہے۔''[5]

'مشیر نسواں یا زہرہ' پر اخبار 'زیب نسواں' کا ریویو:

''اس قصہ کو مصنفہ نے نہایت دلچسپ اور پرلطف طریقہ سے بیان کیا ہے۔ مصنفہ کو اس تصنیف پر تمغہ طلائی دیا گیا تھا۔''[6]

عہد متعلقہ کی خواتین ناول نگاروں نے مشرقی اور مغربی تمدنی قدروں کی ہمکاری اور امتزاج کی شعوری

کاوشیں کیں۔ مسلم ایلیٹ کے روابط و مراسم انگریزی سوسائٹی سے بھی تھے چنانچہ اس سوسائٹی کے مجلسی آداب سے واقفیت ضروری سمجھی گئی۔ اس رجحان کے بنیاد گزار یا رجحان ساز سرسید، ان کے رفقا یا ان کی اصلاحی تحریک تھی۔ لیکن متوازی خطوط میں اس کے برعکس بھی ایک تحریک چل رہی تھی جس کے اہم نمائندہ اکبرالہ آبادی تھے۔ ڈپٹی نذیر احمد بھی اس نقطۂ خیال کے حامل تھے۔ راشدالخیری کے تخلیقی ذہن پر بھی اس کا خاصا اثر تھا۔ انگریزی تہذیب کے اختیار کرنے والوں کو 'کرسٹان' قرار دیا جاتا تھا اور ان کے معاشرتی مقاطعے کی تجویز پیش کی جاتی تھی اور بعض اوقات فتاوے بھی صادر کیے جاتے تھے۔ اس وجہ سے نئی تہذیب کے مسلم پیش رووں اور پیر وکاروں نے اپنے مذہبی تشخص کے حفظ و بقا کی بھی کوشش کی۔ اور اپنی روایتی تہذیب یا تہذیبی روایات سے بھی منحرف نہیں ہونا چاہا۔ انھوں نے مغربی و مشرقی تمدنی قدروں میں اخلاقی نقطہ نظر سے مماثلت دریافت کرنے اور معاشرتی امور میں اسے بروئے کار لانے کی کوشش کی۔ اس طبقے کی مستورات نے اسی نقطۂ خیال سے تعلیم کی تحصیل کی طرف بھی توجہ کی۔ یعنی اردو اور فارسی تعلیم کے ساتھ ساتھ انگریزی تعلیم کی طرف بھی توجہ مبذول ہوئی۔ اسی نہج پر مستورات کی تربیت کی بھی کوشش ہوئی۔ بیگم صغرا ہمایوں مرزا کی تعلیم بھی پہلے دستور زمانہ کے مطابق اردو اور فارسی میں گھریلو طور پر ہوئی۔ اس کے بعد انھوں نے انگریزی کی تعلیم بھی حاصل کی اور انگریزی میں اچھی خاصی دستگاہ حاصل کی۔ یہاں تک کہ 'رباعیات شاذ' پر اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں تعارف و تبصرہ لکھا۔ انھوں نے اپنے شوہر سید ہمایوں مرزا کے ساتھ مشرق و مغرب کے مختلف ممالک کی سیر و سیاحت کی تھی اور وہاں کی تہذیب و معاشرت کا غائر مطالعہ کیا تھا۔ وہ اپنے زمانے کی مسلم مستورات میں سب سے زیادہ پڑھی لکھی خاتون تھیں۔ سب سے زیادہ باشعور، ہوش منداور باخبر خاتون تھیں ان کی نظر عالمی منظرنامے پر بھی گہری تھی۔ جس کا اندازہ ان کی مختلف النوع تحریروں سے ہوتا ہے۔ لیکن ان کی تمام تحریروں اور تحریکوں کا مقصد ایک ہی ہے اور وہ ہے تعلیم نسواں۔ وہ بحیثیت افسانہ نویس اور ناول نگار مشیر نسواں کے طور پر ابھرتی ہیں اور اپنے افسانوی کرداروں کے ذریعے بھی اسی مشن کی تکمیل پر عمل پیرا نظر آتی ہیں۔ وہ اس عہد کی روشن خیال خواتین کی وکالت کرتی ہیں۔ ان کے موقف کا اظہار خود ان کی زبان سے بھی ہوا ہے اور ان کے کرداروں کے ذریعے بھی۔ کرداروں کی زبان سے بھی اور ان کے طرز عمل سے بھی۔ اس سلسلے میں 'سرگذشت ہاجرہ' کا یہ بیان توجہ طلب ہے:

''آداب مجلس و آداب سوسائٹی مشرقی اور مغربی دونوں طریقوں سے تمہاری ماں نے تم کو ماہر کرادیا۔''[7]

'سرگذشت ہاجرہ' میں ہاجرہ ایک معزز گھرانے کی لڑکی ہے جس کی شادی ایک ایسے حیدرآبادی امیر سے ہوئی جو روش زمانہ کے مطابق شراب نوشی اور عیش و عشرت کے شغل میں مصروف تھے۔ مگر تربیت یافتہ ہاجرہ کی سلیقہ مندی اور حسن اخلاق سے وہ رفتہ رفتہ شاہد و شراب سے باز آ گئے، اور خداشناس و پرہیزگار بن گئے۔ ہاجرہ کی ایک سہیلی کے شوہر کا بھی حال ایسا تھا کہ وہ مختلف قسم کی اخلاقی کمزوریوں اور سماجی برائیوں میں مبتلا اور اپنی بیوی سے بے پروا تھا۔ ہاجرہ کے حالات سن کر اس کی سہیلی کو بھی خیال آیا کہ وہ بھی اسی تدبیر سے اپنے شوہر کو راہ راست پر لانے کی کوشش کرے۔ حالانکہ وہ پہلے اپنے شوہر سے بدسلوکی سے پیش آتی تھی۔ اب اس نے بھی حسن سلوک کا مظاہرہ کرنا شروع کیا اور اپنے مقصد میں کامیاب ہوئی۔ ہاجرہ کی اس سہیلی کا نام مسزعون تھا۔ اس کی ایک اور سہیلی سارا اس صلاح و مشورہ میں شریک تھی جب آپ بیتی سنانے کا سلسلہ چلا تو سارا نے اپنی کہانی سنائی۔ جگت استانی کے نام سے مشہور ایک جہاں دیدہ بڑھیا ان سے ملنے آئی۔ سب نے اسے مجبور کیا کہ وہ بھی اپنی کہانی سنا کر اس زنانہ قصۂ چہار درویش کو مکمل کرے۔ ان چار سادہ کہانیوں کو ایک دوسرے سے مربوط کرکے سلیس اردو میں پیش کیا گیا ہے۔ جو خاص طور سے لڑکیوں کے لیے مفید اور پڑھنے کے لائق ہے۔ باتوں باتوں میں کئی اخلاقی سبق دیے گئے ہیں۔ کئی ملکی مسئلے بھی معقولیت کے ساتھ اس گفتگو میں حل ہوئے ہیں۔ مجموعی طور پر بیگم صغرا ہمایوں مرزا کی یہ ادبی کوشش قابل داد ہے۔ اس ناول کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''ایک نہایت حسین لینڈو گاڑی جس میں مشکی رنگ کے دلیر گھوڑوں کی جوڑی جتی ہوئی ہے۔ ایک خوبصورت و عالی شان کوٹھی میں جو ایک خوش منظر مقام پر واقع ہے جس کا چمن اقسام کے پھول پتوں سے لہلہار ہا ہے، داخل ہوئی سیدھی زنانہ ڈیوڑھی پر جا کر کھڑی ہوئی۔ ڈیوڑھی دارنی نے اندر جا کر خبر کی۔ ایک پیش خدمت کو صاحب خانہ نے حکم دیا کہ جا کر سواری اتارو، جو بیوی اس گاڑی میں آئی تھیں اتر کر محل سرا میں داخل ہوئیں۔ صاحب خانہ نے نہایت تپاک سے اپنے گلے لگایا۔ ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر ڈرائنگ روم میں لے گئیں اور کہا: ہاجرہ تم ٹھیک وقت پر آ گئیں اب مسزعون وغیرہ کا انتظار ہے۔

ہاجرہ: کہیے اب آپ کا مزاج کیسا ہے؟ مجھے تو رات کو رہ رہ کر بے چاری استانی کا خیال آیا کیا۔ دراصل قابل رحم ہے، ہر طرح سے لٹ گئی۔ سارا: میری بھی یہی کیفیت رہی۔ ان کی تکالیف کا سماں آنکھوں میں کھنچا رہا۔''[8]

سرگذشت ہاجرہ میں بیوہ کے عقد ثانی کے لیے ویڈیو کانفرنس قائم کرنے کی تحریک بھی نظر آتی ہے اور اس میں آل انڈیا لیڈیز کانفرنس کا بھی ذکر ہے۔ قصہ کو دلچسپ، دلکش اور اثر خیز بنانے کے لیے غزل، نظم اور اشعار کا استعمال بھی حسب موقع و محل کیا گیا ہے، اکا دکا اشعار شعرائے متقدمین کے بھی ہیں لیکن بیشتر غزلیں یا اشعار خود بیگم ہمایوں مرزا کے ہیں جو ان کے تخلص حیا کے ساتھ اس کتاب میں درج ہیں۔

غالباً پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ سرگذشت ہاجرہ، 1926 میں حیدرآباد سے ہی شائع ہوئی تھی۔ اس پر اکابر ادب کے جو تاثرات اور تبصرے آئے انھیں اقتباسات کے طور پر دوسرے ایڈیشن کے آخری چند صفحات میں شامل کرلیا گیا۔ پہلے ایڈیشن پر جن اکابر ادب کے تاثرات آئے ان میں سرعبدالقادر بیرسٹرایٹ لا کے تاثرات بھی شامل ہیں جو حسب ذیل ہیں:

''بیگم ہمایوں مرزا صاحب کی یہ تازہ تصنیف ایک دلچسپ و نتیجہ خیز کہانی ہے۔ اس میں حیدرآباد دکن کی سوسائٹی کا نقشہ بھی نظر آتا ہے اور کئی اہم مسئلوں پر بھی ضمناً بحث کی گئی ہے۔''[9]

بیگم صغرا ہمایوں مرزا کے متذکرہ دو ناول 'زہرہ' اور 'سرگذشت ہاجرہ' کا تذکرہ اور اس ناول پر تنقید و تبصرہ مختلف کتابوں میں موجود ہے لیکن ان کے ناول 'موہنی' اور بعض دوسرے ناول غالباً عدم دستیابی کی وجہ سے لوگوں کی نگاہ سے اوجھل رہے ہیں۔ ناول 'موہنی' پہلے 'عصمت' دہلی میں بالاقساط شائع ہوا اس کے بعد کتابی صورت میں شائع

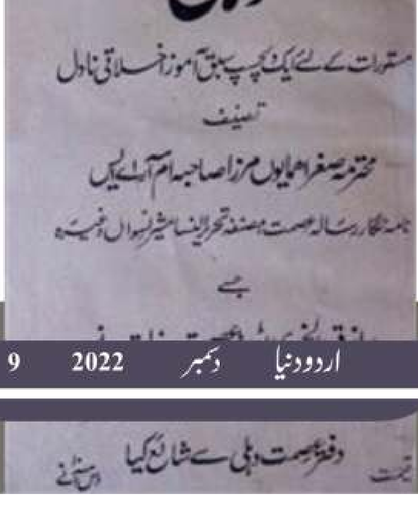

ہوا۔ 'عصمت' جنوری 1930 کے شمارے میں اس ناول کے چند آخری صفحات 'عالم ارواح کا جلسہ' کے عنوان سے درج ذیل ادارتی نوٹ کے ساتھ شائع ہوئے:

''محترمہ صغرا ہمایوں مرزا صاحبہ کا دلچسپ اخلاقی قصہ 'موہنی' جس کے کئی باب عصمتی بہنوں کی نظر سے گزر چکے ہیں۔ اب کتابی صورت میں شائع ہوگیا ہے۔ بہنوں کی دلچسپی کے لیے اس کے چند آخری صفحے ہم رسالہ میں بھی نقل کر رہے ہیں۔''10

'عالم ارواح کا جلسہ' واقعی دلچسپ ہے۔ عنوان ہی سے ظاہر ہے کہ عالم ارواح میں جلسہ منعقد ہوتا ہے۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ یہ جلسہ روحوں کا ہے۔ اس لحاظ سے قصے کا یہ حصہ تمثیلی پیرایۂ بیان کا حامل ہے۔ اس ناول میں موہنی مرکزی کردار ہے۔ جلسہ ابھی شروع نہیں ہوا ہے۔ صدر جلسہ اور بعض دوسرے شرکائے جلسہ کا انتظار ہے۔ اس اثنا میں موہنی عالم ارواح میں عالم اجسام کے چند باشندوں کو دیکھتی ہے جو اس کے شناسا رہے ہیں۔ لیکن یہاں ان کی حیثیت مختلف دکھائی دیتی ہے جس طرح نذیر احمد کے ناول 'توبۃ النصوح' میں نصوح نے حشر کے میدان میں اپنے والد کی وہ حیثیت دیکھی تھی جو عالم اجسام کی سماجی یا ظاہری حیثیت سے مختلف تھی۔ اس کے ذہن میں اس سلسلے میں چند سوالات ابھرتے ہیں۔ وہ اس سلسلے میں روح سے استفسار کرتی ہے اور روح اس کا تسلی بخش جواب دیتی ہے۔ اس کے بعد موہنی مذہب کے سلسلے میں بھی ایک سوال کرتی ہے جس کے جواب میں روح اسلام کو ایک سیدھا سادہ اور اچھا مذہب بتاتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ ہندو اور عیسائی مذہب کو بھی اچھا بتاتی ہے۔ پارسی مذہب کو بھی اچھا بتاتی ہے۔ یہاں مصنفہ کا اخلاقی نقطۂ نظر واضح ہوتا ہے۔ رواداری کا اصول نظر آتا ہے۔ اختلاف اور احتجاج کی صورت مذاہب کے خلاف نہیں بلکہ پادریوں اور پنڈتوں کے خلاف دکھائی دیتی ہے جو مذاہب کے ذمے دار و ٹھیکیدار ہیں۔ اتنے میں مسٹر امیر علی اور شہنشاہ فرانس جلسہ گاہ میں داخل ہوتے ہیں۔ جلسے کی صدارت کے لیے رائٹ آنریبل امیر علی کے نام کی تجویز و تحریک پنولین پیش کرتا ہے اور اس کی تائید سید علی محمد شاد، سر فیروز شاہ مہتا اور سی آر داس کرتے ہیں اور امیر علی صاحب مسکراتے ہوئے مسند صدارت پر متمکن ہوتے ہیں۔

اس جلسے میں سیاسی مسائل بھی زیر بحث آتے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ مصنفہ کی نظر عالمی سیاسی منظرنامے پر بھی گہری ہے اور ملکی سیاست میں اہل ہند کا مقصد بھی واضح ہوتا ہے کہ وہ انڈیا کو اپنے اپنے قبضہ و اختیار میں لینا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد عمر خیام و حافظ اپنا کلام سناتے ہیں۔ ان کے بعد بہت سے مردوں کی تقریریں ہوتی ہیں تب جا کر کہیں عورتوں کا نمبر آتا ہے اور عورتوں کی تقریروں کے ذریعے نسائی مسائل سامنے آتے ہیں۔ ان مسائل میں بیوہ عورتوں کے عقد ثانی، شادی شدہ عورتوں کے خلع اور طلاق۔ کنواری لڑکیوں کی رضا و رغبت کو سمجھے بوجھے بغیر والدین کی اپنی مرضی سے ان کی شادی، پردۂ بے جا اور سخت پابندی۔ مردوں میں کثرت ازدواج کا رجحان وغیرہ موضوعات و مسائل زیر بحث آتے ہیں۔ عورتوں کے پردہ اور لباس سے متعلق مصنفہ کے نقطۂ نظر کی وضاحت ہوتی ہے۔ رواجی بندشوں سے بیزاری کے آثار ظاہر ہوتے ہیں۔ محسن الملک اور وقار الملک کے خلاف بھی آواز ابھرتی ہے کہ دوسرے جنم میں انھیں نیچے کی دنیا میں پہنچا دینا چاہیے تاکہ وہ جا کر صرف عورتوں کی ترقی کی فکر کریں کیوں کہ ان لوگوں نے جو کچھ کیا وہ سب مردوں کی ترقی کے لیے کیا۔ اب ان کو عورتوں کی ترقی کے لیے نیچے کی دنیا میں بھجوانا چاہیے۔ حکیم اجمل خاں ریزولوشن کی تائید کرتے ہیں اور اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں کہ عورتوں کی حالت پردہ کی سختی کی وجہ سے بہت خراب ہے۔ ہندوستانی عورتیں یہی رواجی پردہ اور رواجی بندشوں کی وجہ سے کچھ کام نہ کر سکیں۔ اب عورتوں کو بھی کام کرنے کے لیے مردوں کے ساتھ ساتھ باہر نکلنا چاہیے۔ لباس ستر پوشی کافی ہے۔ اس جلسے میں یہ تجویز بھی منظور کی جاتی ہے کہ چند روحیں نیچے کی دنیا میں بھجوادی جائیں تاکہ وہ پردے کی رسم کو توڑنے کی کوشش کریں۔ پردہ کے سلسلے میں صغرا بیگم کا یہ محض ادبی اور نظریاتی موقف نہیں انھوں نے اس سلسلے میں عملی اقدامات بھی کیے۔ نصیر الدین ہاشمی نے صغرا بیگم کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''مسلم خواتین میں وہ پہلی خاتون تھیں جنھوں نے پردہ سے باہر آ کر مردوں کے مجمع میں تقریر فرمائی اور دوسروں کے لیے ایک مثال اور نمونہ پیش کیا۔''11

اس سے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ بیگم صغرا ہمایوں مرزا عریانیت پسند تھیں۔ وہ نہایت نیک، شریف اور مذہب پسند خاتون تھیں۔ وہ اس پردے کی قائل تھیں جو حضرت بی بی فاطمہؓ کا تھا۔ جیسا کہ جلسے میں شریک ایک دوسری بی بی کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے:

''میں چاہتی ہوں کہ پردہ کم کر دیا جائے جس طرح کا پردہ ہماری بی بی فاطمہ کا تھا۔ اس طرح کا ہو۔ چہرہ کھلا رکھنا اسلام میں جائز ہے۔''12

اس جلسے میں مرد بھی شریک ہیں اور عورتیں بھی۔ عورتوں میں پنولین کی بڑی بی بی اور چھوٹی بی بی بھی ہیں۔ بی اماں (مولانا محمد علی اور شوکت علی کی والدہ) بھی اور اہلیا بائی بھی۔ سبھوں کی حیثیت تاریخی ہے اور ان کی شخصیتوں سے لوگ واقف ہیں۔ ان شخصیتوں کی شمولیت سے جو بین الاقوامی اور عالمی منظرنامہ سامنے آتا ہے اور جس انداز میں عورتوں کے بعض مسائل ابھرتے ہیں، عورتوں کے احتجاجی اور انقلابی شعور کی عکاسی ہوتی ہے۔ اسے تحریک نسائیت کے تناظر میں دیکھا جا سکتا ہے اور اس لحاظ سے بیگم صغرا ہمایوں مرزا کو اردو کے حوالے سے تحریک نسائیت کا علمبردار ہی نہیں، بنیاد گزار بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ Women Empowerment کے نقطۂ نظر سے بیگم صغرا ہمایوں مرزا نے عملی اقدامات بھی کیے۔ ہمایوں نگر حیدرآباد میں ایک گرلس اسکول قائم کیا جس میں روایتی تعلیم کے ساتھ ساتھ انگریزی اور صنعت و حرفت کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ یہ اسکول غالباً Upgrade ہو کر ڈگری کالج میں منتقل ہو چکا ہے۔ اس گرلس اسکول میں رابندر ناتھ ٹیگور نے بھی خواتین سے خطاب کیا تھا۔

آثار و قرائن کے پیش نظر بطور مجموعی یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ بیگم صغرا ہمایوں مرزا نے جس مشن یا مقصد کے تحت ادبی، صحافتی اور علمی و ثقافتی خدمات انجام دیں، اس میں وہ بے حد کامیاب رہیں۔ ان کی شخصیت اور کارنامے واقعی خواتین کے لیے مثال اور نمونے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

حواشی

1 باقیات شاد، بہار اردو اکادمی، پٹنہ، 1990، ص 23-122
2 بیسویں صدی میں اردو ناول، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ایڈیشن، 2000، ص 178
3 سرگذشت ہاجرہ، ص 103
4 سرگذشت ہاجرہ، ص 103
5 سرگذشت ہاجرہ، ص 103
6 سرگذشت ہاجرہ، ص 103
7 سرگذشت ہاجرہ، دوسرا ایڈیشن، 1930، ص 6
8 سرگذشت ہاجرہ، دوسرا ایڈیشن، 1930، ص 57-56، آٹھواں باب، سارا کا قصہ)
9 سرگذشت ہاجرہ، دوسرا ایڈیشن، 1930، ص 100
10 ماہنامہ 'عصمت' دہلی، جنوری 1930، ص 43
11 دکن میں اردو، جنوری – مارچ، 1985، ص 812
12 ماہنامہ 'عصمت' دہلی، جنوری 1930، ص 45

■

Dr. Manzar Aijaz
B-46, P.C. Colony, Kankarbagh
Patna- 800020 (Bihar)
Mob.: 9431840245

امام اعظم

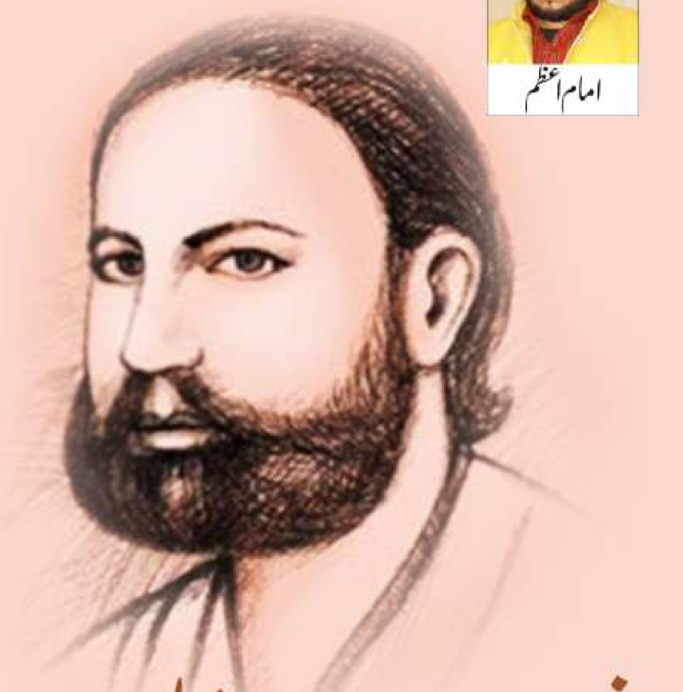

شبنمی نگاہ کا لافانی شاعر
میر تقی میر

میر تقی میر کو خدائے سخن تسلیم کیا جاتا ہے اور اس میں کوئی مبالغہ آرائی نہیں کہ اردو شاعری بالخصوص غزلوں میں جو عظمت و رفعت میر کے حصے میں آئی، اُس کے بلاشرکت غیرے حامل میر ہی رہے۔ میر سے پہلے دیارِ ہند میں بھی فارسی غزل گوئی کا غلغلہ تھا لیکن میر نے زبانِ ریختہ میں غزلیں کہتے ہوئے اسے جو رنگ و آہنگ، تغزل و غنائیت اور سوز و گداز عطا کیے، اس نے اردو غزل کو بامِ عروج تک پہنچا دیا۔ میر کی شاعری میں نادر تشبیہیں، استعارے اور کنائے ان شبنمی قطروں کی طرح ہیں جو کسی بھی دردمند دل میں گداز پیدا کردیں۔ بقول بابائے اردو مولوی عبدالحق:

''میر تقی میر سرتاجِ شعرائے اردو ہیں۔ ان کا کلام اسی ذوق وشوق سے پڑھا جائے گا جیسے سعدی کا کلام فارسی میں۔ اگر دنیا کے ایسے شاعروں کی ایک فہرست تیار کی جائے جن کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا تو میر کا نام اس فہرست میں ضرور داخل کرنا ہوگا۔''

بلاشبہ میر کی جامع الصفات شخصیت اردو ادب کی تاریخ کا ایک اہم باب ہی نہیں، اردو زبان کا انمول ورثہ بھی ہے جس کے بغیر یہ ادبی تاریخ نامکمل رہے گی۔ میر کی ذات خود میں ایک دبستان کی حیثیت رکھتی تھی جس سے نہ صرف ان کے معاصرین مستفید ہوئے بلکہ متاخرین بھی فیض یاب ہوتے رہے۔

میر تقی میر کو گذرے آج دو صدیوں سے زیادہ عرصہ بیت چکا ہے مگر ان کے اشعار کو جو بھی سنتا ہے، یا پڑھتا ہے وہ سر دھنتا ہے کیوں کہ میر گلستانِ اردو کے وہ عندلیب رہے ہیں جن کے نالے کو بہ کو دلوں میں ارتعاش پیدا کرتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ نالے دل کے ٹوٹنے سے نکلے۔ سن شعور کو پہنچتے ہی یتیمی کی ٹیس، اقربا کی ایذا رسانی، وطن مالوف آگرہ سے دلّی ہجرت کا کرب، دلی کے اقربا کی طوطا چشمی، ناکامیِ عشق کا سوز، دلّی میں نادر شاہ درّانی، احمد شاہ ابدالی اور پھر مرہٹوں کی یورش وشورش سے پیدا انقلابات کے تھپیڑے اور لکھنؤ کی ہجرت...... یوں ہجرت در ہجرت کے درمیان جو تکلیفیں زمانے نے میر کو دیں، جن سے زندگی کی ہر کروٹ یوں درماندگی کی شکار رہی کہ ؂

سر اٹھاتے ہی ہوگئے پامال　　　سبزۂ نودمیدہ کی مانند

لہٰذا جب زندگی نامرادی ہی نامرادی کی رہین اس طرح ہو جائے کہ:

سبز ہوتی ہی نہیں یہ سرزمیں　　　تخمِ خواہش دل میں تُو بوتا ہے کیا

تو پھر دل، وہ دل کہاں رہتا جس سے کیف و نشاط کے نغمے پھوٹیں۔ حالات بد کے ضرب و کرب سے، ٹوٹتے دل سے آوازِ دلخراش نکلے گی، یا نالے ہی نکلیں گے جو اس طور نکلے ؂

اللہ رے عندلیب کی آوازِ دلخراش　　　دل ہی نکل گیا جو کہا اس نے ہائے گل

اس عندلیب کے دل سے یہ 'ہائے گل' کی آہِ دلخراش کیوں نکلی؟ میر ہی سے سنیے ؂

پتہ پتہ بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے، باغ تو سارا جانے ہے

مذکورہ بالا دونوں اشعار میں بے التفاتی یا بے وفائی مرکزی نکتے ہیں، مگر انھیں جس طرح میر نے باندھا ہے اس سے جو معنوی تہہ داری ان میں در آئی ہے ان سے جو کیفیات پیدا ہوتی ہیں، انھیں قاری یا سامع اپنی فہم میں اپنے اپنے حالات کے موافق پاتے ہیں اور سر دھننے لگتے ہیں۔ دوسرے گل و بلبل، گلشن و گلستاں، باغ و چمن کو اردو شاعری میں جن معنوں میں برتا جاتا رہا، اس سے ان کے معنوں میں ایک رسمی سی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔ میر نے ان کے برتاؤ میں جو جدت و ندرت پیدا کی وہ من موہ لیتی ہے۔ اب دیکھیں کہ بے التفاتی یا بے وفائیِ محبوب پر انھوں نے کس سادگی اور بھولے پن سے ردِعمل ظاہر کیا ہے ؂

لوگ جب ذکرِ یار کرتے ہیں　　　دیکھ رہتا ہوں دیر منہ سب کا
اک نگہ، ایک چشمک، ایک سخن　　　اس میں بھی تم کو ہے تامل سا
یہ طرفہ ماجرا ہے کہ اسی کو چاہتا ہوں　　　مجھے چاہیے ہے جس سے بہت احتراز کرنا
لطف پر اس کے ہم نشیں مت جا　　　کبھو ہم پر بھی مہربانی تھی
دل نہیں درد مند اپنا میر　　　آہ وہ نالے اثر کریں کیوں کر

ان اشعار میں جو طرفگی ہے، معنوی تہہ داری ہے، وہ محبوب کے علاوہ چاہے گئے یا چاہے جانے والے تمام متعلقین سے اپنا رشتہ جوڑ دیتی ہے اور ہر نوع کے قاری یا سامع کو ان میں اپنی مراد برآتی نظر آتی ہے۔ یہی ہے میر کی ہنرمندی۔

ڈاکٹر سیّد عبداللہ نے اپنی تصنیف 'ولی سے اقبال تک' میں لکھا ہے کہ:

''نظیر اکبرآبادی کو چھوڑ کر پرانے اردو شاعروں میں شاید ایک بھی ایسا ہو جس کے مشاہدات کی دنیا میر کے مقابلے میں وسیع تر ہو۔ خیر یوں تو غزل میں مشاہدات کی تفصیلات و جزئیات سما ہی نہیں سکتیں، مگر میر عجب طرح کا غزل گو تھا، شاید اسے 'نظم گو غزل گو' کہنا درست ہوگا کیونکہ اس نے غزل کے قیود کے باوجود مشاہدات کی خوب خوب مصوری کی ہے جو اس کے مشاہدات کی دقت اور وسعت دونوں کا پتہ دیتی ہے۔''

مطلب یہ کہ وسیع مشاہدات کی تفصیلات و جزئیات کی سمائی کے لیے ہی تو صنف نظم معرضِ وجود میں آئی۔ اگر مشاہدات کی تفصیلات و جزئیات کی سمائی غزل میں سہل ہوتی

تو نابغۂ روزگار غالب کو غزل کی 'تنگ دامانی' کا گلہ کیوں ہوتا۔ غالب نے اسی سبب تو میر کا لوہا مانا کہ انھوں نے کسی دقت کا کہیں اظہار کیے بغیر غزل کے قیود کو قبول کر کے اپنے وسیع تر مشاہدات کی تفصیلات و جزئیات کی دلکش مصوری کی اور ان پر اپنی ارفع حسِ جمال کا رنگ چڑھا کر انھیں ایسا چوکھا کر دیا جو ہر دور کے لوگوں کی حسِ جمال کو اپیل کرتا رہے گا۔ ان کی رنگارنگ مصوری کی چند جھلکیاں دیکھیں۔

سرسری تم جہان سے گزرے
ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا

ہر صبح حادثے سے یہ کہتا ہے آسماں
دے جامِ خون میر کو گر منہ دھو چکا

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

یہ عیش گہہ نہیں ہے یاں رنگ اور کچھ ہے
کہ ہر گل ہے اس چمن میں ساغر بھرا لہو کا

بردباری ہی میں کچھ قدر ہے گو جی ہو فنا
عود پھر لکڑی ہے ڈوبے نہ اگر پانی میں

کیا طرح ہے آشنا گاہِ، گہہ نا آشنا
یا تو بیگانہ ہی رہیے، ہوجیے یا آشنا

میر صاحب زمانہ نازک ہے
دونوں ہاتھوں سے تھامیے دستار

مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

طریقِ عشق میں ہے رہنما دل
پیمبر دل، ہے قبلہ دل، خدا دل

ہم نہ کہتے تھے کہ مت دیر و حرم کی راہ چل
اب یہ جھگڑا عمر بھر شیخ و برہمن میں رہا

حالِ بد، گفتنی نہیں میرا
تم نے پوچھا تو مہربانی کی

شکوۂ آبلہ ابھی سے میر
ہے پیارے ہنوز دلّی دور

ناز و انداز و ادا عشوۂ اغماض و حیا
آب و گل میں ترے سب کچھ ہے یہی پیار نہیں

نظر، میر نے کیسی حسرت سے کی
بہت روئے ہم اس کی رخصت کے بعد

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے
اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

سرہانے میر کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

یہ مختلف النوع مشاہداتِ میر کی جھلکیاں شاہد ہیں کہ میر نے شاعری ویسے نہیں کی جیسے ان کے دور تک اردو شعرا نے کی بلکہ انھوں نے عشق کی وارفتگی، عشوہ و حسن کی دل فریبی، تصوف کی پاکیزگی، کائناتِ دل کی رنگارنگی، انسانی طینت کی نیرنگی، غمِ روزگار اور درِ زمانہ کی تہہ میں گہرائی تک اتر کر انھیں جانا، جھیلا، برتا، پرکھا یعنی ان کے تجربے اور مشاہدے کیے۔ ان تجربات و مشاہدات کی مصوری کے لیے سادہ الفاظ میں ندرت، سادہ استعاروں میں تہہ داری اور تشبیہوں میں تازگی و طرفگی پیدا کرنے میں ہمہ دم ڈوبا رہا کرتے تب شعر کہا کرتے، اس لیے انھوں نے کہا۔

برسوں لگی ہوئی ہیں جب مہر و مہ کی آنکھیں
تب کوئی ہم سا صاحب، صاحب نظر بنے ہے

کچھ اسی طرح کی رائے بابائے اردو مولوی عبدالحق کی بھی ہے۔ ملاحظہ کریں۔

''میر ان لوگوں میں نہیں جنھوں نے موزونی طبع کی وجہ سے یا اپنا دل بہلانے کی خاطر یا دوسرے سے تحسین سننے کے لیے شعر کہے ہیں بلکہ یہ ان لوگوں میں سے ہیں جو ہمہ تن شعر میں ڈوبے ہوئے تھے۔...... ان کے کلام کا لطف کسی زمانے میں کم نہ ہوگا کیوں کہ اس میں وہ عالم گیر حسن ہے جو کسی خاص وقت یا مقام سے مخصوص نہیں۔''

میر کے کلام پر بہت سارے نقادوں نے روشنی ڈالی ہے لیکن کسی نے میر کی شاعری کی خوبیوں کو اتنے سائنٹفک اور مدلل انداز میں پیش کرنے میں اتنی کامیابی حاصل نہیں کی ہے جو کلیم الدین احمد کا حصہ ہے۔ میر کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''......عشق کی ستم انگیزی، یاس و حرماں کی موج زنی، بے ثباتیِ دنیا، فقر و قناعت کی تلقین یہی میر کی شاعری کے اربعہ عناصر ہیں۔ انھیں کا بیان مختلف طور پر بار بار ہوتا ہے۔ یہ مضامین نئے نہیں۔ ان سے اردو غزلیں بھری پڑی ہیں۔ لیکن میر کے شعروں میں یہ پامال مضامین ایک عجیب اثر آفرینی اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ اثر کسی دوسرے اردو شاعر کے بس کی بات نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پامال مضامین پامال، پیش پا افتادہ نہیں معلوم ہوتے بلکہ ایک نیاپن لیے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان میں ایک اپنی الگ خصوصیت ہوتی ہے جسے 'میریت' کہہ سکتے ہیں۔ اور سچ ہے کہ نیاپن بہ ذاتِ خود کوئی تعریف کے قابل چیز نہیں۔ اور یہ بھی ضروری نہیں کہ شاعر سوچ سوچ کر نئی باتیں ایجاد کرے۔ جانی ہوئی باتیں، عام انسانی احساسات شعر کا مواد بن سکتے ہیں، ہاں شرط یہ ہے کہ شاعر انھیں جوش کے ساتھ محسوس کرے۔ ان پر اپنی شخصیت کی مہر لگا دے۔ اگر ایسا ہوا تو جانی ہوئی باتیں نئی ہو جاتی ہیں اور عام انسانی احساسات خاص ذاتی احساسات کا روپ بدل لیتے ہیں یہی بات میر میں ملتی ہے۔......'' (اردو شاعری پر ایک نظر ص 83)

میر کی شاعری پر سر دُھننا الگ بات ہے اور میر کی شاعری پر تنقیدی رائے دینا الگ۔ کلیم الدین احمد نے میر کے کلام کی خوبیوں کی وضاحت کے ساتھ ان چیزوں کا بھی تذکرہ کیا ہے جو شاعری میں موضوع بن سکتے ہیں اور وہ شرطیں بھی بیان کی ہیں جن سے موضوعات شاعرانہ پیکر میں ڈھل سکتے ہیں۔ کلیم الدین احمد نے میر کے کلام کی اثر آفرینی کے اسباب سے بحث کی ہے اور اس بحث کے سلسلے میں انھوں نے ان آفاقی شاعرانہ اصول و اقدار کو بھی منظم طریقے پر پیش کیا جو ایک بلند مرتبہ شاعری کے لازمی عناصر ہیں۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ تقلید سے اشعار بے جان ہو جاتے ہیں اور جذبات سے نکلے ہوئے اشعار بہت ہی پُر اثر ہوتے ہیں۔ ان کی باتوں میں وزن اور ان کا تجزیہ منطقی ہونے کے سبب کافی حد تک قابل قبول ہے۔

معروف ترقی پسند شاعر اور ادیب منظر شہاب اپنے مضمون 'میر تقی میر اور سودا کی غزل گوئی کا تقابلی جائزہ' میں میر کی شاعری کے متعلق رقم طراز ہیں:

''ان کی شاعری غم و اندوہ اور حسرت و ناکامی کا مرقع ہے۔ محرومیوں کے باوجود انھوں نے زندگی سے کبھی بیزاری محسوس نہیں کی۔ الم ناکیوں سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ کبھی حوصلہ نہیں کھویا۔ ناکامیوں سے کام لینے کا سلیقہ جانتے تھے۔ ان کے غم میں ایک خاص نشاط انگیزی کا ارتعاش ملتا ہے۔ ان کے الم کو 'الم نشاط انگیز' سے تعبیر کرنا چاہیے۔......'' ('کتاب' اور 'پھر بیاں اپنا' اشاعت 2002، ص 118)

معاصر دور میں ہماری زبان اردو دنیا کی بڑی زبانوں کے مدمقابل کھڑی ہے جس کا سہرا بڑی حد تک میر کی لافانی شاعری کو جاتا ہے۔ لہٰذا میں اس نکتے پر اپنی بات ختم کرتا ہوں کہ میر نے دماغ سے نہیں دل کی گہرائی سے شعر کہے ہیں، اس لیے وہ دل کی گہرائی میں اترتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں سہلِ ممتنع کا وصف کھل کر سامنے آیا۔ میر کی غزلوں نے ذات سے کائنات تک کا سفر یوں طے کیا کہ ان کی شاعری داخلی اور خارجی درد و الم کی نوحہ گر بن کر سامنے آئی۔ اپنے ان ہی اوصاف کے باعث میر گزشتہ کل بھی خدائے سخن تھے اور آئندہ بھی ان کا یہ مقام و مرتبہ مستحکم رہے گا۔ اور اس طرح میر کی 'میریت' مسلم ہے۔ غالب کے اس مقطع کے ساتھ اپنی بات ختم کرتا ہوں۔

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

■

Dr. Imam Azam
1-A/1, Chatu Babu Lane (Mosin Hall)
Third Floor
Kolkata - 14 (West Bengal)
Mob.: 8902496545

جنید احمد

آصف جاہی نظم ونسق میں فارسی اصطلاحات

سرزمین دکن کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ یہاں نہ صرف علما ادبا شعرا اور دانشوروں نے جنم لیا بلکہ ایک طویل سلسلہ ایسے حکمرانوں کا بھی ہے جو صاحب قلم اور صاحب دیوان تھے۔ یہ سلسلہ عہد کاکتیہ سے شروع ہوا اور عہد آصف جاہی میں نقطۂ عروج کو پہنچا۔ جہاں دکن میں ایک بار بہمنی حکومت قائم تھی وہاں نظام الملک آصف جاہ اول نے عہد مغلیہ کی روش پر خود مختار حکومت قائم کر کے 1724 میں آصف جاہی حکومت کا علم لہرا دیا۔ دکنی حکومت کی باگ ڈور سنبھالتے ہی ایک دفتر دیوان دکن قائم کیا۔ دفتر دیوان کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ایک حصے میں فوجی اور مالی انتظامات دیکھے جاتے تھے جو دفتر دیوانی کہلاتا تھا، اور جس میں صوبۂ فرخندہ بنیاد حیدرآباد وصوبہ محمد آباد بیدر سے متعلق امور طے پاتے تھے وہ دفتر مال کہلاتا تھا۔ انتظام مملکت کے تمام امور دفتر دیوانی و مال میں انجام پاتے تھے۔ نظام الملک نے صوبہ دکن کے مفتوحہ علاقوں کو اپنی گرفت میں لے کر نظم ونسق اور عوام کی بھلائی کی طرف اپنی توجہ مبذول کی۔

عہد مغلیہ کی طرز پر آصف جاہ اول نے بھی اپنے دور میں فارسی کو نظم ونسق کی زبان کے طور پر استعمال کیا جس کی ایک وجہ فارسی زبان وادب اور فارسی شعر سے ان کی دلی رغبت تھی اور اپنی رفاقت میں ایسے بہت سے امرا، علما، فضلا اور دیگر ارباب علم وفن شامل کیے ہوئے تھے جو عہد مغلیہ میں منصب دار ہونے کے ساتھ ساتھ فارسی سے قلبی شغف رکھتے تھے اور ریاستی امور کو فارسی زبان میں انجام دینے میں اچھی صلاحیت کے مالک بھی تھے۔ نظام الملک ان کے اعلیٰ ادبی ذوق سے متاثر ہو کر انعامات کے ساتھ ساتھ انھیں جاگیریں بھی عطا کرتے تھے جس کی بدولت ایک شاندار ادبی فضا قائم ہوئی۔ ایسے ادبی ماحول میں کوئی دوسری زبان فارسی کی جگہ کیسے لے سکتی تھی۔

آصف جاہ اول (1712-1748) کے دور میں فارسی زبان پوری شان وشوکت کے ساتھ رائج رہی جس کا ذکر کتاب 'فارسی دکن' میں اس طرح کیا گیا ہے کہ میر قمرالدین نظام الملک آصف جاہ بہادر اول خود فارسی کے برگزیدہ شعرا میں شمار ہوتے تھے ان کے دو فارسی دیوان بھی ملتے ہیں پہلے میں آصف تخلص کرتے تھے اور دوسرے میں شاکر۔

ان کی حکومت کے تقریباً تیرہ سال بعد تک طوائف الملوکی کا دور رہا اور اس دوران بھی فارسی زبان پر کوئی زیادہ منفی اثرات مرتب نہیں ہوئے، اس کے بعد نظام الملک اول کے فرزند نظام علی خان، آصف جاہ ثانی کے لقب سے تخت نشین ہوئے جن کے دور میں فارسی زبان کی طرف دھیان کم دیا گیا اور اس طرح نظم ونسق کے اعتبار سے فارسی کی اہمیت میں بتدریج کمی دکھائی دینے لگی بلکہ وہ نہ رہی جو آصف جاہ اول کے دور حکومت میں حاصل تھی۔ وہ فارسی کے بھی ایک بلند پایہ شاعر تھے اور ناصر تخلص کرتے تھے، ان کے تین فارسی دیوان بھی شائع ہو چکے ہیں۔ 'تذکرہ دربار حیدرآباد' میں یہ نقل کیا گیا ہے کہ آپ نے مندرجہ ذیل شعر لکھ کر آصف جاہ کی خدمت میں ارسال کیا۔

مرنجان خاطر جانان مزاجی نازکی دارم
تو گر از حسن مغروری من از عشق تو مغرورم[1]

''میں اپنے محبوب کی وجہ سے نازک مزاج رکھتا ہوں، تجھے اگر اپنے حسن کا غرور ہے تو میں تیرے عشق کی وجہ سے مغرور ہوں۔''

مندرجہ بالا شعر کے جواب میں انھوں نے یہ کہلا کے بھیجا 'بگو قباحت این بیت رو برو مذکور خواهم کرد' ناصر جنگ جب خدمت میں حاضر ہوئے آصف جاہ نے فرمایا ''تمھارے مراسلہ شعر میں عاشق کی مغروری کچھ مناسب معلوم نہیں ہوتی'' ناصر جنگ نے بڑے ادب سے عرض کیا'' آن قبلہ خوب جانتے ہیں کہ اس شعر میں جس ہستی پر مغرور ہونے کا میں نے دعویٰ کیا ہے وہ صرف آن قبلہ کی ذات والاصفات ہے۔''[2] اس کے بعد وہ متاثر ہو کر ناصر جنگ کے منصب کو بڑھا دیتے ہیں۔

ناصر جنگ کے دور حکومت میں اردو زبان کے راستے زیادہ ہموار ہوئے کیونکہ اردو کی طرف ان کا میلان زیادہ تھا اور اردو میں بھی شاعری کرتے تھے جس کا براہ راست فائدہ اردو زبان کو پہنچا۔ بطور مثال ذیل میں ان کی غزل کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

نین تیرے شکار کرتے ہیں ··· دل ہمارا فگار کرتے ہیں
چشم بد دور خوش نین سارے ··· اپنے ناصر کو پیار کرتے ہیں[3]

سکندر جاہ 182-1803 اور نواب ناصرالدولہ آصف جاہ چہارم 1829-1857 کے اختتام دور تک لسانی اعتبار سے ریاست حیدرآباد میں کافی تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں، امرا و حکمران اور مقامی آبادی میں اب زیادہ دوریاں نہیں رہی تھیں اکثریت میں لوگ تلگو یا مراہٹی زبانیں بولتے تھے۔ لیکن ہندو مسلمان دونوں طبقوں کے پڑھے لکھے لوگ اردو زبان کو ہی اپنا وسیلۂ اظہار بناتے تھے اور فارسی اب تو محض ایک دفتری اور کاغذی زبان کی حیثیت سے مستعمل تھی اور کہیں کہیں پڑھے لکھے خاندانوں میں مشیخت اور علمیت کے اعتبار سے بھی لوگ بولتے تھے۔ لیکن عوام اس سے مکمل طور پر نابلد تھے۔ شہر اورنگ آباد جہاں، مراہٹی بولنے والے اکثریت میں تھے وہاں فارسی کو مصنوعی طور پر متعارف کرایا گیا لیکن جب ریاستی دارالخلافہ اورنگ آباد سے تلنگانہ منتقل ہوا تو اس کا اثر تلگو اور مراہٹی پر تو زیادہ نہیں پڑا البتہ اردو کو اس سے کافی فائدہ پہنچا کیونکہ شہر حیدرآباد میں مختلف کاروباری مقاصد سے آئے ہوئے مسلمانوں کی کافی تعداد موجود تھی جن کی بول چال کی زبان اردو ہی تھی۔

اردو زبان پر فارسی کا جا بجا اثر پڑا، چاہے انسانی غذا وخوراک، لباس، ظروف، زیورات، خطابات و القاب کا ذکر کیا جائے یا جانوروں، پرندوں، پھلوں، پھولوں کا ہر جگہ فارسی کی آمیزش پائی جاتی ہے۔ تنبیہی یا تحسینی کلمات ہوں یا پیشہ ورانہ جملے یا ہندوستانی گالیاں ہوں، خالص فارسی کے ہزاروں کلمات شامل ہیں۔ ان کے علاوہ فارسی کی اصطلاحات، ضرب الامثال، روزمرے اور فقرے بھی عام گفتگو میں اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ اردو تحریر وتقریر میں بھی فارسی اضافت کا خوب استعمال ہوتا ہے جیسے علاوہ براین، دراین اثنا، مژہای دراز، گلہای

قرمز، وغیرہ۔اسی طرح فارسی 'واو عطف' کا بھی استعمال جا بجا ہوتا ہے جیسے: گفت وشنید، پیچ وتاپ، خدو خال، سرو پا، آب و دانہ، آمد و رفت، رفت و گذشت وغیرہ ایسی سیکڑوں مثالیں ملتی ہیں۔الغرض، ہندوستان کے سیاسی، تمدنی ولسانی رجحانات کا فارسی زبان سے بہت گہرا تعلق ہے

انیسویں صدی میں کئی تبدیلیاں دیکھنے کو ملیں لیکن حیدرآباد میں انیسویں صدی کے نصف تک بھی زیادہ تغیرات رونما نہیں ہوئے تھے، یہاں کے عوام کو بدلتے حالات کا خاص اندازہ نہیں تھا اور شاید اسی لیے 1857 کی تحریک آزادی میں بھی انھوں نے خاص شمولیت نہیں کی۔انیسویں صدی کے آغاز میں ہی انگریز پورے ملک پر اپنا اقتدار قائم کرنے کی تیاریاں مکمل کر چکے تھے۔اور 1803 میں میر نظام علی خان آصف جاہ کی وفات کے بعد ریاست حیدرآباد کو اپنی گرفت میں لینے کے لیے انھوں نے میر عالم کو وزیر اعظم نامزد کر کے منصوبہ بندی کر لی تھی، لیکن نواب سکندر آصف جاہ ثالث کی تخت نشینی کے بعد انگریزوں کے نامزد کردہ وزیر اعظم میر عالم کا انتقال ہو گیا۔اور کچھ مدت بعد انگریزوں کی مرضی کے خلاف منیرا لملک کو بطور وزیر اعظم منتخب کیا گیا۔نواب منیر الملک کے انتقال کے بعد راجہ چندولال کو وزیر اعظم بنا دیا گیا۔پھر مہاراجہ چندولال کے بعد وزارت عظمیٰ کے عہدۂ جلیلہ پر دس سال میں سات تقررات عمل میں آئے۔چندولال اس عہدے کو سنبھالنے میں زیادہ کامیاب ثابت نہیں ہوئے ان کے دور میں حالات دیگر گوں تھے اور انھیں قابو کرنا ان کے لیے آسان ثابت نہیں ہوا۔آخر میں اس منصب کے لیے تراب علی خان سالار جنگ اول کا انتخاب کیا گیا جنھوں نے تیس سال تک اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے نظم ونسق کو بہترین بنانے میں اپنی خدمات انجام دیں۔

اس کے بعد حالات کی بڑھتی ہوئی کشمکش میں کئی اتار چڑھاؤ دیکھنے کو ملے جن کا ریاست حیدرآباد کے نظم و نسق پر کتنا بھی اثر کیوں نہ پڑا ہو لیکن ہیئت کے اعتبار سے ریاستی امور ان ہی نظم ونسق پر چلتے رہے تھے جو آصف جاہ اول نے 1724 کے بعد مغلیہ حکومت کی طرز پر مقرر کیے تھے جس سے عام رعایا کے ساتھ انصاف اور ہمدردی کو یقینی بنایا گیا تھا، جس کا ذکر 'سقوط حیدرآباد' میں اس طرح کیا جاتا ہے:

''باہر کے ان لوگوں کو جو بہت بڑی تعداد میں آتے رہے اہل حیدرآباد نے گلے سے لگایا۔حیدرآباد کا نظم ونسق عام طور پر اچھا تصور کیا جاتا ہے۔عدلیہ عاملہ الگ الگ تھے، لوگوں میں ہمدردی رواداری موجود تھی''4

آصف جاہی دور میں فارسی زبان کو دفتری زبان تسلیم کیا جاتا رہا اور کئی دفاتر میں مسلسل فارسی پر کام ہوتا رہا جو بعد میں بھی جاری رہا۔ان میں سے چند دفاتر کے نام ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

- دفتر دیوانی (اس دفتر سے سندیں اور احکام جاری کیے جاتے تھے)
- دفتر استیفا (اس دفتر میں تمام احکامات اور سندوں کی نقلیں تیار کر کے محفوظ کی جاتی تھیں)
- دفتر مناصب اور خطابات (اس دفتر میں امرا کو دیے گئے انعامات اور اعزازات محفوظ ہوتے تھے)
- دفتر مواہیر، (اس دفتر میں مہریں رکھی جاتی تھیں)
- دفتر مال (اس دفتر کے تحت بیدر اور حیدرآباد صوبوں کا نظم ونسق آتا تھا)
- دفتر ملکی (اس دفتر میں معاہدوں کے اسناد محفوظ ہوتے تھے)
- دفتر بخشی گری (اس دفتر میں فوجی نظم ونسق کے امور انجام پاتے تھے)
- دفتر دارالانشا (اس دفتر کے ذریعے گورنر اور مرہٹوں کے درمیان خط وکتابت ہوتی ہے)
- دفتر منشی خانہ (دارالانشا میں خط وکتابت کا کام زائد ہونے کی وجہ سے سالار جنگ اول نے منشی خانہ قائم کیا)
- دفتر قانون گوئی و چک بندی (جب انفرادی یا دیہاتی سطح پر کوئی جھگڑا ہوتا تھا تو اس کی حدود کے تعین کی ذمے داری اور چک بندی اسی دفتر کے سر ہوتی تھی)،
- دفتر پیشکاری، دفتر خزانہ عامرہ (اس دفتر میں حساب کے کاغذات اور اخراجات وغیرہ کی تفصیلات محفوظ ہوتی تھیں)،
- دفتر صدارت العالیہ (اس دفتر کا مقصد مذہبی امور، فتوے اور ہدایات صادر کرنا تھا) وغیرہ وغیرہ۔5

متذکرہ بالا تمام دفاتر میں فارسی زبان اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ رائج رہی، اور دفتری اصول وضوابط نئے زمانے سے بے خبر تھے بلکہ خالص مغلیہ طرز کے تھے۔اس نظم ونسق میں زیادہ تر کارروائیاں اور فیصلے زبانی ہوتے تھے اور بہت کم تحریر کی نوبت آتی تھی سارے احکامات جو شاہی زبان سے جاری ہوتے تھے ان کو ایک خاتون عہدہ دار جس کو 'ماما' کہا جاتا تھا یا بادشاہ کا کوئی خاص ملازم سن کر بادشاہ کے دفتر دارالانشا تک پہنچا دیتا اور اس زبانی پیام رسانی سے احکام صادر ہوتے تھے۔ان احکامات پر بادشاہ یا کسی بھی ذمے دار عہدے دار کے دستخط نہیں ہوتے تھے، بلکہ سرکاری دفتر سے جاری ہونے والا ہر حکم معتبر مانا جاتا تھا لیکن اہم معاملات پر جو احکام صادر ہوتے تھے ان کی شکل فرمان، پروانچہ، سند یا سیاہے کی ہوتی تھی، سیاہہ دراصل وہ ابتدائی کاغذ ہوتا تھا جس پر رسمی طور پر احکامات یا واقعات مندرج ہوتے تھے۔خاص طور پر اس پر بادشاہ یا وزیر اعظم یا کوئی با اختیار عہدے دار تجویز یا فیصلہ لکھ دیتا اور یہ تجویز مختلف انداز سے نقل کی جاتی تھیں۔جیسے:

1 اگر کسی التماس کو پیش نظر رکھ کر سیاہہ لکھا جاتا تو اس پر 'منظور دارد' یا 'پزیر خواہد شد' یا 'منظور' لکھ دیا جاتا تھا۔

2 جن سیاہوں میں کسی کو جاگیر دی جاتی یا خطاب سے نوازنے کی سفارش ہوتی ان پر لکھا جاتا 'سندے نویسند' یا 'بنویسند'۔اس کے علاوہ اگر کوئی شخص اپنی جاگیر کا نام تبدیل کرنا چاہتا تو اس پر تجویز اس طرح ہوتی 'بہ فلان موسوم فرمایند' تمام اہم کاغذات جیسے فرامین اور اسناد وغیرہ کی عبارت کے اختتام پر بادشاہ یا مقتدر ہستی اپنے قلم سے ایک علامت بنا دیتے جسے بیض کہا جاتا تھا دراصل بیض کا قاعدہ تھا کہ عام متصدی بھی جب کسی سرکاری کاغذ پر تحریر ختم کرے تو اس کے آخر پر جو جگہ بچتی ہے اس پر ایک یا متعدد دفعہ بیض لکھ دیتے جس کی شکل بالعموم 'بیض' ہوتی تھی6 ان اہم کاغذات پر صاحب اقتدار کی تجاویز اور مہر کا التزام ہونا ضروری تھا اور مہر کے علاوہ طغرا بھی لازمی ہوتا تھا یہ صرف مغل حکمران کی طرف سے ہوتا تھا۔لیکن آصف جاہی بادشاہوں نے ابتدا میں اپنی طرف سے آزادانہ فرمان جاری نہیں کیے اس زمانے میں دفتری کارروائیوں میں بہ لحاظ مقدمہ مثلیں نہیں بنا کرتی تھیں بلکہ ہر مثل فرد کے نام پر ہوتی تھی اور اس کی شخصیت بیشتر شخصی مثل کی ہوتی تھی اس کا ہر ورق 'فرد' کہلاتا تھا اور اس سے بڑے مقدار کے کاغذوں کو بند کہا جاتا تھا۔کاغذ کے صفحے سے استفادہ کے قواعد مقرر تھے اور یہ قواعد مغلوں سے لیے گئے تھے۔مثل کے اوراق پر عام طور سے صفحہ اندازی نہیں کی جاتی تھی، کارروائیوں کی ابتدا میں تاریخ، سنہ اور دن کی صراحت ہوتی تھی، محکموں کے لیے کوئی خاص مستقل ضوابط اور جریدے نہیں تھے جن کو مدنظر رکھ کر کارروائیوں کی غلطیوں یا دھاندلیوں پر کوئی دلیل یا نکتہ چینی کی جا سکتی تھی۔یہی وجہ تھی کہ بادشاہ سے لے کر متصدی تک کارروائیوں میں اپنے اختیارات سے نظم ونسق پر اپنی شخصیت کو اتنا حاوی رکھتے کہ اہل غرض ان کے سامنے ہمیشہ سے بے بس رہتے اور کبھی کسی واجبی تنقید یا ادعا کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔فارسی زبان کی یہ تمام دفتری کارروائیاں عموماً خط شکستہ میں ہی قلمبند کی جاتی تھیں اور کارروائیاں عام طور پر محدود ہوتی تھیں اور سارے دفتری امور چند ہی الفاظ میں طے پاتے تھے۔بیشتر الفاظ کی نگارش خط شکستہ کے باعث محض علامت بن کر رہ گئی تھی

جن کا پڑھنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔ خط شکستہ کی پیچیدگیوں کی وجہ سے قطع نظر عام فہم اور آسان فارسی استعمال ہوتی تھی، اور مراسلے واعلانات وغیرہ بھی قلمبند کرنے کا کم ہی اتفاق ہوتا تھا اس لیے لکھنے میں کافی سنجیدگی برتنے کا موقع حاصل ہوتا تھا۔ نواب مختارالملک کے دور میں 'حیدرآباد گزٹ' شائع کیا جانے لگا جس پر لکھا ہوتا تھا: ''حسب الحکم سرکار در بلدہ حیدرآباد بھر هفته یکمرتبه مطبوع ومشتهر خواهد شد یعنی درهفته بروز دوشنبہ''۔ اس جریدہ کے پہلے شمارے کی تحریر بھی بطور مثال درج کی گئی ہے:

"ازآنجا که بسرکار بجهت آسانی اجرائی امور سرکاری مناسب معلوم شده قرار یافت که یك جریده اجرا نمایند و در آن تمامی احکام سرکار که از دفاتر متعلقه مدار المهام یا صدرالمهامان سرکار و عزل و نصب و تقرّر وتبدّل و ترقی و رخصت وغیره عهده داران،وقت به وقت مندرج گردد و از ین تجویز بموجب مرقوم الصّدر کارهای سرکار از آسانیسر انجام خواهند یافت"[7]

فارسی کی اصطلاحیں جو دفاتر میں استعمال ہوتی تھیں ان میں سے اکثر عہد قدیم سے چلی آرہی تھیں جو نہایت سادہ اور سہل تھیں وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ قدیم اصطلاحات کی ثقالت میں کافی حد تک کمی ہوتی گئی۔ پہلے مقامی زبانوں جیسے تلگو، مرہٹی وغیرہ اور پھر اردو کا اثر پڑنے لگا۔ نظام الملک اول کے دور میں دفتر مال کے متعلق چند اصلاحیں اس طرح ملتی ہیں:

سرپٹواری، پٹواری گری، داروغگی، سائر (بمعنی ٹکس)، جاگیر، مقطعہ، رسوم، انعام وغیرہ۔ میر نظام علی خان کی مہر خاص سے جاری شدہ ایک سند مورخہ 7 ذیقعدہ سنہ 1214ھ میں یہ الفاظ ملتے ہیں:

عاملان، جاگیرداران، دیسمکھیان، سردیشپانڈیہ، دیشپانڈیان، مقدمان، کلکریان، مزارعان، چوتھ، انعام التمغا وغیرہ۔

سالار جنگ اول کے عہد کی چند عدالتی اصطلاحیں جو بعد میں اردو میں بھی رائج ہوئیں، جیسے: مدعی، مدعا علیہ، اظہار متخاصمین، عرضی، فیصلنامہ، مظہر فارغ خطے، اصالتاً وکالتاً، استغاثہ، اظہار، رسوم وغیرہ۔[8]

ریاستی آمدنی میں ذرائع ٹیکس کو بڑی اہمیت حاصل تھی اور ٹیکسوں کے لیے جو اصطلاحیں مستعمل تھیں ان کا ذکر اس طرح کیا جاتا ہے:

دھنگر پٹی، دھیڑ پٹی، شادی پٹی، چرسا پٹی، بھوئی پٹی، ہتھ بزاری، کلال پٹی، جلاہا پٹی، دھارا پٹی، راہداری، غنیم باب، پرال پٹی، بٹ سبزی، بانس فروشی، مذکوری پٹی، رسوم ریڈی، دفن گاردل اور منڈل، تیلی مال، پانی مال، بالٹا بازاری، مچھلی گلٹی، بھینس پٹی، نخاصی، آدم پٹی، محترفہ، سفر پٹی (زمیندار کے سفر کے اخراجات)، کھیمر پٹی (کمہار ٹیکس)۔ وغیرہ۔[9]

بندوبست وغیرہ کے متعلق اصطلاحات جیسے:

انچنہ: تخمینہ، اندازہ، حساب خام، اندازہ سے رقم کی قرداد کرنا

آسامی شکمی: اندرونی شریک، چھوٹا کسان،

آسامی موروثی: وہ کسان جو کشت کاری کے باعث وراثت کا حق رکھتا ہو۔

بے چراغ: ویران، اجاڑ، برباد، غیر آباد مقام

پرتن: چار بھیگہ کا ایک پرتن کہلاتا ہے۔[10]

مندرجہ بالا اصطلاحات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس زمانے میں دفاتر میں استعمال ہونے والی فارسی کس قسم کی سلیس تھی۔ اس فارسی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کلاسیک زبان فارسی کتنی دور ہو چکی ہے اور اس پر ہندوستانیت کتنا غلبہ پا چکی ہے۔ یہاں تک کہ دیہاتی ٹکسالی اصطلاحیں بھی شکل بدل کر فارسی دفاتر کا حصہ بن گئیں تھیں۔ اور تلگو، مراہٹی وغیرہ کا رواج کافی نچلی سطح پر رائج ہو گیا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ بہمنیوں اور ان کے جانشین سلطنتوں نے علاقائی زبانوں کو خوب مواقع فراہم کیے اور دیہی دفاتر میں بھی یہی زبانیں مستعمل تھیں اور آصف جاہی دور میں بھی ان کے پھلنے پھولنے میں مشکلات حائل نہیں ہوئیں۔ عادل شاہی دفاتر کی طرح آصف جاہی دفاتر میں بھی مراہٹی کو کافی دخل حاصل رہا۔ اور منشیوں کے لیے جہاں فارسی زبان کا سیکھنا ضروری تھا وہاں مقامی زبان میں عبور ہونا بھی لازمی تھا۔ اور محکمۂ مال کے افیسران کے لیے مقامی زبانوں میں امتحان پاس ہونا لازمی تھا جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اگرچہ فارسی زبان کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل تھا مگر مقامی زبانوں میں بھی عبور ہونا کتنا اہم تھا کیونکہ اس زمانے میں تمام بنیادی ریکارڈ علاقائی زبانوں میں ہوتا تھا اور پھر دھیرے دھیرے امثلہ تلخیص ہو کر دارالسلطنت تک پہنچتا تھا تو ان کے سمجھنے اور ان پر احکامات صادر کرنے کے لیے فارسی پر دسترس ہونا لازمی تھا۔

مقامی زبانوں کے الفاظ اور لسانی قواعد کے اشتراک سے دکنی زبان کا لہجہ تبدیل ہو گیا مگر اس سے فارسی عناصر پر کوئی زیادہ اثر نہیں پڑا۔ البتہ یہ کہ اگر دکنی زبان کو فارسی اور علاقائی زبانوں کی اصطلاحات اور لسانی قواعد کا مرقع یا مخلوط شکل تسلیم کی جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ مروجہ دکنی اردو پر فارسی کا گہرا اثر ہی نہیں بلکہ بولیوں میں ہم رشتگی پیدا کرنے میں فارسی زبان معاون ثابت ہوئی ہے۔ دکنی عام بول چال میں فارسی زبان کے الفاظ کا خوب استعمال ہوتا ہے جیسے: نادیدہ، گم گشتہ، گلستان، چمن، چمنستان چراغان وغیرہ۔ اس کے ساتھ ساتھ کچھ الفاظ جو فارسی کے لب ولہجے سے آراستہ ہیں، جیسے چاہتاں، مصیبتاں، دوستاں، دشمناں، جاناں، حقیقتاں، وغیرہ وغیرہ۔

الغرض عہد آصف جاہی میں فارسی زبان نے آخر تک اپنا مقام برقرار رکھا اور مسلم حکمرانوں کو بھی فارسی کے متبادل کوئی صورت نظر نہیں آئی یہی وجہ تھی کہ وہ فارسی زبان کو استعمال کرنے کے لیے مجبور تھے۔ اگر تعصب کی عینک اتار کر دیکھا جائے تو دور حاضر میں صرف دکن میں ہی نہیں بلکہ پورے ہندوستان میں سرکاری دفاتر اور عدالتوں میں فارسی اصطلاحات اور الفاظ کو نہ چاہتے ہوئے بھی استعمال کرنے پر ہم مجبور ہیں جیسے؛ سرکار، سرکاری، دستاویز، دستوری، دستخط، حلف نامہ، دفتر، قلم، حاضر، عمل نامہ، شکایت نامہ، دستور، گواہ، گواہی، پیش، پیشی، پیشکش، منصف، عدالت، وکیل، وکالت نامہ، قید، قیدی، حکم نامہ، قوانین وغیرہ۔ دکن کا فارسی سے کتنا گہرا تعلق ہے اس کا اندازہ لب ولہجہ، بول چال، تہذیب وتمدن، فن شاعری، تفریح، پکوان گھر کی آرائش ان تمام پر فارسی فرہنگ کا گہرا اثر دیکھا جا سکتا ہے۔ اور دکن میں ایک لمبی مدت تک فارسی زبان میں ہی درس وتدریس کا سلسلہ چلتا رہا کیونکہ فارسی میں تعلیم ایک سیکولر تعلیم مانی جاتی تھی جس کو مختلف مذاہب کے لوگوں نے ہم آہنگی سے قبول کیا۔

منابع:

1 'فارسی دکن' مولف سید عبدالکریم حسینی ص 9,10

2 ایضاً، ص 44 3 ایضاً، ص 44

4 'سقوط حیدرآباد' مؤلف عمر خالدی و، معین الدین عقیل، مملکت آصفیہ حیدرآباد از سید خلیل اللہ حسینی، طبع جوائے اینڈ جوائے پرنٹرس، حیدرآباد، ہند، ص 254

5 'حیدرآباد میں اردو کی ترقی تعلیمی اور سرکاری زبان کی حیثیت سے' مؤلف ڈاکٹر مصطفیٰ کمال، مطبوع شگوفہ پبلیکیشنز، حیدرآباد، ص: 59,60,61

6 ایضاً، ص 62 7 ایضاً، ص ص 63

8 ایضاً، ص 64 9 ایضاً، ص 64,65

10 مملکت آصفیہ، مرتب: ڈاکٹر محمد عبدالحی، مطبع تنویر پریس، ص 101,201

■

Dr. Junaid Ahmad
Asst. Prof. Depf of Persian
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad- 500032 (Telangana)

محمد صالح انصاری

اردو شاعری میں استادی اور شاگردی کی روایت

اردو شاعری میں استادی اور شاگردی کی روایت خاصی قدیم ہے۔ گلدستوں اور تذکروں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ کسی شاگرد کے لیے اپنے نام کے ساتھ استاد کا نام درج کرنا کس قدر باعث فخر ہوتا تھا۔ قدیم گلدستوں میں بیشتر شعرا کے ساتھ ان کے استاد کا نام بھی درج ہے۔ اردو شاعری کا ایک عہد ایسا بھی گزرا ہے جس میں استاد کے بغیر شاعری کا کوئی تصور ہی نہ تھا۔ کسی کو بے استاد کہنا باعث تضحیک و تمسخر سمجھا جاتا تھا۔ غالب جیسے باکمال اور فن کار شاعر جن کا درحقیقت کوئی استاد نہیں تھا، لیکن ذلت و رسوائی سے بچنے کے لیے انھوں نے بھی ایک فرضی نام ملا عبدالصمد کو اپنا استاد منتخب کیا تھا۔

اردو شاعری میں استادی اور شاگردی کی جو شاندار روایت شمالی ہند میں اس کے آغاز ہی سے قائم ہو چکی تھی وہ کسی اور زبان میں نظر نہیں آتی۔ یہاں تک کے فارسی کے بلند پایہ شعرا جن میں انوری، رودکی، رومی، نظامی، سعدی، جامی اور خیام وغیرہ کا بھی کوئی استاد نظر نہیں آتا۔ اسی طرح عربی شاعری کو دیکھیے عرب والے اپنی قادرالکلامی کے سبب دنیا میں مشہور تھے۔ عربی شاعری میں جاہلی عہد کے کئی ایسے شعرا گزرے ہیں جو بے حد معروف ہوئے، مگر ان کے کلام پر اصلاح دینا تو دور کی بات ہے وہ اصلاح لینے کو بڑا عیب تصور کرتے تھے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی اُن کے کلام پر کسی قسم کی اصلاح یا مشورہ بھی دے دیتا تو شاعر فوراً آمادۂ جنگ ہو جاتا تھا۔ عرب شعرا کے حوالے سے مولانا عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں:

''شعرائے عرب صرف خدا کے شاگرد ہوتے تھے، دنیا میں ان کو کسی استادی کی ضرورت نہ تھی۔''

(عبدالسلام ندوی، شعرالہند جلد اول، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، 2009، ص 98)

اسی طرح اردو کے بالکل ابتدائی عہد کے شعرا کی بات کی جائے تو اُن کے یہاں بھی استادی شاگردی کی روایت دیکھنے کو نہیں ملتی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہی تھی کہ اُس وقت کے دستور کے مطابق مدارس کی مروجہ تعلیم کے ساتھ ہی ساتھ علم عروض اور قافیہ پیمائی کی بھی تعلیم دے دی جاتی تھی۔ اور یہی ان مبتدی شعرا کے لیے کافی ہوتا تھا۔ انھیں الگ سے شاعری کے اصول وضوابط سیکھنے کی چنداں ضرورت نہ تھی۔

مغلیہ عہد میں فارسی زبان کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل تھا۔ فارسی ہر خاص و عام کی زبان تھی لیکن عام بول چال کی زبان کی جگہ اردو یعنی ریختہ نے لے رکھی تھی۔ فارسی شاعری کے لیے جس طرح مشاعرے کا انعقاد کیا جاتا تھا ویسے ہی ریختہ کے لیے مراختے کی مجالس سجائی جاتی تھیں، جس سے رفتہ رفتہ اردو کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا گیا۔ چوں کہ ابتدا میں اردو صرف عام بول چال کی زبان تک محدود تھی، اسے ادبی حیثیت حاصل نہ تھی۔ اُس وقت اردو میں شاعری کرنا کسرِ شان سمجھا جاتا تھا۔ لیکن دکن میں اردو شاعری کو پروان چڑھتا ہوا دیکھ کر شمالی ہند کے فارسی گو شعرا نے بھی اردو میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ بالآخر اردو شاعری جیسے جیسے پروان چڑھتی گئی وہ اپنے دُھندلکے سے نکل کر صاف اور شستہ ہوتی چلی گئی۔ ابتدائی عہد کے شعرا ایک دوسرے سے مشورۂ سخن کر لیا کرتے تھے۔ لیکن جیسے جیسے شعرا کا تعلق دربار سے استوار ہوتا گیا ویسے ہی شعرا دو الگ الگ گروہ میں تقسیم ہو گئے۔ اُن میں ایک قسم درباری شعرا کی تھی تو دوسری غیر درباری شعرا کی۔ چونکہ تمام شعرا کی بس یہی خواہش تھی کہ اسے بھی دربار میں جگہ ملے۔ اس لیے شعرا کے مابین اپنی شاعرانہ برتری قائم کرنے کی غرض سے اپنے حریف اور مدمقابل کو اپنے سے کم تر اور نیچا دکھانے کی کوششیں شروع ہوئیں۔ نتیجتاً ایک شاعر کا دوسرے شاعر کے کلام پر حرف رکھنا یا تنقید کرنا عام بات ہو گئی۔ ایسے میں اگر تنقید فنی زاویے سے حق بجانب ہوتی یعنی کلام کی خامی واضح ہو جاتی تو شاعر کو بڑی شرمندگی اٹھانی پڑتی۔ انھی وجوہات کی بنا پر شعرا کے درمیان اصلاحِ شعر کی جانب رجحان بڑھنے لگا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب کسی محفلِ مشاعرہ میں کلام پیش کرنے سے قبل اصلاحِ سخن کو ضروری سمجھا جانے لگا۔ اس طرح رفتہ رفتہ اصلاح سخن کا رواج عام ہوا، اور یہیں سے اردو شاعری میں استادی اور شاگردی کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت قائم ہوئی۔

اردو شاعری میں اصلاح سخن کا صحیح پتہ لگانے کے لیے ہمیں 1857 سے قبل کے ہندوستان کی ادبی سرگرمیوں کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ پہلی جنگ آزادی 1857 سے قبل ہمیں ہندوستان میں چار ادبی تحریکیں نظر آتی ہیں۔ جو بالترتیب ریختہ گوئی کی تحریک۔ ایہام گوئی کی تحریک، اصلاح زبان کی تحریک اور اصلاح سخن کی تحریک کے نام سے موسوم تھیں۔ ان میں ریختہ گوئی کی تحریک کو اولیت حاصل ہے۔ یہ ادبی تحریک فارسی زبان، فارسی شاعری اور اس عہد کے روایتی ماحول اور طرز زندگی کے خلاف مقامی بولیوں کے زیر اثر ابھر کر سامنے آئی۔ اس ادبی تحریک کی بدولت ریختہ اپنی مترنم آواز کے ساتھ ہر خاص و عام میں مقبول ہوتی چلی گئی۔ ولی کی آمد سے اس تحریک کی جولانی میں مزید اضافہ ہوا۔ دلی کے ایک بزرگ صوفی اور شاعر شاہ سعداللہ گلشن نے ولی کا خیر مقدم کیا اور انھیں چند مفید اور نیک مشوروں سے نوازا۔ انھی کے کہنے پر ولی تصوف کی طرف مائل ہوئے اور دلی کی عام بول چال کی زبان میں شاعری شروع کی۔ ہر طرف ان کی شاعری کے چرچے ہونے لگے۔ دلی میں شعر و شاعری کا بازار گرم ہوا۔ ولی کے طرز پر سب کو دیوان بنانے کی خواہش ہوئی۔ یہ وہی زبانِ ریختہ ہے جو میر، ذوق اور غالب کے دور تک اسی نام سے جانی جاتی رہی جو بعد میں اردو کے نام سے معروف ہوئی۔ جس کے تعلق سے غالب کہتے ہیں۔

'ریختے' کے، تمھیں استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

یہ وہی تحریک تھی جو عام بول چال کی زبان کے طور پروان چڑھی اور رفتہ رفتہ اس قابل ہوئی کہ شاعری کے اعلیٰ نمونے پیش کیے۔ اس تحریک کی بدولت اردو اب ترقی کے منازل طے کر رہی تھی کہ بعض شعرا اسے مقامی، گری پڑی اور بے ہنری کہنا شروع کر دیا۔ اس تضاد نے اس قدر زور پکڑا کہ ریختہ گوئی کی تحریک کے ردعمل کے طور پر ایہام گوئی کی تحریک نے جنم لیا۔ اس عہد کے بیشتر شعرا ایہام گوئی کی طرف مائل ہوئے۔ اس تحریک کے تحت ایسے الفاظ استعمال کیے جانے لگے جس کے دو معنی مراد

لیے جاتے تھے ایک قریب کا دوسرے دور کا ہوتا تھا۔ قریب کا معنی تو فوراً سمجھ میں آجاتا تھا لیکن شاعر کی اصل مراد دور کے معنی سے ہوتی تھی۔ اس قسم کے ہتھ کنڈے کو صنعت گری کا نام دے کر محض قاری کو الجھایا گیا۔ ذو معنی الفاظ کے نام پر شاعری میں کوڑے کرکٹ کا انبار جمع کیا گیا۔ انھی وجوہات کی بنا پر شاہ حاتم کو اپنے دیوان پر نظر ثانی کرنی پڑی، انھوں نے ایہام کے تعلق سے کہے ہوئے اپنے تمام اشعار کو دیوان سے باہر نکالا اور عمدہ اشعار کو از سر نو منتخب کیا اور اصلاح شدہ دیوان کا نام ''دیوان زیادہ'' رکھا۔ اس طرح ایہام گوئی کی یہ تحریک بہت جلد ناکام ثابت ہوئی اور شاہ حاتم کے ساتھ ساتھ اُس عہد کے بیشتر شعرا صاف گوئی کی جانب مائل ہوئے۔

ایہام گوئی کی تحریک اور اس عہد کی دیگر ادبی تحریکوں کے زیر اثر مزید دو اصلاحی تحریکیں اصلاح زبان کی تحریک اور اصلاح سخن کی تحریک نے جنم لیا۔ ان دونوں تحریکوں میں اگرچہ اصلاح زبان کی تحریک کو تقدم حاصل ہے لیکن دونوں تحریکیں ساتھ ہی ساتھ چل رہی تھیں۔ دونوں تحریکوں میں ایک بڑی یکسانیت یہ تھی کہ دونوں کا تعلق شعری زبان کی اصلاح سے تھا۔ ایک کا تعلق شعر کی فکری، فنی اور لسانی اصلاح سے تھا تو دوسری کا شعری زبان کی اصلاح سے۔

یوں تو اردو شاعری کا آغاز شمالی ہند سے ہوتا ہے لیکن اس کو پھلنے پھولنے اور پروان چڑھانے میں دکن کا نمایاں کردار رہا ہے۔ اردو شاعری جب شمال سے دکن پہنچی تو اسے دربارِ شاہی میں جگہ مل گئی۔ جس زبان کو دربار میں جگہ مل جاتی ہے، وہ عوام میں بھی مقبولیت حاصل کر لیتی ہے۔ دکن کے زیادہ تر پیشوائے سلطنت خود شاعر بھی تھے۔ اس لیے دربار میں شعرا کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ تقریباً ہر ایک عہد میں دکن کے شاہی دربار سے شعرا کا تعلق قائم رہا۔ جن شعرا کو دربار سے زیادہ قربت حاصل رہی اور درباری شاعر کہلائے ان میں عبدل، ملا وجہی، نصرتی، غواصی اور ابن نشاطی وغیرہ کے نام کافی اہم ہیں۔ شمال کی طرح دکن کے ابتدائی عہد میں اصلاح سخن کے کوئی واضح نمونے تو نہیں ملتے، جس کی بنا پر دکن میں استادی اور شاگردی کے تحت کوئی حتمی رائے قائم کی جاسکے۔ مگر اتنا تو ماننا ہی پڑے گا کہ جب دکنی شاعری اپنے عروج پر تھی تو وہاں پر بھی اصلاح سخن کا کوئی نہ کوئی طریقہ ضرور رائج رہا ہوگا، یہ الگ بات ہے کہ اس عہد میں استاد سخن کو زیادہ اہمیت نہ دی جاتی رہی ہو۔ چونکہ دکن میں اصلاح سخن کے تعلق سے بہت کم لکھا گیا ہے اور جو کچھ لکھا گیا ہے وہ ناکافی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دکنی شعرا کے یہاں اصلاح سخن کے کوئی واضح نمونے نہیں ملتے۔ البتہ نصیر الدین ہاشمی کی کتاب 'دکن میں اردو' کے مطالعے سے دکن میں بھی استادی شاگردی کے کچھ نقوش مل جاتے ہیں۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''عبدل، ابراہیم عادل شاہ ثانی کے زمانے میں تھا اور اپنے آپ کو سلطان کا شاگرد کہتا تھا۔ اس زمانے میں عام طور پر یہ دستور تھا کہ شاہی استاد خود کو شاگرد کے لقب سے موسوم کرتے تھے۔''

(نصیر الدین ہاشمی، دکن میں اردو، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی، ص 184)

اس اقتباس سے تو یقیناً پتہ چل جاتا ہے کہ عبدل شاعری میں ابراہیم عادل شاہ ثانی کا استاد تھا۔ لیکن یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ اصلاح کس طرح سے دی جاتی تھی۔ یا اس عہد کے عام شعرا کے مابین اصلاح کا کون سا طریقہ رائج تھا۔ یا پھر اُن شعرا کے ذہن میں کس طرح کا اصلاحی جذبہ کارفرما تھا۔ اس لیے ثبوت کی عدم موجودگی میں دکنی شاعری کے ابتدائی عہد کو، شمالی ہند میں چلی آرہی استادی اور شاگردی کی خوشگوار فضا کے ہم پلہ قرار دینا مناسب نہیں۔ لیکن جب دکن اور شمال کا باہمی رشتہ مضبوط ہوا تو دونوں ہی جگہ یکساں ماحول قائم ہو گیا تھا۔ تاریخ کے مطالعے سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اورنگ زیب کے دکن پر قابض ہونے کے بعد جب دکن کا رشتہ شمالی ہند سے استوار ہونا شروع ہوا تو رفتہ رفتہ دکن میں بھی اصلاح سخن کی روایت مضبوطی کے ساتھ قائم ہونے لگی تھی۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ شمال ہی کے طرز پر دکن میں بھی محفلِ مشاعرہ کا آغاز کیا جانے لگا تھا۔

شمالی ہند میں اصلاح سخن کی داغ بیل قدما کے ابتدائی عہد سے ہی دیکھنے کو مل جاتی ہے۔ اصلاح سخن کے اولین نقوش دبستان دہلی کے شعرا کے یہاں بڑے واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ دہلی میں ایک ہی وقت میں اصلاح سخن کی چار اہم تربیت گاہیں موجود تھیں۔ ان میں پہلی تربیت گاہ خان آرزو کا مکان، دوسری شاہ حاتم کا تکیہ، تیسری خواجہ میر درد کی خانقاہ اور چوتھی میر تقی میر کی ڈیوڑھی تھی۔ ان میں اولیت کا درجہ خان آرزو کو حاصل ہے۔ جنھوں نے اصلاح زبان اور اصلاح سخن دونوں ہی تحریک کو اپنے خون جگر سے سینچا اور بڑے بڑے استادِ فن پیدا کیے۔ خان آرزو بذات خود فارسی کے ایک اچھے شاعر تھے لیکن جب ریختہ میں شاعری کی چرچا ہونے لگی تو انھوں نے بھی ریختہ میں شعر کہنا شروع کر دیا۔ اس لیے وہ پہلے استاد سخن تسلیم کیے جاتے ہیں۔ تاہم ان کے اولین اصلاحی کارنامے کے تعلق سے مولوی محمد حسین آزادؔ 'آب حیات' میں لکھتے ہیں:

''خان آرزو کو زبان اردو پر وہی دعویٰ پہنچتا ہے جو کہ ارسطو کو فلسفہ و منطق پر ہے۔ جب تک کہ کل منطقی ارسطو کے عیال کہلائیں گے تب تک اہل اردو خان آرزو کے عیال کہلاتے رہیں گے...... خان آرزو وہی شخص ہیں جن کے دامنِ تربیت سے ایسے شائستہ فرزند تربیت پا کر اٹھے، جو زبانِ اردو کے اصلاح دینے والے کہلائے۔''

(محمد حسین آزاد، آب حیات، کتابی دنیا دہلی، 2014، ص 116)

اس طرح دیکھا جائے تو اردو شاعری کے ابتدائی عہد سے ہی باقاعدہ طور پر استادی اور شاگردی کی روایت کا آغاز ہو چکا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب فارسی کے بزرگ اور باکمال شعرا کے ذریعے ریختہ گوئی کی محفلیں سجائی جانے لگی تھیں، ہر طرف ریختہ گوئی (اردو شاعری) کی خوب چرچا ہونے لگی تھی، ایسے ماحول میں فارسی کے بے شمار شعرا ریختہ گوئی کی طرف مائل ہوئے اور شاعری کے اعلا نمونے پیش کیے۔ اس عہد کے معمول کے مطابق تقریباً تمام ہی شعرا ہر شام کسی منتخب جگہ پر اکٹھا ہوتے اور دیر رات تک شاعری پر چرچا کیا کرتے تھے۔ ان محفلوں میں استاد شعرا کی بھی شمولیت ہوا کرتی تھی۔ یہ اردو شاعری کا ابتدائی زمانہ تھا جہاں بحیثیت استادِ فن خان آرزو اور مرزا مظہر جان جاناں کو اولیت کا شرف حاصل ہوا۔ دہلی میں اس عہد کے تقریباً تمام ہی شعرا یا تو برائے راست یا بالواسطہ خان آرزو کے فیض یافتہ ہیں۔ اُن کے تربیت یافتہ شعرا میں شاہ حاتم، آشنا، مرزا مظہر، عمدہ کاشمیری، محسن اکبر آبادی، میر ناصر علی سامان، ثاقب وغیرہ کا نام کافی اہمت کا حامل ہے۔ اُس عہد کے شعرا میں منصفانہ اور مخلصانہ جذبہ بھی شدید تھا۔ محمد شاہی دور کے ایک اہم اور باکمال شاعر شاہ مبارک آبرو ایک بزرگ شاعر گزرے ہیں مگر خان آرزو کو اپنا کلام دکھایا کرتے تھے۔ اس طرح شرف الدین مضمون جو کہ عمر میں خان آرزو سے بڑے تھے مگر اُن کو بھی میر تقی میر اور میر حسن دہلوی نے خان آرزو کے تلامذہ میں شمار کیا ہے۔ جن کے تعلق سے محمد حسین آزاد لکھتے ہیں:

''اس زمانے کے لوگ کس قدر منصف اور بے تکلف تھے۔ باوجودیکہ مضمون سن رسیدہ تھے اور خان آرزو سے عمر میں بڑے تھے مگر ان سے اصلاح لیتے تھے۔'' (ایضاً، ص 96)

بعد کے شعرا میں میر، سودا اور درد نے بھی اپنے کلام پر خان آرزو سے اصلاح لی ہے۔ خوشگو نے اپنا تذکرہ 'سفینۂ خوشگو' بغرض اصلاح خان آرزو کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ حکیم لاہوری بذات خود لکھتے ہیں کہ میں نے اپنا دیوان غور و فکر کے لیے اُن کی خدمت میں پیش کیا اور انھوں نے اس کے حسن و قبح سے آگاہ کیا۔ خواجہ محمد یحییٰ خان بھی اپنی غزلوں پر خان آرزو سے اصلاح لیتے تھے۔

خان آرزو کے بعد دوسرا بڑا نام مرزا مظہر جان جاناں کا آتا ہے۔ ان کے تلامذہ میں انعام اللہ خان یقین، شیخ

علی حزیں، دردمند اور خواجہ احسن دین خاں بیاں بھی مظہر کے شاگرد تھے۔

مصحفی نے اپنے تذکرے میں اس بات کا ذکر کیا ہے کہ مرزا مظہر جان جاناں اپنے شاگردوں کی اصلاح کے لیے اردو میں مشورۂ سخن کیا کرتے تھے۔ شاہ مبارک آبرو کے تلامذہ کی تعداد بھی کافی تھی۔ ان کے شاگردوں میں محمد حسن فدوی، عبدالوہاب یکرو، ناجی سید غلام، شہاب الدین ثاقب اور محمد عارف وغیرہ بہت معروف ہیں۔ یکرنگ کے تلامذہ میں صلاح الدین اور میر مکھن پاکباز کا نام آتا ہے۔ ان تلامذہ کے علاوہ بہت سے ایسے شعرا بھی تھے جو خان آرزو اور مظہر جان جاناں سے براہ راست تو استفادہ نہ کر سکے، لیکن پھر بھی ایک سلسلے سے ان بزرگ شعرا کا فیض حاصل کیا تھا۔ شاہ حاتم کے دیوان زادہ سے پتہ چلتا ہے کہ محمد رفیع سودا نے بھی شاہ حاتم سے فیض حاصل کیا تھا۔ شاہ حاتم کو سودا کا استاد ہونے پر بڑا ناز تھا۔ شاہ حاتم کے سلسلے میں یہ مشہور ہے کہ جب وہ سودا کی غزل پر اصلاح دیتے تو اکثر یہ شعر ان کی زبان پر ہوتا۔

از ادب صائب خموشم ور نہ در ہر وادیے
رتبۂ شاگردیٔ من نیست استادے مرا

اردو شاعری میں استادی اور شاگردی کے تحت ایسا دور بھی دیکھنے کو ملتا ہے، جہاں کسی شاگرد کو اپنے استاد کے سامنے بڑے ادب و احترام اور تہذیب کے ساتھ پیش آنا ہوتا تھا۔ اُن سے کسی قسم کی لب کشائی یا گستاخی کو بہت برا سمجھا جاتا تھا۔ اس طرح استاد بھی اپنے شاگردوں کا بڑا احترام کرتے تھے۔ اُن کے اندر غرور اور تکبر نہیں تھا۔ بعض دفعہ کوئی شاگرد اپنے استاد کو فنی تقاضوں اور اصولوں کے تحت ٹوک بھی دیتا تو استاد برا نہیں مانتے تھے۔ کسی استاد کے کلام پر ایک شاگرد کی اصلاح، یہ تو اس عہد کے نومشقوں کی فنی آگہی کا اچھا ثبوت ہے۔ اس سلسلے میں مجالسِ رنگینؔ سے ایک واقعہ پیش کیا جا سکتا ہے:

"رنگین شاہ حاتم کے شاگرد تھے بچپن سے بے جھجک اور بے باک تھے بقول خود ان کے مزاج میں چالاکی زیادہ تھی اور شعور کم چنانچہ ایک دن شاہ حاتم نے اپنے شاگردوں اور ارادت مندوں کے مجمع میں اپنا یہ مطلع پڑھا۔

سر کو پٹکا ہے کبھو سینہ کبھو کوٹا ہے
رات ہم ہجر کی دولت سے مزہ لوٹا ہے

رنگین نے سنتے ہی کہا کہ شعر اگر یوں ہوتا۔

سر کو پٹکا ہے کبھو سینہ کبھو کوٹا ہے
ہم نے شب ہجر کی دولت سے مزہ لوٹا ہے

لوگوں کو رنگین کی یہ گستاخی بری معلوم ہوئی، لیکن شاہ صاحب نے بڑی تعریف کی اور کہا کہ میں اپنے دیوان میں اس مطلع کو یوں ہی لکھوں گا۔"

اس قسم کی بہت سی مثالیں دیکھنے کو مل جاتی ہیں، جہاں کسی شاگرد نے اپنے استاد کے کلام پر برمحل اصلاح دی ہے، اور استاد نے اُسے پسند بھی فرمایا ہے۔

جہاں تک اصلاح زبان کا تعلق ہے تو اس تحریک کو پروان چڑھانے والوں میں مصحفی، ناسخ، انشا، جرأت اور رنگین وغیرہ کا نام قابل ذکر ہے۔ یہ وہی شعرا ہیں جنھوں نے اصلاح زبان کی جانب خاص توجہ کی اور متروک الفاظ سے اجتناب اور درست الفاظ کے استعمال پر زور دیتے رہے۔ اس طرح اگر دیکھا جائے تو اس تحریک نے بھی شعری زبان کو ہی فائدہ پہنچایا۔ اس تحریک کا ایک مثبت پہلو یہ بھی رہا کہ زبان کے بنانے اور سنوارنے کی کوشش سے نہ صرف اردو زبان کو فائدہ پہنچا، بلکہ اس عمل سے استادی اور شاگردی کے رشتے کو بھی مزید تقویت ملی۔ بعد کے آنے والے شعرا میں شاہ نصیر، ذوق، غالب، مومن اور ظفر وغیرہ کا عہد شروع ہوتا ہے، جنھوں نے اپنی فنکارانہ صلاحیت سے شاعری میں ایسی گہرائی، گیرائی اور پختگی پیدا کی جس سے اردو شاعری کا وقار بلند ہوا۔ ان شعرا نے اپنے کلام میں نئے فکری عنصر اور خیال کی ندرت سے ایسی معنویت پیدا کی جس سے اردو شاعری کو معراج حاصل ہوئی۔

ذوق، غالب اور مومن کے بعد ان کے شاگردوں کا عہد شروع ہوتا ہے، جس میں داغ، امیر، حالی اور شیفتہ وغیرہ کا نام قابل ذکر ہے۔ ان میں داغ اور امیر کا شمار اردو کے بلند پایہ استاد شعرا میں ہوتا ہے۔ بالخصوص داغ نے تو اصلاح سخن کو بام عروج تک پہنچایا اور ایسے باکمال استاد فن پیدا کیے جس کی مثال اردو شاعری میں نہیں ملتی۔ استاد داغ نے اپنی فن کارانہ بصیرت سے اصلاح سخن کو اس حد تک فروغ دیا کہ شمال اور جنوب کا دامن ایک کر دیا۔ اُن کے اصلاحی عمل سے دونوں ہی جگہ یکساں طور پر اصلاح سخن کا ماحول قائم ہوا۔ داغ کے بعد شمال سے جنوب کا رخ کرنے والے استاد شعرا میں فانی کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔

داغ کے شاگردوں میں علامہ اقبال، سیماب اکبرآبادی، احسن مارہروی اور نوح ناروی وغیرہ کا نام قابل ذکر ہے۔ اس طرح داغ کے شاگردوں میں ایسے متعدد استاد فن پیدا ہوئے جنھوں نے استاد کی روایت کو آگے بڑھانے میں اہم رول ادا کیا، جن میں سب سے خاص نام علامہ سیماب اکبرآبادی کا لیا جاتا ہے۔ سیماب نے نہ صرف استاد داغ کے طریق کار کو اپنایا بلکہ اُن سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر اصلاح سخن کی اعلا مثال قائم کی۔ انھوں نے اصلاح سخن کے تعلق سے باقاعدہ طور پر آگرہ میں قصرالادب کے نام سے ایک ادبی ادارہ قائم کیا۔ جس کے تحت شاگردوں کے کلام پر اصلاح دینے کا کام بڑے پیمانے پر کیا جاتا تھا۔ انھوں نے صرف اتنا ہی نہیں کیا بلکہ ملک و بیرون ملک میں پھیلے ہوئے اپنے کثیر تلامذہ کو فنِ شاعری کے مختلف نکات کو سمجھانے کے لیے اصلاح سخن کے اصول و قواعد بھی مرتب کیے۔ سیماب نے استاد اور شاگرد کے قدیم رشتے کو از سرِ نو مضبوط اور مستحکم کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ عہد سیماب تک تو یہ رشتہ بڑی حد تک قائم و دائم نظر آتا ہے۔ مگر سیماب کے بعد استاد اور شاگرد کے باہمی رشتے میں مسلسل کمزوری آتی گئی، اور آج نتیجہ سامنے ہے، عصر حاضر میں نہ تو اصلاح سخن کی کوئی خاص اہمیت باقی رہی اور نہ ہی استاد اور شاگرد کے پاکیزہ رشتے کی قدر۔

مختصر طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اردو شاعری میں استادی اور شاگردی کی جو روایت شمالی ہند میں قائم ہوئی تھی وہ روز افزوں ترقی کرتی ہوئی ایک تناور درخت کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ اصلاح سخن کے حوالے سے اگر دیکھا جائے تو بڑے واضح طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اردو شاعری کا ایک ایسا دور بھی گزرا ہے جب استادی اور شاگردی بڑے فخر و مباہات کی بات تھی، ہر ایک شاگرد کو اپنے استاد پر بڑا ناز تھا۔ وہ اپنے استاد کا نام بڑے فخر سے لیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ اگر کسی مشاعرے میں شرکت کرتے تو اپنے استاد کی اصلاحوں کو بڑے واضح انداز میں بیان کر دیتے تھے۔ شاعری پر مکمل دستگاہ حاصل کر لینے کے باوجود بھی انھیں اس بات کا احساس تھا کہ شاعری میں جو بلند مقام و مرتبہ انھیں حاصل ہوا ہے یہ سب استاد کی صحیح رہنمائی اور مثبت تربیت کا نتیجہ ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ سلسلہ کم ہوتا گیا۔ دورِ جدید میں استادی اور شاگردی کو عار سمجھا جانے لگا ہے۔ حالانکہ کلام پر اصلاح لینا کوئی عیب کی بات تو نہ تھی۔ لیکن حالات کے تغیرات کا اثر انسان کے فکر و خیال پر بھی ہوا۔ زمانے کی گردش نے سب کچھ تبدیل کر دیا۔ آج کے شعرا کلام پر اصلاح لینا کسرِ شان سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج شعرا کی کثرت کے باوجود ان کے کلام میں وہ شاعرانہ معیار باقی نہ رہا جو متقدمین شعرا کے کلام میں موجود تھا۔ اس لیے یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ عصر حاضر میں جب تک استاد اور شاگرد کا باہمی رشتہ پہلے جیسے مخلصانہ ادب و احترام کے ساتھ قائم نہیں ہو جاتا تب تک ہماری شاعری ہر قسم کے عیوب و نقائص سے مکمل طور پر پاک نہیں ہو سکتی۔

■

Mohammad Saleh Ansari
C/o Huma Paints Store
Mirzahadipura, Maunath Bhanjan
Distt: Mau (UP) 275101
Mob.9044320548

محمد ارشاد

تانیثیت اور رشید جہاں کا تانیثی شعور

تانیثیت کی تحریک کو ہم تین ادوار میں تقسیم کرسکتے ہیں ان ادوار کو اس تحریک کے علمبرداروں نے 'Wave' کا نام دیا ہے۔ پہلا دور بیسویں صدی کے اواخر سے 1960 تک شمار کیا جاتا ہے۔ دوسرا دور 1960 سے 1990 تک کا ہے اور تیسرا دور 1990 سے شروع ہوکر ہنوز جاری ہے۔ پہلے دور کی برکتیں امریکہ میں یوں نظر آئیں کہ ضبط ولادت کو عورتوں کا بنیادی حق قرار دیا گیا اور اس سلسلے میں قوانین میں ترامیم کی شروعات ہوئی اور آخر کار 1973 میں اسقاط حمل کو امریکہ کی عدالت نے مخصوص حالات کے تحت ناقابل سزا عمل قرار دے دیا۔ تانیثیت کے دوسرے دور میں اس کی نظری بنیادیں فراہم کی گئیں۔ اور مغربی دنیا میں اس کے فوائد بھی نظر آنے شروع ہوگئے۔ عورتوں کو یکساں معاشی مواقع دیے گئے اور صنفی تفریق کو باقاعدہ قانون کے ذریعے ختم کرنے کی شروعات ہوئی۔ فیمنزم کے نظریات میں یہ عقیدہ راسخ ہوا کہ مرد اور عورت میں بنیادی طور پر کوئی فرق نہیں ہے۔ فی زمانہ ہم تانیثیت کے تیسرے دور سے گزر رہے ہیں جس میں گزشتہ ادوار کے منفی نتائج کا منطقی جواب تلاش کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

تانیثیت کی اب تک کی تحریک میں سائمن دی بوائر Simon De Beavoir کا نام سب سے اہم نظر آتا ہے۔ انھوں نے 1949 میں 'سکنڈ سیکس' نامی ایک کتاب لکھی۔ جس میں نسائیت کی نظری بنیادوں پر پہلی مرتبہ منظم طور پر بات کی گئی۔ اس کتاب کا 1953 میں انگریزی میں ترجمہ ہوا۔ بوائر نے اپنی کتاب میں ان عوامل کی نشاندہی کی ہے جو مردو کے مقابلے میں قابل عورتوں کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ ان کے مطابق ایک ہی پیشے میں مردوں کے مقابلے عورتوں کی تنخواہوں میں فرق، عورتوں کی گھریلو ذمے داریاں، عورت کا اپنی مرضی سے شوہر کا انتخاب نہ کرپانا، عورت کی کامیابی کی صورت میں شوہروں سے مخاصمت کا پیدا ہونا، وغیرہ وہ وجوہات ہیں جو عورتوں کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ اس کتاب کے بعد ہی فیمنزم کو ایک زمین ملی اور ایک باقاعدہ فیمنسٹ تحریک کا آغاز ہوا۔ جس کے بہتر نتائج آنے شروع ہوئے اور عورتوں کو ووٹ دینے، تعلیم حاصل کرنے اور کام کرنے کے حقوق ملے۔ تاہم اب بھی اسقاط حمل اور موانع حمل ذرائع کے استعمال پر پابندی تھی۔ لہٰذا 1971 میں فرانس کے دو مشہور اخباروں میں Le Manifests 343 کے عنوان سے 343 خواتین کا دستخط شدہ ایک اقبال نامہ شائع ہوا جس میں ان خواتین نے اعلان کیا کہ انھوں نے غیر قانونی طور پر اسقاط حمل کرایا ہے۔ اس اعلان کے بعد پورے فرانس میں ان عورتوں کو زبردست حمایت حاصل ہوئی اور 1975 آتے آتے فرانس میں اسقاط حمل کو قانونی طور پر جائز قرار دے دیا گیا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب پہلی بار عورتوں کو حق ملکیت، نوکریوں میں مردوں کے مساوی اجرت اور اعلیٰ تعلیمی اداروں تک رسائی حاصل ہوئی۔[1]

اگر ہندوستان میں تانیثیت کے ابتدائی سوتوں کی تلاش کی جائے تو ہماری نگاہ مغل بادشاہ اکبر پر سب سے پہلے پڑتی ہے جس نے اپنی سیاسی مصلحتوں کے تحت ستی کے رسم کو غیر قانونی تو نہیں قرار دیا تاہم یہ قانون بنایا کہ عورتوں کو زبردستی ستی نہیں کیا جاسکتا اگر وہ اپنی مرضی سے اس رسم کا حصہ بنیں تو اور بات ہے۔ اکبر کے بعد راجہ رام موہن رائے نے اس رسم کے خلاف تحریک چلائی اور آخر میں ولیم بینٹنگ نے 1829 میں اسے غیر قانونی قرار دے دیا۔ بعد کے زمانے میں سرسید کے رفقا میں حالی، نذیر احمد، مولوی ممتاز علی، مولوی کرامت حسین اور شیخ عبداللہ کے نام لیے جاسکتے ہیں جنھوں نے عورتوں کی تعلیم میں خاص طور سے دلچسپی لی۔ اس سلسلے میں جہاں نذیر احمد اور حالی نے تحریری طور پر اپنا تعاون پیش کیا وہیں مولوی کرامت حسین اور شیخ عبداللہ نے میدان عمل میں اتر کر لڑکیوں کے لیے لکھنؤ اور علی گڑھ میں کالج قائم کیے۔ سرسید کے قریبی لوگوں میں حالی کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ لڑکیوں کے طریقہ تعلیم کے باب میں سرسید کے نظریات چاہے جو بھی رہے ہوں لیکن حالی کا یہ ماننا تھا کہ

"ساری قوم سے میری یہ عرض ہے کہ لڑکیوں کی تعلیم میں کوشش کریں اور خدائے تعالیٰ نے جو جوہر قابل انھیں دیا ہے، اس کو خاک میں نہ ملائیں۔"[2]

دراصل اس زمانے میں ہندوستان میں عورتوں کے لیے تانیثیت کی سب سے پہلی منزل یہی تھی کہ انھیں مردوں کی طرح تعلیم کے میدان میں یکساں مواقع فراہم کیے جائیں۔ لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ ان کا یہ اہم مطالبہ کسی خاتون کی طرف سے نہیں کیا گیا تھا بلکہ مردوں ہی نے عورتوں کے حقوق کی ادائیگی کی بات کی۔ دراصل ہمارے مشرقی سماجی وتہذیبی رویے میں عورت کو مغرب کی طرح محض ایک جنس کے طور پر کبھی نہیں دیکھا گیا بلکہ اسے ہمیشہ محترم ومقدس ہی سمجھا گیا ہے۔ ہندوؤں میں عورت کو دیوی تو مسلمانوں میں ماں کے قدموں تلے جنت کے تصورات اس خیال کی تائید کرتے ہیں۔ ہندوستان کے علاوہ چین کی مثال بھی پیش کی جاسکتی ہے جہاں مورخین نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس خطہ زمین پر تانیثیت کی شروعات مغرب سے بہت پہلے 1791 میں ہوچکی تھی اور وہاں بھی ہندوستان ہی کی طرح اس تحریک کی شروعات خواتین کے بجائے مردوں نے کی۔[3] لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ اول تو مشرق میں تانیثیت کے اولین علم بردار مرد تھے دوم یہاں تانیثیت کی شروعات اسی وقت ہو

چکی تھی جب مغرب اس کے لیے اصطلاحیں تراش رہا تھا۔ ایک قابل غور بات یہ بھی ہے کہ مغرب میں اس تحریک کی صورت ایک 'تقاضے' کی تھی جب کہ ہمارے یہاں تانیثیت 'اصلاح' کی شکل میں نمودار ہوئی۔

فیمنزم کی اس مختصر تاریخ کے بعد اگر بات رشید جہاں کے تانیثی شعور کی کریں تو ان کے یہاں فیمنزم مغرب کی طرح اپنے بلند بانگ نعروں کی صورت میں نظر نہیں آتا اور نہ ہی ان کی کہانیاں نسائیت کے ان تقاضوں کو پورا کرتی ہیں جن کی نشاندہی مغرب میں کی گئی تھی۔ رشید جہاں مشرق کی بیٹی تھیں اس لیے ان کی کہانیوں میں تانیثیت کی وہی دھیمی جھلک اور اصلاح کی وہی مدھم روشنی نظر آتی ہے جو مشرقی تصور تانیثیت کا خاصہ ہے۔ ان کی کہانیوں میں تانیثیت کا تصور ایک زیریں لہر کی طرح محسوس ہوتا ہے جس میں کبھی بھی سرکش موجوں کی تندی کا احساس نہیں ہوتا۔ ان کے یہاں عورت کی آزادی اور اس کی خود مختاری کا اعلان ہمیشہ ایک تہذیب اور شائستگی کے پردے میں ہی کیا گیا ہے۔ ان کی کہانیوں میں ہمیں عورت کا وہ روپ نظر آتا ہے جسے ابھی ابھی اپنی بندشوں کا احساس ہوا ہے۔ اس کے اندر ایک کلبلاہٹ تو ہے لیکن وہ ہمت نہیں جو ان بندشوں کے حصار کو توڑ دے۔ اس کی مناسب ترین توجیہ تو یہی ہے کہ رشید جہاں ہماری پہلی خاتون افسانہ نگار ہیں جنھوں نے اپنی کہانیوں کے لیے ایسے موضوعات کا انتخاب کیا جو کہیں نہ کہیں زندگی سے زیادہ قریب اور اپنے وقت کے اعتبار سے نئے تھے۔ اس اعتبار سے رشید جہاں اردو کی وہ پہلی خاتون افسانہ نگار ہیں جنھوں نے نہ صرف سماج کے دیگر مسائل کی طرف توجہ دی بلکہ عورت کی خودمختاریت کا اعلان بھی ان کے یہاں مل جاتا ہے جو یقیناً اس وقت ایک انقلابی قدم تھا۔ اس سلسلے میں قمر رئیس فرماتے ہیں کہ:

"...ترقی پسند ادیبوں میں پریم چند کے بعد رشید جہاں تنہا تھیں جنھوں نے اردو میں سماجی اور انقلابی حقیقت نگاری کی روایت کو مستحکم بنانے کی سعی کی۔"[4]

اگر بات متنی تنقید یا جمالیاتی تنقید کی ہوتی تو فن پارے کی پرکھ اور تعین قدر کے لیے تخلیق کار کے سماجی و سیاسی حالات سے واقفیت کی قطعی ضرورت نہیں تھی لیکن رشید جہاں کے فن پر اس وقت تک کوئی محاکمہ نہیں کیا جاسکتا جب تک ان کے اردگرد کے ماحول کو نہ سمجھ لیا جائے۔ رشید جہاں کا گھرانہ شمالی ہندوستان میں تعلیم نسواں کا علمبردار پہلا گھرانہ تھا۔ ان کے والد شیخ عبداللہ عرف پاپا میاں اور والدہ وحید جہاں نے علی گڑھ میں ویمنس کالج قائم کیا۔ ہندوستان میں یہ پہلا کالج تھا جہاں خواتین کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اقامت کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔ اس کالج کی ترقی اور اس کی بقا کے لیے وحید جہاں یہیں منتقل ہوگئیں تاکہ لوگوں کو اپنی لڑکیوں کو یہاں بھیجنے میں کسی طرح کا تردد نہ ہو۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ تانیثیت رشید جہاں کے خون میں شامل تھی۔ انھوں نے خود بھی ایک جگہ اس کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ "ہم نے تو جب سے ہوش سنبھالا ہے ہمارا تو تعلیم نسواں کا اوڑھنا ہے اور تعلیم نسواں کا بچھونا ہے۔"[5]

اس کے علاوہ انھوں نے اپنے لیے ایسے نظریے کا انتخاب کیا تھا جو سب کے لیے مساوات و برابری کے اصول پر قائم تھا۔ لہٰذا برابری و مساوات کے یہی عناصر تھے جنھوں نے رشید جہاں کی نگاہوں میں عورت کو ایک مکمل وجود کے طور پر دیکھنے کی صلاحیت پیدا کی۔ ان کی کہانیوں کی عورتیں صرف مرد کا تکملہ نہیں ہوتیں اور نہ انھیں ہم محض مرد کا آدھا حصہ کہہ سکتے ہیں بلکہ انھوں نے اپنے مکمل وجود کو اسی طرح منوایا ہے جس طرح ہم مرد کے وجود کو مانتے ہیں۔ لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اتنے بڑے مسئلے اور اتنے پیچیدہ موضوع کے بیان کے لیے بھی ان کے یہاں کسی پرزور احتجاج کا احساس نہیں ہوتا۔ ان کی کہانیوں کی عورتیں انتہائی متانت و سنجیدگی سے اپنی بات رکھتی ہیں اور اپنے ہونے کا احساس دلاتی ہیں۔ ان کے افسانے 'ساس اور بہو' میں جہاں ساس کو ایک روایتی ساس کے طور پر پیش کیا گیا ہے وہیں بہو نہ صرف اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون ہے بلکہ اس کے اندر صبر و استقلال اور متانت و سنجیدگی کے ساتھ معاملہ فہمی کا عنصر بھی نمایاں ہے۔ 'میرا سفر' کی پڑھی لکھی زبیدہ ہو یا 'فیصلہ' کی صفیہ یا افسانہ 'افطاری' کی نسیمہ یہ تمام خواتین اپنے اندر ایک ایسا آتش فشاں رکھتی ہیں جو کبھی بھی پھٹنے نہیں پاتا بلکہ اندر ہی اندر ابلتا رہتا ہے اور جب یہ آتش فشاں اپنے نقطہ ابال سے تجاوز کرتا ہے تو ہمیں عصمت کی 'ٹیڑھی لکیر' میں شمشاد اور اس کی سہیلی ایلما کے کردار ملتے ہیں جو ہر طرح کی سماجی قید سے نہ صرف نبرد آزما ہیں بلکہ انھیں توڑنے میں بھی کسی طرح کی تشویش محسوس نہیں کرتے۔ رشید جہاں اپنے کرداروں کی زبانی اپنی کہانی کو بہت کم آگے بڑھاتی ہیں جہاں تک ممکن ہوتا ہے مصنفہ خود ہی کرداروں کے عادات و اطوار سے قاری کو واقف کراتی ہیں۔ اس طرح قاری کہانی میں اتر کر اس کا حصہ بننے کے بجائے دور سے آنے والی کسی آواز کی مدد سے کہانی سنتا ہے۔

رشید جہاں کے تمام کرداروں کو ہم آسانی سے دو گروہوں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔ یہ گروہی تقسیم بتاتی ہے کہ ان میں ایک گروہ قدیم روایات کا دلدادہ ہے۔ نئے زمانے میں بھی پرانی قدروں کا متلاشی ہے۔ حالاں کہ اپنی روایات سے محبت اور ان کا احترام کوئی عیب ہرگز نہیں ہے تاہم جب زمانے کے تقاضوں کو ہماری قدیم روایتیں پورا نہ کرسکیں تو انھیں ترک کردینے اور نئی راہوں کے انتخاب میں کوئی مضائقہ نہ ہونا چاہیے۔ دوسرا گروہ تعلیم یافتہ، پرانے کی اہمیت سے باخبر نیز نئے کی ضرورت سے بھی واقف ہے اور بے جا رسوم پر بارہا معترض بھی ہوتا ہے۔ قابل غور بات یہ ہے کہ ان دونوں گروہوں کے نمائندہ کردار خواتین ہی ہیں۔ قمر رئیس درست فرماتے ہیں کہ "...ان کے افسانوں میں ہیرو کے بجائے ہیروئن کا کردار ہی نمایاں نظر آتا ہے۔"[6]

رشید جہاں کے یہاں خواتین کے کئی روپ ہیں۔ خواتین جادو ٹونا کرتی ہیں، اپنی بہوؤں کو مارتی پیٹتی ہیں، ظلم سہتی ہیں، اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی ہیں، صنفی حمیت میں لفنگوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتی ہیں، اپنے شوہروں سے اصولی اختلاف کرتی ہیں اور سب سے بڑھ کر اپنے خدا کی تلاش میں اس لیے نکلتی ہیں کہ آخر اس نے سماج کی طبقاتی تقسیم میں انھیں غریب کیوں بنایا؟ یہ ہے رشید جہاں کی عورتوں کا صنفی تنوع۔ انھوں نے کبھی بھی عورت کو کسی ایک قسم میں بند نہیں کیا بلکہ اس کے ہر روپ کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ جہاں وہ عورت کو تعلیم یافتہ اور اپنے حقوق سے واقف سماج کے ایک باخبر انسان کے طور پر پیش کرتی ہیں وہیں دبی کچلی خواتین کی بپتا کو بھی طشت از بام کرکے وہ تانیثی تصورات کے اس پہلو کو بھی مستحکم کرتی ہیں کہ عورتوں پر ظلم مرد کریں یا عورت، یہ ظلم بہر حال بند ہونا چاہیے۔ یہاں یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ مردوں نے عورتوں کے حقوق کو سلب کرکے سماجی سطح پر بھلے ہی ان پر ظلم کیا ہے تاہم برصغیر میں گھریلو سطح پر ایک عورت ہی ساس کی شکل میں دوسری عورت پر سب سے زیادہ ظلم کرتی ہے۔ اس سلسلے میں 'چھدا کی ماں' کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ جو اپنے بیٹے کی کئی شادیوں کو محض اس لیے ختم کروا دیتی ہے کہ گھر میں اس کی بادشاہت قائم رہے۔ افسانہ 'ساس اور بہو' میں جاہل ساس کا پڑھی لکھی بہو کے ہر عمل پر حتیٰ کہ بچے کو ٹائیفائڈ کا انجکشن لگوانے پر بھی ناتشفی کا اظہار اسی 'برصغیریت' کا خاصہ ہے جس کا ذکر ابھی کیا گیا۔

رشیدہ جہاں کے افسانوں کی مائیں بھی اپنی بیٹیوں پر کم ظلم نہیں کرتیں، ہاں ان کا ظلم تشدد آمیز تو نہیں ہوتا لیکن بے علمی اور جھوٹی شان کے نتیجے میں لڑکیوں سے روا رکھے جانے والا رویہ بعض اوقات تشدد آمیز ظلم سے زیادہ کریہہ ہوجاتا ہے۔ رشتوں کے انتخاب میں لڑکی کے والدین کے بے جا تقاضے، نئے زمانے کی قدروں پر قدیم

روایات کی ترجیح، عزت و ناموس کے تحفظ کے بھرم میں دقیانوسیت کی پاسداری اور مذہبی رسوم کے نام پر بعید از عقل روایات کی تبلیغ ان ماؤں کی فطرت کے حصے ہیں۔ بلا شبہ یہ عورتیں پوری نیک نیتی کے ساتھ اپنی اولاد کی بھلائی کی خواہاں ہیں تاہم سماج میں راسخ غیر ضروری رسوم نے ان کے دماغوں کو اس طرح جکڑ لیا ہے کہ وہ انھیں کسی بھی طور پر چھوڑنا نہیں چاہتیں۔ افسانہ 'بے زبان' میں صدیقہ بیگم کی والدہ اور افسانہ 'سلمیٰ' میں سلمیٰ کی امی کا کردار ان بے علم روایتی ماؤں کا کردار ہے جنھوں نے تحفظ ناموس کے صرف یہ معنی سمجھے ہیں کہ ان کی بیٹیوں پر کسی کی نظر نہ پڑے بھلے ہی وہ ساری زندگی حجلہ عروسی کو ترس جائیں۔ صدیقہ محض اس لیے 23 برس کی ہوجاتی ہے کہ اس کی والدہ لڑکے والوں کو اپنی بیٹی نہیں دکھانا چاہتی اور متواتر کئی رشتوں کو منع کر چکی ہے۔ جب بہت دنوں کے بعد پھر ایک رشتہ آتا ہے تو صدیقہ کی کچھ امید بندھتی ہے لیکن اس کی والدہ اس رشتے کو بھی انکار کر دیتی ہے اور صدیقہ جس کی طرف سے اس غیر مرئی ظلم پر پورے افسانے میں اب تک کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا گیا تھا، اپنے کمرے میں جا کر سسکیوں سے رونے لگتی ہے۔ صدیقہ کا کردار اس زمانے کے مسلم گھرانے کی ان لڑکیوں کا استعارہ ہے جن کے والدین یہ سمجھ نہیں پاتے ہیں کہ ایک مخصوص عمر کے بعد انسانوں میں کچھ بایولوجیکل تبدیلیاں ہوتی ہیں جن کے نتیجے میں وہ ایسے احساسات سے گزرتا ہے جنھیں عرف عام میں جنسی خواہشات کہا جاتا ہے۔ جنسی خواہشات کا بیان بھلے ہی ہمارے ثقہ ممنوع سمجھتے ہوں لیکن انسان میں ان کی موجودگی کا کون منکر ہوسکتا ہے۔ جب ہم غور کرتے ہیں کہ ایسے وقت میں جب مغرب میں عورتیں اسقاط حمل اور ضبط حمل کے حقوق کے لیے تحریکیں چلا رہی تھیں ہماری خواتین کو ہندوستانی معاشرے میں اپنی مرضی کی شادی تو کجا اس سلسلے میں لب کشائی بھی بے ہودگی و بے حیائی کے مترادف سمجھی جاتی تھی۔ ایسا نہیں ہے کہ گزشتہ ایک صدی کے تہذیبی سفر میں ہم نے اپنے سماجی معراج کو پا لیا ہے۔ ہمارے یہاں یہ ناسمجھی آج بھی موجود ہے کہ ہم اپنی اولادوں کی اس اہم ترین جبلت کو غیر شعوری طور پر ہی سہی نظر انداز کر دیتے ہیں جس سے سماج میں خیر و شر کا وہ توازن باقی نہیں رہ پاتا جس کی تبلیغ کے لیے آج دنیا کا تقریباً ہر ملک ہر سال اربوں روپے خرچ کر رہا ہے۔ اگر سنجیدگی اور ایمانداری سے غور کیا جائے تو آج بھی ہمارے سماج میں صدیقہ جیسی نہ جانے کتنی بے زبانیں سسک رہی ہیں اور ہماری عاقبت نااندیش نظران کے آنسوؤں کو دیکھنے سے عاری ہے۔

صدیقہ بیگم کی والدہ نے اس کی پرورش جس ڈھب سے کی تھی وہ قابل افسوس ہے۔ ایک اقتباس دیکھیے:

''صدیقہ بیگم کو ان کی والدہ احمدی بیگم نے بالکل بھونرے میں پالا تھا۔ قریب سے قریب رشتہ داروں نے لڑکی کی صورت ٹھیک سے نہ دیکھی تھی۔ اپنی ہر ملنے جلنے والی سے صدیقہ کو پردا کرواتی تھیں۔ جس طرح خود اپنے کنوارپن میں رہی تھیں اسی طرح بیٹی کو بھی رکھتی تھیں۔ بے مانگ کی چوٹی گندھواتیں، عطر تو بڑی چیز ہے پھول تک چھونے کا حکم نہ تھا۔ ہر ممکن کوشش اس کو بچہ اور انجان بنا کر رکھنے کی کرتی تھیں۔''7

آخر میں کچھ باتیں رشید جہاں کے فن پر کرنی ضروری معلوم ہوتی ہیں۔ مختلف لوگوں نے کہانی لکھنے کے لیے اپنے گرد و پیش کے ماحول سے واقفیت کو ایک لازمی شرط قرار دیا ہے۔ سارتر کو تو اس شخص کے ادیب ہونے پر بھی شک ہے جو اپنے گرد و پیش کے حالات سے بے خبر رہے۔ اقبال مجید کے مطابق افسانہ لکھنے کے لیے کتابوں سے زیادہ انسانوں کو پڑھنا پڑتا ہے۔ خالد جاوید ادب کا کام یہ بتاتے ہیں کہ وہ ضمیر کے دھول بھرے صدر دروازے پر لگاتار دستکیں دیتا ہے۔ کوئی ادیب یہ نہیں کہہ سکتا کہ ادب کا سماج سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ لیکن یہ ضروری بھی نہیں کہ شعور عصر کی جھلک کو لازمی قرار دے دیا جائے۔ سابق وزیر تعلیم سید نورالحسن نے رشید جہاں کے افسانوں کے بارے میں کہا تھا کہ ''یہ سنی سنائی کہانیاں نہیں۔ آنکھوں دیکھے اور اپنے آپ پر جھیلے واقعات ہیں جنھیں رشید جہاں کے حقیقت نگار قلم نے بڑی صداقت بیانی کے ساتھ کاغذ پر اتار دیا ہے''8

شاید یہ اسی حقیقت نگار قلم کا نتیجہ ہے کہ ان کے افسانے میں تھوڑی بہت فنی لاپروائی بھی در آئی ہے۔ ایسا صرف رشیدہ جہاں کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے بلکہ ہر اس شخص کے یہاں فن کی کمی کا احساس ہوتا ہے جس نے اپنی تحریروں سے کسی نظریے کی تبلیغ کا کام لینا چاہا۔ ان حضرات کے لیے فن کے تقاضوں کو پورا کرنے سے زیادہ قارئین کے سامنے اپنے مافی الضمیر کا مکمل اظہار ضروری ہوتا ہے۔ فکشن کی حقیقت میں تخیل کے تناسب اور اس تناسب کی نوعیت کے سلسلے میں آج بھی بحث جاری ہے۔ کسی زمانے میں حقیقت کو کہانی میں بغیر لاگ لپیٹ کے من و عن بیان کرنے پر اسرار کیا گیا تھا۔ حقیقت نگاری کے اس یک رخے تصور کے خلاف ہمارے یہاں اور مغرب میں بھی علامتی طرز تحریر کا راستہ نکالا گیا اور پھر جب لوگ اس طرز تحریر سے بھی اوب گئے تو جادوئی حقیقت نگاری کی تکنیک ایجاد کی گئی۔ کہانی کو کسی بھی تکنیک میں لکھا جائے ہر حال میں حقیقت کا بیان ہی ہوتا ہے کیوں کہ ہم ایسی کسی چیز کا تصور خواب میں بھی نہیں کر سکتے جسے ہم نے دیکھا نہ ہو۔ اس لیے فکشن میں حقیقت کے ساتھ تخیل کا تناسب اور اس کی نوعیت اسے ان مختلف تکنیکوں کے زمروں میں تقسیم کرتی ہے تاہم فکشن کے لیے تخیل ایک ناگزیر امر ہے۔ اس سلسلے میں خالد جاوید نے درست کہا ہے کہ ''اگر فکشن میں تخیل نہ ہو اور نام نہاد حقیقت کے مشاہدے کا دباؤ ضرورت سے زیادہ بڑھ جائے تو ناول یا افسانہ محض ایک صحافتی بیان بن کر رہ جائے گا۔''9 یہاں ہم رشید جہاں سے کسی طرح کا سوال نہیں کر سکتے کہ انھوں نے ایسا کیوں کیا اور ویسا کیوں نہیں کیا۔ اس کی وجہ گزشتہ سطور میں بتائی جا چکی ہے کہ وہ اردو کی پہلی خاتون افسانہ نگار ہیں جن کے سامنے تقلید کے لیے ایسے نمونے تھے جن میں زندگی کے سیدھے سادے اور اکہرے تصور کو پیش کیا گیا تھا، جنھیں رشید جہاں کے حقیقت نگار قلم نے قبول نہیں کیا۔ اور انھوں نے اپنے شعور و ادراک اور اپنے نظریات کو کام میں لا کر جس طرح کا موضوعاتی تجربہ کیا وہ کسی نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں اور ہمارے لیے یہی کافی ہے کہ بعد کے لکھنے والوں نے ان کی تحریروں سے اپنے تصنیفی رویوں کا لائحہ عمل تیار کیا۔

حواشی

1 فیمنزم موومنٹ : تاریخ اور اثرات از شمشاد حسین فلاحی، مشمولہ ماہ نامہ رفیق منزل، 8 مارچ 2019

2 تحریک نسواں کے علم بردار خواجہ الطاف حسین حالی از صغرا مہدی، مشمولہ فیمنزم اور ہم، مرتبہ فاطمہ حسن، وعدہ کتاب گھر کراچی، ص 21

3 فیمنزم موومنٹ : تاریخ اور اثرات از شمشاد حسین فلاحی، مشمولہ ماہ نامہ رفیق منزل، 8 مارچ 2019

4 وہ اور دوسرے افسانے از رشید جہاں، ناشر رشید جہاں یادگار کمیٹی، نئی دہلی، ص 22،

5 رشید جہاں کے مکمل افسانے، ص 12، ترتیب و تدوین شکیل صدیقی، ایم آر پبلیکیشنز، نئی دہلی

6 وہ اور دوسرے افسانے از رشید جہاں، ناشر رشید جہاں یادگار کمیٹی، نئی دہلی، ص 22

7 رشید جہاں کے مکمل افسانے، ص 80، ترتیب و تدوین شکیل صدیقی، ایم آر پبلی کیشنز، نئی دہلی

8 وہ اور دوسرے افسانے از رشید جہاں، ناشر رشید جہاں یادگار کمیٹی، نئی دہلی، ص 8

9 اداریہ از خالد جاوید، مجلہ ارمغان، جلد 8، شمارہ 10، ص 19، شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

■

Mohammad Irshad
Research Scholar, Dept of Urdu
Kolkata University
Kolkata - 700073 (West Bengal)
Mob.: 8296069173

تحقیق میں مفروضے کی اہمیت

محمد عاطف

مفروضہ در اصل حقائق اور تصورات پر مبنی عناصر کا ایک قیاس محض ہے۔ یہ نیم تاریکی میں ایک دھندلی سی کرن یا روشنی کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ مسائل کے حل کا روشن اندازہ بھی ہے یعنی ایک فوری تعمیم (Generalization) یا نظریہ جسے مشاہدے کے نتیجے میں کسی واقعے کے مزاج یا کردار میں ڈھالا گیا ہو۔ یہ ایک ایسا عارضی بیان ہے جسے کسی وقتِ مخصوص کے مظہر یا واقعے کے بارے میں حقیقت کی حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا ہو۔ مفروضہ کسی نئے سچ کی تلاش و تحقیق میں منصوبے اور عمل میں بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔

تحقیقی عمل کی اگر تشریح مقصود ہو یا اس پر کسی نوع کا مباحثہ درکار ہو تو یہ پہلو بہر کیف ہمارے اذہان میں ہونا چاہیے کہ کیسے اس عمل میں ایک خاص اقدام خود کو مبنی بر شواہد امور سے جوڑتا ہے۔ تمام تحقیقی مقالے کچھ سوالوں اور مفروضات سے شروع ہوتے ہیں۔ کسی تحقیقی مطالعے میں اس سے متعلق کچھ تحقیقی سوالات و مفروضات ہی اس تحقیقی مطالعے میں کسی فردِ مخصوص کی اس میں رہ نمائی کرتے ہیں۔ مفروضہ (Hypothesis) اسی کیفیت کا اظہار ہے۔

سب سے پہلے ہمیں اس مذکورہ لفظ کے اشتقاق پر نظر ڈالنی ہوگی۔ قدیم یونانی ادبیات سے اخذ کردہ یہ لفظ اصلاً hypo اور thesis کا مرکب ہے جس میں اول الذکر کے معنی نیچے، ذیل یا under کے ہیں اور موخر الذکر کے رکھنا یا placing کے۔ یعنی ذیل یا نیچے کی کوئی چیز جس پر کچھ رکھا جا سکے۔ یوں اس لحاظ سے ایک لفظ میں اس کے معنی foundation کے ہوئے جو اردو میں لفظ بنیاد کا ہم پلہ ہے۔ بعد کے کچھ لوگوں نے اس کو sub-statement یعنی ذیلی بیان سے بھی تعبیر کیا۔ لیکن انگریزی میں یہ لفظ راست طور پر یونانی سے نہیں بلکہ سولہویں صدی میں یہ لاطینی سے ہوتے ہوئے انگریزی میں داخل ہوا۔ یوں مذکورہ یونانی لفظ کو اگر غیر مرکب کر کے دیکھا جائے تو اس لفظ کی اہمیت خود بخود واضح ہو جاتی ہے۔ اسی لیے بعد کے دانشوروں نے اس کو تحقیقی عمل میں 'بنیاد' (Primer/ foundation) کی حیثیت عطا کی۔

علم فلسفہ کے سیاق میں رکھ کر اگر اس لفظ پر غور کیا جائے تو یہ بات کھلتی ہے کہ کوئی ایسا قیاس جسے (اس کی حقیقت یا سچائی کا خیال کیے بغیر) کسی منطقی عمل میں بنیاد بنا لیا جائے، یعنی مفروضہ یہ ہے کہ ہر واقعے یا حادثے کے پس پردہ کچھ اسباب ہیں۔ یوں تکنیکی طور پر اگر دیکھا جائے تو مفروضہ کسی قیاس کا ممکنہ یا احتمالی بیان ہے، تفتیش و تحقیق جس کے متقاضی اس صورت میں ہوں کہ اس کی توثیق و تردید کی جا سکے۔ اسی لیے جب فلسفے کے سیاق میں اس کی تعریف کی گئی تو کہا گیا:

[مفروضہ] وہ ہے جسے کسی حقیقت یا حقائق کے مجموعے کی مشروط تشریحات کے اصول کے طور پر پیش کیا جائے۔ یا دوبارہ پھر کچھ مخصوص مظاہر کے بارے میں کسی عارضی قیاس کی حیثیت سے پیش کیا جائے نیز یہ کچھ ایسے مشاہدات و تجربات کی تشکیل میں رہنما اصول کی طرح اس وقت تک پیش کیا جائے جب تک کہ اس کی توثیق و تردید بعد میں رونما ہونے والے شواہد کی روشنی میں نہ ہو جائے۔ (ڈوگوبرٹ، ڈی۔ رونس، ڈکشنری آف فلاسفی، نیو یارک: فلاسوفیکل لائبریری، [سنہ ندارد]، ص 134)

اس کی وضاحت میں چند معروف لغات کی تعریفات درج ذیل ہیں:

مفروضہ ایک ایسی شے ہے جسے مان لیا جائے یا جسے [بادی النظر] صحیح سمجھا جائے... مفروضے میں جو تصورات شامل ہیں انھیں خود قابل مشاہدہ اشیا کے حوالے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ تاہم، [اس کے] اولین حالات مشاہدے کے قابل ہونے چاہئیں یا انھیں تجرباتی طور پر خلق بھی کیا جا سکے اور اس سے مستنبط حقائق ایسے ہوں کہ ان کا مشاہدہ کیا جا سکے۔ (بریٹانیکا آن لائن)

مفروضہ یعنی کسی شے کا کوئی ایسا تصور یا تشریح جو کہ کچھ معلومہ حقائق پر مبنی ہو لیکن ابھی اس کو ثابت کیا جانا باقی ہو۔ (اوکسفرڈ/کیمبرج آن لائن ڈکشنری)

مفروضہ یعنی کوئی تصور یا تھیوری جو ابھی ثابت نہ ہوئی ہو لیکن مزید مطالعے یا مباحثے کی جانب رہنمائی کرے۔ (میریم ویبسٹر آن لائن ڈکشنری)

ان تمام پہلوؤں کو بدائرۂ ذہن رکھتے ہوئے اس کی ایک تفصیلی تعریف یوں بھی کی جا سکتی ہے کہ مفروضہ کسی پیش گوئی کا ایک مخصوص بیان ہے۔ یعنی کسی محقق کے ذریعے سب سے اساسی یا عارضی تشریح یا کوئی قیاس جس کی تفتیش کرتے ہوئے اس کے نتائج کے بارے میں محقق کو اندازہ ہو کہ کیا کیا ہوں گے۔ یہ ایک ایسا علمی و معلوماتی اندازہ ہے جو دو یا اس سے زیادہ مظاہر و متغیرات کے مابین ممکنہ رشتوں کی وضاحت کرتا ہے۔ بہ الفاظِ دیگر یہ سب سے مخصوص طریقہ ہے جس میں کسی مسئلے کا جواب دیا جا سکتا ہے۔ لیکن ایک مفروضہ کسی مسئلے سے مختلف ہوتا ہے۔ مسئلے سے مراد یہاں سوال ہے۔ مثلاً کسی مسئلے کی فارمولہ سازی کسی سوال کی کی شکل میں ہوتی ہے؛ اور یہ

مسئلہ ایک ایسی اساس یا مآخذ کی حیثیت سے کارفرما ہوتا ہے جس سے مفروضہ جنم لیتا ہے۔ مفروضہ اصلاً کسی مسئلے کا مجوزہ حل ہے۔ کسی مسئلے (سوال) کو راست طور پر جانچا جاسکتا ہے جب کہ مفروضے کو جانچا پرکھا بھی جاسکتا ہے اور اس کی توثیق بھی کی جاسکتی ہے۔ مفروضے کی فارمولہ سازی اس وقت کی جاتی ہے جب مسئلہ بیان ہو چکا ہو اور ساتھ ہی اس سے متعلق لٹریچر کا مطالعے کی روشنی میں نتیجہ بھی اخذ کیا جا چکا ہو۔ مفروضے کی تشکیل اسی وقت ہوتی ہے جب محقق کسی مسئلے کے نظری (Theoretical) اور تجربی (Empirical) پس منظر سے کلی طور پر واقف اور آگاہ ہو۔

مشہور اطالوی مفکر اور دانشور امبرتو اِکو (Umberto Eco) کہتے ہیں کہ کوئی بھی تحقیق وہ عوامل یا عناصر فراہم کرتی ہے جو اس میں پیش کردہ مفروضے کی توثیق یا تردید کرے اور اسی لیے یہ مستقبل میں ہونے والی کسی بھی تحقیق کا سنگ بنیاد ہوتی ہے۔ یہ سب سے بنیادی ضرورت ہے۔ (ہاؤ ٹو رائٹ اے تھیسس، ایم آئی ٹی پریس، یو ایس اے، ص30) لیکن مفروضے کے بارے میں سب سے اہم بات یہ بھی ذہن میں ہونی چاہیے کہ مفروضہ خود کسی ٹھوس بنیاد پر ایستادہ ہوتا ہے، اسی لیے دنیا کے زیادہ تر محققین اور سائنس داں اس ایک بات پر متفق ہیں کہ مفروضے کا سب سے اہم جز مشاہدہ ہے۔ کم از کم علم تاریخ سے متعلق آثار قدیمہ اور سائنسی دریافتوں کے بارے میں تو یہ مسلمہ اصول ہے کہ جب بھی کسی کھدائی میں کوئی نیا شہر دریافت ہوتا ہے تو ماہرین سب سے پہلے اس کا مشاہدہ کرتے ہوئے متعلقہ نکات کو آپس میں مربوط کر کے دیکھتے ہیں۔ ممکن ہے پہلی بار جو تاریخی بیانیہ خلق کیا جائے وہ بادی النظر میں فٹ لگے اور ایک خاص عرصے تک قابل قبول بھی ہو، لیکن پھر کچھ نئی تحقیقات اور دریافتوں کی روشنی میں انھیں چیلنج کر دیا جائے یا صورت حال اس کے برعکس بھی ہوسکتی ہے۔ امبرتو کا مذکورہ خیال اسی بات کی تائید کرتا ہے کہ مفروضہ مستقبل میں ہونے والی تحقیقات کا رہنما ہوتا ہے۔ وادیِ سندھ کی تہذیب اور علم جغرافیہ میں براعظموں کا کھسک کر ایک دوسرے سے دور ہوتے جانا کچھ ایسے ہی سنگ میل مفروضات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کم و بیش یہی کیفیت ادب اور علوم انسانی سے متعلق مطالعات پر بھی منطبق ہوتی ہے۔ فرق بس اتنا ہے کہ یہ مطالعات سائنسی مطالعات کی طرح حتمی طور پر معروضی نہیں ہوتے یوں ان میں کسی بھی قسم کی حتمیت کا تعین قدرِ محال ہوتا ہے لیکن مفروضے کی حیثیت سے انکار ادبی مطالعات میں بھی ممکن نہیں۔ مثلاً غالب کی شاعری میں سب سے پہلے فلسفے کے انتہائی دقیق مسائل کی جانب توجہ دلانے والے کسی بھی ادیب یا ناقد کے ذہن میں فلسفے کے بنیادی یا عمیق خدوخال پہلے سے موجود رہے ہوں گے۔ یہ موجود خدوخال ہی دراصل ادبی مطالعات میں مشاہدے کا کام انجام دیتے ہیں اور یہی وہ فیصلہ کن موڑ ہوتا ہے جب مفروضہ متشکل ہوتا ہے۔

ان تمام تعریفات سے کچھ بنیادی اور مشترکہ نکات سامنے آتے ہیں: ایک تو یہ کہ مفروضہ فی نفسہٖ کسی ہوا ہوائی چیز کا نام نہیں۔ یعنی ثابت ہونے سے پہلے بھی اس کے پس پشت کچھ ٹھوس اور بنیادی مشاہدات ہوتے ہیں جو بعد میں مزید تفتیش و تحقیق کے متقاضی ہوتے ہیں۔ بایں وجہ اخیر اخیر تک اس کے غلط یا صحیح ہونے کے سارے امکانات موجود ہوتے ہیں۔

کسی تحقیق کے آغاز میں مفروضہ کچھ سنجیدہ خیالات کے لیے محرک کا کردار ادا کرتا ہے جو کسی مظہر یا واقعے کے الجھاؤ یا تشکیکی کیفیت میں ہمیں ایک ہلکی سی بصیرت دیتا ہے اور اخیر میں یہ ایک قیاس کی صورت میں اہمیت سے پُر کسی نتیجے تک اس طرح پہنچتا ہے کہ دریافت شدہ چیزوں کی روشنی میں اسے رد یا قبول کیا جاسکے۔ اس لحاظ سے یہ دو باتوں کا مرکب ہے؛ اول تو یہ عارضی ہے یا ایک ایسا موضوع ہے جو تفتیش و تحقیق کا طالب ہے اور دوم یہ کہ یہ کسی مسئلے کے حل کا بیان ہے۔ بہ الفاظ دیگر یہ کہا جاسکتا ہے کہ مفروضہ کسی مسئلے کے حل کا ایک فوری یا عارضی (tentative) بیان ہے۔ مفروضہ ہمارے سامنے کسی ایسے مسئلے کا حل پیش کرتا ہے جسے ابھی تجرباتی طور ثابت کرنا باقی ہو نیز یہ بھی کہ یہ تصدیق و اثبات منطقی یا عقلی دلائل پر مبنی ہوں۔

مفروضے کا ایک اہم مفہوم یہ بھی ہے کہ یہ دو یا دو سے زیادہ متغیرات (Variable) کی ترکیب ہے، جس کی توثیق ابھی باقی ہو۔ دوم یہ کہ ان متغیرات کو ایک مخصوص سیاق و سباق کے سانچے میں رکھا جاسکے۔

مفروضہ دراصل حقائق اور تصورات پر مبنی عناصر کا ایک قیاس محض ہے۔ یہ نیم تاریکی میں ایک دھندلی سی کرن یا روشنی کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ مسائل کے حل کا روشن اندازہ بھی ہے یعنی ایک فوری تعمیم (Generalization) یا نظریہ جسے مشاہدے کے نتیجے میں کسی واقعے کے مزاج یا کردار میں ڈھالا گیا ہو۔ یہ ایک ایسا عارضی بیان ہے جسے کسی وقتِ مخصوص کے مظہر یا واقعے کے بارے میں حقیقت کی حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا ہو۔ مفروضہ کسی نئے سچ کی تلاش و تحقیق میں منصوبے اور عمل میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ تاہم جارج جے۔ ماؤلی (George J. Mouly) اسے مزید عقلی جواز فراہم کرتے ہوئے کہتے ہیں:

Hypothesis is an assumption or proposition whole testability is to be tested on the basis of the computability of its implication with empirical evidence with previous knowledge.

یعنی؛ مفروضہ ایک خیال (فرض کیا ہوا) یا ایک تجویز یا پیش کش ہے جس کی جانچ پرکھ گزشتہ معلومات اور تجربی شواہد کے ساتھ اس کے مخفی نتائج کی شمار ہونے کی اہلیت کی بنیاد پر کی جاتی ہے۔

یوں اگر اس لحاظ سے دیکھا جائے تو مفروضے کے تین پہلو نکل کر سامنے آتے ہیں:

1 گمان (Assumption)

1 منظور شدہ پہلو (Postulate)

3 مفروضہ (Hypothesis)

گمان یعنی چیزوں کو اس طور پر لینا کہ منطقی طرز عمل کے لیے صورت حال کو آسان بنایا جائے، اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ استدلال (Argument) یا مباحثے کو معتبر یا موثر بنانے سے قبل کچھ محدود کن شرائط بھی رکھتا ہے۔

گمان منطقی بصیرت کی بنیاد پر وجود میں آتے ہیں نیز یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ان کے سچ ہونے کے لیے کچھ شواہد اور ڈیٹا کی بنیاد پر ان کا مشاہدہ کیا جاسکے۔

منظور شدہ پہلو زیادہ تر سائنسی عمل کے پس پردہ کارفرما تیقنات ہیں۔

مفروضہ ان دونوں سے الگ ہے۔ یہ پہلے سے کسی قیاس کا فرض کردہ بیان ہے نیز محقق یا تفتیش کار اسی کی توثیق کرتے ہیں۔

مفروضے کا تفاعل

کسی تحقیق میں اگر مفروضے کے عمل کو درج کر لیا جائے تو تحقیق میں مفروضے کی اہمیت مزید واضح ہو جاتی ہے۔ نکاتی طور پر اسے ذیل میں دیکھا جاسکتا ہے:

(الف) یہ کسی مسئلے کا فوری حل ہے جو کسی ایسے سچ سے بھی جڑا ہوتا ہے جو کہ محقق کو اپنا تحقیقی کام شروع کرنے کے لائق بناتا ہے۔

(ب) ''کیا مطالعہ کرنا ہے؟'' جیسی خاصیت قائم کرنے کی بنیاد فراہم کرتا ہے جو آگے چل کر کسی مسئلے کا ممکنہ حل بھی پیش کرتی ہے۔

(ج) ہر مفروضے کے بطن سے کوئی اور مفروضہ بھی جنم لے سکتا ہے۔

(د) ہر ابتدائی مفروضہ کسی حتمی مفروضے کی شکل بھی اختیار کر سکتا ہے یعنی ممکن ہے کہ آخری نتیجہ برآمد ہونے

تک یہ صحیح ثابت ہو جائے اور اسے ایک حتمی شکل حاصل ہو جائے۔

(ہ) ہر مفروضہ محقق کو ایک حتمی بیان فراہم کرتا ہے جسے معروضی طور پر جانچا جا سکتا ہے اور جسے آگے چل کر قبول یا رد کیا جا سکے۔

مفروضے کی اقسام

(الف) سوال نما مفروضہ (Question form of a Hypothesis) کچھ مصنفین کا دعوا ہے کہ مفروضہ سوال کی شکل میں بھی ہو سکتا ہے لیکن اس خیال پر اب تک اتفاق رائے نہیں ہو سکا ہے۔ سب سے بہتر یہی مانا گیا ہے کہ یہ تجربی مشاہدے کی سب سے آسان نمائندگی کرتا ہے لیکن فی الحقیقت یہ مفروضے کی زیادہ تر تعریفات میں اب تک فٹ نہیں ہو سکا ہے۔

(ب) اعلانی یا اظہاری بیان (Declarative Statement) کوئی مفروضہ اعلانی یا اظہاری صورت میں بھی ترقی پذیر ہو سکتا ہے جو کہ مختلف متغیرات کے مابین کسی باہمی رشتے کو پیش کرے جو پہلے سے سوچا بھی گیا ہو۔

(ج) جہتی مفروضہ (Directional Hypothesis) کوئی مفروضہ جہتی بھی ہو سکتا ہے یعنی جو ایک ربطِ باہم میں کچھ متوقع جہات کو جوڑتا بھی ہو۔

(د) غیر جہتی مفروضہ (Non- directional Hypothesis) کوئی مفروضہ صفری (Null) شکل میں بھی ہو سکتا ہے یعنی یہ دعوا کرے کہ مختلف متغیرات کے مابین کوئی ربط باہم یا افتراقات موجود نہیں ہیں۔

ایک اچھے مفروضے کے مقاصد، خواص، اور اس کی اہمیت:

جہاں تک ایک اچھے مفروضے کا سوال ہے تو یہ متغیرات کے مابین مختلف رشتوں کی تشریحات پیش کرتا ہے جنھیں تجربی طور پر جانچا جا سکے، ساتھ ہی یہ اس بات کے وافر ثبوت بھی پیش کرتا ہے کہ محقق کے پاس معلومات کا ایسا بیک گراؤنڈ ہے جو اسے موجودہ علم کی مزید توسیع میں کچھ نئی تجاویز پیش کرنے کا اہل بناتا ہے۔ ایک اچھا مفروضہ جہاں کسی تحقیق و تفتیش کو ایک متعینہ سمت عطا کرتا ہے وہیں یہ اگلے مرحلے کی تلاش و جستجو کو ایک ڈھانچے میں لاتا ہے اور بایں سبب کسی مسئلے کی جانچ پرکھ میں ایک تسلسل کو راہ دیتا ہے۔ اسی لیے اس کے بارے میں اکثر یہ کہا جاتا ہے یہ ایک ایسا طاقتور آلہ ہے جو عملِ تحقیق میں کسی ٹھوس اور پائیدار علم کے حصول کا ذریعہ بنتا ہے۔

اپنے خواص کے اعتبار سے ایک اچھا مفروضہ اپنے اندر ہمیشہ تشریح کی قوت رکھتا ہے، ساتھ ہی اسے کسی مظہر کی ایک قابل قبول توضیح فراہم کرنے کے لیے کوشاں ہونا چاہیے۔ یہ ایسا ہو کہ اس کی تصدیق و تردید کے سارے امکانات موجود ہوں نیز بہت سادہ اور قابل فہم اصطلاحات ولفظیات میں متشکل ہو اور موجودہ علم اور معلومات کے ساتھ تطابق اور ہم آہنگی بھی رکھتا ہو۔ موجودہ علم کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے جانچا پرکھا جا سکے اور یہ حقیقت پسندانہ رویے پر مبنی ہو، بالکل واضح اور غیر مبہم اصطلاحات میں بیان کیا جا سکے۔ مختلف متغیرات کے مابین متوقع رشتوں کو بیان کر رہا ہو اور ساتھ ہی یہ اگر اپنے دائرہ کار میں محدود ہو تو اور بھی بہتر ہے۔

اب جہاں تک ایک اچھے مفروضے کی اہمیت کا سوال ہے تو ایک اچھا مفروضہ مشاہدہ کیے گئے حقائق کے ساتھ اصلاً ایک معاہدے کی سی حیثیت رکھتا ہے یعنی اس کا فطرت کے کسی بھی قانون کے ساتھ (جو اصولاً سچ سمجھا جاتا ہو) تصادم نہیں ہوتا۔ ایک عمدہ اور اچھا مفروضہ سب سے آسان اور ممکنہ اصطلاحات میں بیان کیا جاتا ہے، ساتھ ہی یہ منطقی قیاس کے اطلاق کی اجازت بھی دیتا ہے۔ وہ اپنے اندر واضح طور پر پُرگوئی (Verbalization) بھی رکھتا ہے۔ ایک اچھا مفروضہ اس بات کی یقین دہانی بھی کرتا ہے کہ تصدیق و توثیق کے طریقہائے کار محقق کے کنٹرول میں ہیں۔ یہ اس بات کی ضمانت دیتا ہے کہ فراہم شدہ اسباب و آلات اور تکنیک تصدیق و توثیق کے مقصد میں مؤثر طریقے سے استعمال کیے جائیں گے۔ ایک اچھا مفروضہ کنٹرول کی مختلف اَشکال و اقسام پر غور کرنے میں معاون ہوتا ہے یعنی وہ شکلیں یا قسمیں جو تصدیق کے مقاصد میں روبہ عمل لائی جائیں گی۔ مختلف متغیرات کے رول (جن کا مطالعے میں عمل دخل ہوگا) کی جانب بھی اشارہ کرتا ہے جسے نظریۂ قانون (Theory of Law) حقائق، گمان اور قیاس سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ ساتھ ہی یہ ان سب کے مابین ایک واضح امتیاز کو بھی بنائے رکھے۔

مفروضے کے ایک ماہر گڈ (Good, 1963) ایسا مانتے ہیں کہ مزید تفتیش کے لیے محقق کی رہنمائی کرنے میں اور فوری طور پر اخذ کی ہوئی تعمیمات کا جواب تلاش کرنے میں مفروضہ محقق کے لیے ''آنکھ'' کی حیثیت رکھتا ہے۔

مفروضہ تحقیق پر اپنی توجہ مرکوز رکھنے میں معاون ہوتا ہے۔ اس کے بغیر تحقیق غیر مرتکز رہتی ہے جس کی مثال ایک بے ترتیب تجرباتی آوارہ گردی یا کھکڑ پن کی طرح ہے۔ مفروضہ، نظریہ اور تحقیق و تفتیش کے مابین ایک لازمی رابطے کی مانند ہے۔ یہ کچھ واضح اور مخصوص مقاصد کا تعین بھی کرتا ہے یعنی یہ محقق کے سامنے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے نمونے اور تحقیقی عمل کے انتخاب میں بنیاد فراہم کرتا ہے۔ گڈ کا یہ بھی کہنا ہے کہ مفروضہ متعلقہ حقائق اور معلومات کو باہم جوڑنے میں ناگزیر عمل کا کام کرتا ہے اور پھر انھیں منظم طور پر اجتماعی انداز میں یکجا کرتا ہے۔ ایک اور ماہر ینگ (Young, 1965) کا کہنا ہے کہ مفروضہ اندھی تلاش اور تحقیق سے بچاتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ محقق کو اُس قسم کے ڈیٹا کا انبار لگانے سے بھی بچا لیتا ہے جو آگے چل کر مطالعے اور تحقیق کے لیے غیر متعلق ہو سکتے ہیں۔

ان تمام پہلوؤں کے ساتھ کچھ اور باتیں بھی اہم ہیں جو ایک اچھے مفروضے کی اہمیت کو دوبالا کرتی ہیں مثلاً ایک اچھا مفروضہ کسی علم کی توسیع میں موجود رخنوں اور رکاوٹوں کو دور کرتے ہوئے اس میں مزید سہولیات کا ضامن بنتا ہے نیز یہ محقق کو اس بات کا اہل بناتا ہے کہ وہ نامعلوم حالات کے بارے میں منطقی طور سے معلومہ حقائق کو ذہانت بھرے اندازوں اور قیاسات کے ساتھ مربوط کر سکے۔ یہ ہمیشہ تحقیق کو ایک جہت اور سمت عطا کرتا ہے ساتھ ہی یہ محقق کو ایک ایسی اساس فراہم کرتا ہے کہ وہ کچھ نمونوں اور اعداد و شمار سے متعلق تکنیک کا انتخاب کر سکے، نیز یہ ایک ایسی بنیاد بھی خلق کرتا ہے جس کی روشنی میں مطالعہ و تحقیق کے متعلق نتائج کے بارے میں رپورٹ تیار کی جا سکے۔

ماحصل:

مفروضہ سائنسی طور پر برتے جانے والی کسی بھی تحقیق میں خشتِ اول کی حیثیت رکھتا ہے خواہ وہ علوم سائنس سے متعلق ہوں، طبیعی علوم سے ہوں یا مطالعاتِ انسانی سے متعلق۔ اصلاً مفروضہ ہی کسی تحقیقی عمل کا محور اور اس کی دُھری ہے۔ تمام تحقیقی سرگرمیاں مفروضے کی توثیق کے اردگرد ہی گردش کرتی ہیں۔ اس رول کے علاوہ اصول و قوانین اور نظریے کی تعمیر میں بھی اس کا رول ہے۔ سچ کہا جائے تو مفروضہ بذات خود ایک فوری نظریہ بھی ہے، توثیق کے بعد جو حتمی نظریے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ایک نئے مفروضے سے کوئی نیا نظریہ جنم لیتا ہے اور پھر اسے توثیق کا موضوع بنایا جاتا ہے۔ توثیق کے بعد یہ اپنے مطالعاتی دائرے میں پھر ایک نظریہ بن جاتا ہے اور اس طرح نئے نظریات کی تشکیل و تعمیر میں یہ دَوری عمل (Cyclic process) جاری و ساری رہتا ہے اور اس طرح تحقیق کا سفر بھی ارتقا پذیر رہتا ہے۔

■

Mohd. Atif
D-241 Ground Floor,
Abul Fazal, Jamia Nagar,Okhla
New Delhi- 110025
Mob.: 8882940351

گوپی چند نارنگ کا لسانی ولسانیاتی شعور

درخشاں زریں

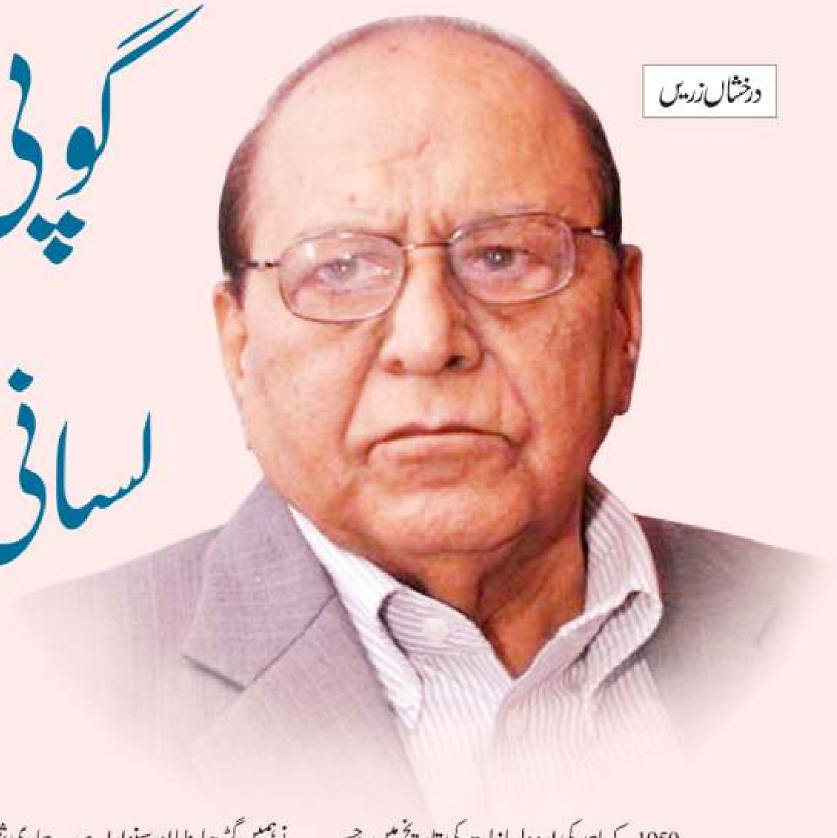

1950 کے بعد کی اردو لسانیات کی تاریخ میں جسے ہم اردو لسانیات کے تیسرے دور سے تعبیر کرتے ہیں۔ گوپی چند نارنگ کا مقام کافی اہم ہے۔ انھوں نے اپنے گہرے لسانی شعور، فکری بساط اور ذہنی تجسس سے اردو زبان، اس کی تہذیب، سماجیات اور اسرار و رموز سے متعلق جو تحریریں پیش کی ہیں وہ کافی اہم اور ناقابل فراموش ہیں۔ اردو زبان کی ساخت، بنیاد، پیدائش، تاریخ، روایت، ارتقا اور دیگر زبانوں سے اس کے رشتے کا موقف بالکل واضح ہے۔ اس طرح کی ان کی تحریریں بالکل واضح اور مدلل ہیں۔ اردو سے ان کا رشتہ بڑا گہرا تھا جس کا اظہار انھوں نے بارہا اپنی تحریروں میں کیا ہے۔ ذیل کے اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

''سب جانتے ہیں کہ اردو ہماری صدیوں کی تہذیبی کمائی ہے۔ یہ ملی جلی گنگا جمنی تہذیب کا وہ ہاتھ ہے جس نے ہمیں گڑھا بنایا اور سنوارا ہے، یہ ہماری ثقافتی شناخت ہے جس کے بغیر نہ صرف ہم گونگے بہرے ہیں بلکہ بے ادب بھی۔ میں نے بارہا کہا ہے کہ اردو کو محض ایک زبان کہنا اردو کے ساتھ بے انصافی کرنا ہے۔ یہ ایک طرزِ حیات، ایک اسلوبِ زیست، ایک اندازِ نظر یا جینے کا ایک سلیقہ و طریقہ بھی ہے، اس لیے کہ اردو صدیوں کے تاریخی ربط و ارتباط سے بنی ایک جیتی جاگتی زندہ تہذیب کا ایک ایسا روشن استعارہ ہے جس کی کوئی دوسری مثال کم از کم برصغیر کی زبانوں میں نہیں۔''

(اردو زبان اور لسانیات، مطبوعہ رامپور رضا لائبریری، رامپور، ص 11)

''اردو میری مادری زبان نہیں، میری ددھیال اور ننھیال میں سرائیکی بولی جاتی تھی، میری ماں دہلی ہجرت کے بعد بھی سرائیکی بولتی تھیں جو نہایت میٹھی اور رسیلی زبان ہے، لیکن مجھے کبھی محسوس نہیں ہوا کہ اردو میری

مادری زبان سے دور ہے۔ اردو نے شروع ہی سے دوئی کا نقش میرے شعور سے مٹا دیا۔ مجھے کبھی محسوس نہیں ہوا کہ اردو میرے خون میں جاری وساری نہیں۔ یہ میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ اردو میری ہڈیوں کے گودے تک کیسے اترتی چلی گئی، یقیناً کچھ تو جادو ہوگا۔ تاج محل کا کرشمہ مثالی ہے، میں اردو کو 'زبانوں کا تاج محل' کہتا ہوں اور اکثر اس لذت کو اپنے خون کی روانی میں سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے خبر و بے خبری میں محسوس کرتا ہوں۔ زبان میرے لیے رازوں بھرا بستہ ہے۔ کیسے ہند آریائی کے بستے میں عربی، فارسی، ترکی کے رنگ گھلتے چلے گئے اور کیسے ایک رنگا رنگ دھنک بنتی چلی گئی کہ جنوبی ایشیا کے اکثر ممالک کے طول و عرض میں وہ آج 'لنگوا فرینکا' بھی ہے اور ایک ایسا ادبی اظہار بھی ہے جس کے رس اور بالیدگی کو دوسری زبانیں رشک کی نظر سے دیکھتی ہیں۔'' (دیباچہ، مشمولہ، اردو زبان ولسانیات، ص 12)

گوپی چند نارنگ نہایت ہی فعال اور متحرک شخصیت کے مالک تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں بہت کچھ کیا اور لوگوں کو کرنے کے لیے اکسایا بھی، اور انھیں نئی نئی راہیں دکھائیں۔ جہاں تک سوال اردو زبان کا ہے تو انھوں نے اردو زبان و ادب کے تعلق سے مختلف گوشوں کو اپنی تعلیمی، ادبی اور تحقیقی زندگی کا محور بنایا اور بڑھ چڑھ کر اس میں حصہ لیا۔ خصوصاً لسانیات سے ان کی بڑی گہری دلچسپی تھی۔ انھوں نے لسانیات کی باضابطہ تعلیم حاصل کی اور بیرون ملک جاکر اس کے رموز و نکات سے واقف ہوئے۔ انھوں نے لسانیاتِ جدید کی تربیت امریکہ کی وسکانسن اور انڈیانا یونیورسٹیوں میں قیام کر کے حاصل کی اور ہندستان آکر لسانیات کی مختلف شاخوں سے اپنے فطری ربط کا اظہار کیا۔

ان اقتباسات سے گوپی چند نارنگ کے اردو سے گہرے لگاؤ اور رشتے کو سمجھا جا سکتا ہے۔ انھوں نے اپنی ابتدائی تعلیم اردو اور سنسکرت دونوں زبانوں میں حاصل کی اور جیسے جیسے شعور کی منزل تک پہنچتے گئے اردو ان کی گھٹی میں رچ بس گئی۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کے تعلق سے جہاں کہیں بھی انھوں نے بات کی ہے وہ اپنے اسی طرح کے جذبے کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں۔ آج اردو کا یہ سپاہی ہمارے درمیان موجود نہیں لیکن ان کی تحریریں اور فکر ان کی یاد تازہ کر رہی ہیں۔

گوپی چند نارنگ نہایت ہی فعال اور متحرک شخصیت کے مالک تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں بہت کچھ کیا اور لوگوں کو کرنے کے لیے اکسایا بھی، اور انھیں نئی نئی راہیں دکھائیں۔ جہاں تک سوال اردو زبان کا ہے تو انھوں نے اردو زبان و ادب کے تعلق سے مختلف گوشوں کو اپنی تعلیمی، ادبی اور تحقیقی زندگی کا محور بنایا اور بڑھ چڑھ کر اس میں حصہ لیا۔ خصوصاً لسانیات سے ان کی بڑی گہری دلچسپی تھی۔ انھوں نے لسانیات کی باضابطہ تعلیم حاصل کی اور بیرون ملک جا کر اس کے رموز و نکات سے واقف ہوئے۔ انھوں نے لسانیاتِ جدید کی تربیت امریکہ کی وسکانسن اور انڈیانا یونیورسٹیوں میں قیام کر کے حاصل کی اور ہندستان آ کر لسانیات کی مختلف شاخوں سے اپنے فطری ربط کا اظہار کیا۔

لسانیات کے تعلق سے آپ کا مطالعہ نہایت گہرا اور وسیع ہے۔ آپ نے تاریخی اور سماجی لسانیات کے ساتھ ساتھ لسانیات کی جدید شاخوں یعنی صوتیات، اسلوبیات، ساختیات اور پس ساختیات جیسے علوم کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا۔ علاوہ ازیں انھوں نے اپنی تنقید میں بھی لسانیاتی اصول کو مدنظر رکھا اور اس کے نئے نئے شعبے سامنے لائے۔ گوپی چند نارنگ کی لسانیاتی تحقیق میں جامعیت اور پختگی نظر آتی ہے۔ انھوں نے اس کی تکنیکی حیثیت کے ساتھ ساتھ اس کے تخلیقی اور فکری پہلوؤں پر بھی نظر رکھی۔ اس ضمن میں ان کی ایک اہم پیش کش 'اردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلو' (1961) ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے غیر اردو داں کو اردو سکھانے کے بنیادی پہلوؤں پر لسانیاتی زاویے سے روشنی ڈالی ہے۔ تو آیئے اس سے قبل کہ ان کے لسانی اور لسانیاتی شعور پر مزید گفتگو ہو ان کی تمام لسانیاتی تحریر پر ایک نظر ڈال لیں۔

گوپی چند نارنگ کا لسانی کارنامہ اردو زبان کی مختلف شاخوں پر مبنی ہے۔ خالص لسانیاتی موضوعات پر ان کی تحریریں کچھ اس طرح ہیں:

کتابیں

1. (1961) Karkhandari Dilect of Urdu Language
2. اردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلو (1961)
3. منشورات (دتاتریہ کیفی) ترتیب و مقدمہ (1968)
4. کربل کتھا کا لسانی مطالعہ (بہ اشتراک) (1970)
5. املا نامہ (ترقی اردو بیورو) (1974)
6. امیر خسرو کا ہندوی کلام مع نسخۂ برلن ذخیرۂ اشپرنگر (1987)
7. اردو زبان و لسانیات (2006)

مضامین

اردو زبان کے مطالعے میں لسانیات کی اہمیت، کیفی کی لسانی خدمات، احتشام حسین کی لسانی خدمات، اردو، ہماری اردو، اردو ہندی کا لسانی اشتراک، اردو اور ہندی کا رشتہ، دہلوی اردو کی کرخنداری، اردو آوازوں کی نئی درجہ بندی۔ اردو کے افعال مرکبہ پر نظر، اردو محاوروں اور کہاوتوں کی سماجی توجیہ، ہمزہ کیوں؟، اردو رسم الخط: تہذیبی و لسانی مطالعہ، 'ن اور ں' اور 'اردو املا اور لسانیات' وغیرہ۔ ان کے علاوہ لسانیات کی اہم شاخ اسلوبیات پر لکھی گئی تحریریں بھی اس میں شامل ہیں۔ اس ضمن میں ذاکر صاحب کی نثر اردو کے بنیادی اسلوب کی ایک مثال، اسلوبیاتِ انیس، اسلوبیاتِ میر، اسلوبیاتِ اقبال اور اقبال کی شاعری کا صوتیاتی نظام وغیرہ اہم ہیں۔ علاوہ ازیں ان کی کتابیں ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات، امیر خسرو کا ہندوی کلام (تحقیق)۔ ان کی انگریزی زبان میں لکھی گئیں لسانی تحریریں اور NCERT کے لیے تیار کردہ اردو نصاب وغیرہ بھی کئی جہتوں سے اردو لسانیات کی اچھی توجیہ پیش کرتی ہیں۔

'اردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلو' اپنی نوعیت کی پہلی پیش کش ہے۔ اس کتاب میں روایتی طریقۂ کار سے ہٹ کر لسانیات کے مسلمہ اصولوں کے پیش نظر تدریسِ اردو کی سہل اور اہم راہیں بتائی گئی ہیں۔

اس میں سب سے پہلے نارنگ نے ان اصولوں کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے جن کے ذریعے دیگر زبانیں سیکھی جا سکتی ہیں۔ اس کے بعد ان کا اطلاق اردو پر کیا اور اس کے نئے نئے گوشے سامنے لائے۔ نارنگ نے اس نکتے کو عیاں کیا کہ محض الفاظ کے رٹ لینے سے کسی دوسری زبان پر گرفت حاصل نہیں ہو سکتی، اس کے لیے ان مسلمہ اصولوں کا جاننا ضروری ہے جو کسی بھی زبان سے گہرے طور پر وابستہ ہوتے ہیں۔ جیسے اس کے مخصوص صوتی نظام، قواعد، ساخت، تلفظ اور محاورے وغیرہ سے آشنا ہونا لازمی ہے تبھی ہم اس پر مکمل دسترس حاصل کر سکتے ہیں۔ آگے چل کر وہ اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ مادری زبان کے برعکس غیر زبانوں کو سیکھنے میں شعوری کوشش اور مشق کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ مشق کے دو طریقے بتاتے ہیں، بالواسطہ اور لسانیاتی طریقۂ کار۔ ان میں لسانیاتی طریقۂ کار زیادہ اہم ہے جن میں مشینوں اور دیگر سمعی اور بصری آلات کے ذریعے امتیازی آوازوں، بنیادی جملوں اور لب و لہجے کی مشق کرائی جاتی ہے اور اس طرح کوئی بھی زبان نیز اردو زبان بہ آسانی سیکھی جا سکتی ہے۔ یہ کتاب نارنگ کی ایسی پیش کش ہے جو قاری کو غیر معمولی طور پر متاثر کرتی ہے۔ بقول احتشام حسین:

''مطالعہ زبان کے جدید طریقوں کے رواج نے ترقی یافتہ مغربی ملکوں میں مختلف زبانوں کے سیکھنے اور سکھانے کے عمل کو بہت آسان بنا دیا ہے۔ اردو ابھی ایسی تصانیف سے تقریباً محروم ہے جن سے ان طریقوں کا علم ہو۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی مختصر کتاب 'اردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلو' بڑی خوبی سے موضوع کو متعارف کرتی اور تھوڑی سی جگہ میں اس کے بنیادی اصولوں کی توضیح کرتی ہے۔''

(اردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلو)

گوپی چند نارنگ نے اردو کی املا سازی، اصلاحِ زبان اور صرف و نحو پر بھی خاص توجہ دی اور ان موضوعات پر کئی اہم مضامین لکھے۔ مثلاً اردو آوازوں کی نئی درجہ بندی، اردو مصوتوں کی نئی درجہ بندی، اردو املا اور لسانیات، اردو کے افعالِ مرکبہ پر ایک نظر، ہمزہ کیوں؟ اردو رسم الخط کا تہذیبی اور لسانیاتی مطالعہ وغیرہ۔ لیکن اس ضمن میں انھوں نے 'املا نامہ' (1974) اور (1990) کی شکل میں اردو املا سازی اور اصلاحِ زبان سے متعلق جو سفارشات پیش کیں، اس نے اردو زبان کو سہل بنانے اور جدید سائنٹفک شکل عطا کرنے میں کافی اہم کردار ادا کیا۔ اس کتاب کو گوپی چند نارنگ نے ترقیِ اردو بورڈ کی املا کمیٹی کی سفارشات کی روشنی میں ترتیب دیا اور عبدالستار صدیقی و رشید حسن خان کی متعدد انتہا پسندانہ اصلاحات سے اختلاف کیا اور عام چلن کی پیروی کی۔ اس کے مطالعے سے احساس ہوتا ہے کہ اسے ترتیب دینے میں انھوں نے لسانی آگہی اور تحقیقی شعور سے کام لیا ہے۔ اس کا پہلا حصہ جو مقدمے پر مبنی ہے اس میں نارنگ نے اردو املا کی معیار بندی میں مستشرقین سے لے کر عہد حاضر کے مصنفین کی کوششوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ دوسرے حصے میں املا کے مسائل اور اس کی بے اعتدالیوں کا ذکر ہے جبکہ اس کے تیسرے حصے میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ املا سازی کے وقت

ہمیں صوتیات کے ساتھ ساتھ سماجی لسانیات سے ضرور مدد لینی چاہیے کیوں کہ زبان کی صوتیات اس کی سماجیات سے ہٹ کر کوئی معنی نہیں رکھتی۔ نارنگ نے 'املا نامہ' میں اردو کے مصوتوں کے لیے مکمل اعرابی نظام بھی قائم کیا ہے تاکہ کمپیوٹر کی تکنیکی وضع پر اردو رسم الخط کو بہ آسانی ڈھالا جاسکے۔ علاوہ ازیں بدلتے پس منظر میں اردو میں غنائیت، ہکاریت اور ہمزہ کے مسائل پر بھی تفصیلی بحث کی ہے۔ اس طرح مختصر ہونے کے باوجود یہ کتاب اردو املا سے متعلق کئی اہم نکات اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے اور اس موضوع پر جدید ترین سائنسی نقطہ نظر کو پیش کرتی ہے۔

گوپی چند نارنگ نے اردو کی بولیوں کو بھی اپنی بحث کا موضوع بنایا ہے۔ اس ضمن میں ان کا اہم کام 'دہلوی اردو کی کرخنداری' (1961) ہے۔ انگریزی زبان میں لکھی گئی اس کتاب میں دہلی کی عوامی بولی کرخنداری کے استعمالات اور خصوصیات پر سب سے پہلے منضبط طریقے سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ کرخنداری کی لسانیاتی خوبیوں کو منظرِ عام پر لانے کا کام سب سے پہلے گوپی چند نارنگ نے ہی کیا۔ بعد میں اس بولی کا تجزیاتی و توضیحی مطالعہ پیش کیا۔ ان کا ایک مضمون ہے 'اردوئے دہلی کی کرخنداری بولی'، اس کی ابتدا میں ہی وہ لکھتے ہیں:

''اردو کا آغاز کہیں سے بھی ہوا ہو لیکن اس امر پر سب متفق ہیں کہ اردو نے عوامی زبان کی حیثیت سے دہلی میں پرورش پائی اور یہیں اس کی مقبولیت کو چار چاند لگے۔ شہر دہلی جسے تاریخ کے ہر دور میں مختلف مذہبوں، زبانوں اور تہذیبوں کا سنگم ہونے کا شرف حاصل رہا، اردو زبان کا گہوارہ بنا۔ ملک کے مختلف حصوں اور دور دراز علاقوں میں اردو کی ترویج کا سہرا بھی اہل دہلی ہی کے سر رہا، جہاں یہ ہر دور میں حالات سے مطابقت پیدا کرتی اور پھولتی پھلتی رہی ہے۔ ملک کے دور دراز علاقوں اور مختلف طبقات میں استعمال کے باعث اردو کی بہت سی علاقائی اور طبقاتی شکلیں پیدا ہوگئی ہیں۔ مثلاً معلّی، دہلوی اردو، دکنی اردو اور لکھنوی اردو بیگماتی اردو، کرخنداری اردو وغیرہ۔''

(مضمون: اردو ہماری زبان مشمولہ کتاب اردو زبان و لسانیات، ص 259)

پھر آگے وہ اس کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں:

''کرخنداری پرانی دلی کی گلیوں میں بولی جاتی ہے جس کا انداز روزمرہ کچھ اپنی ہی شان رکھتا ہے۔ کرخنداری اردو صرف کارخانوں میں کام کرنے والوں کی زبان نہیں بلکہ ہاتھ کا کام کرنے والے یا مختلف پیشوں میں مصروف لوگ اکثر و بیشتر اس بولی میں بات کرتے ہیں۔ اسے اگر پرانی دہلی کی عوامی بولی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ نیچے باندھنے والا، سقے، بہشتی، کنجڑے، ٹھٹھیار، سار، لوہار، معمار، بڑھئی، نان بائی، قصائی، دھنیے، رفوگر، گاڑی بان، تیل والے، جھلی والے، جلد ساز، ٹھیلے والے، تانگے والے، رکشا والے، تنبولی، حلوائی، چرا فروش، چوڑی فروش، پرانی دہلی میں سبھی اسے نوازتے ہیں۔ یہ ایک طرح کی سماجی بولی ہے۔ کاریگر اور محنت کش طبقے کی پچھلے دو تین دہوں میں دہلی کی دنیا بدل گئی ہے۔ آبادی کیا سے کیا ہوگئی ہے، لیکن اب بھی فصیل کے اندر کی دہلی کی گلیوں میں جائیے تو کرخنداری کی کھنک سنائی دے گی۔'' (ایضاً ص 263)

گوپی چند نارنگ نے ہندی اردو کے لسانی اشتراک پر بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ان کی نظر میں ساخت اور قواعد کے بنیادی اصولوں کے مدِ نظر ہندی اور اردو دونوں کی بنیاد ایک ہی ہے لیکن بعد میں یہ دو مستقل زبانیں ہو گئیں۔ ان کے مطابق اردو کے لگ بھگ تین چوتھائی الفاظ ہندی الاصل ہیں۔ اس لحاظ سے جتنا گہرا رشتہ ان دونوں زبانوں کے بیچ ہے شاید دنیا کی کسی دوسری زبان میں نہیں۔

نارنگ نے اس بولی کی حد بندی کرنے کے ساتھ ساتھ جدید ترین اصولوں کی مدد سے ان کی صوتیات، لفظیات، تراکیب اور اظہارات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ کتاب کے آخر میں اردو کی قدیم کتابوں میں اس کی بنیاد کی تلاش کی ہے تاکہ اس کی قدامت کا اندازہ لگایا جاسکے۔ خصوصاً 'غرائب اللغات' (عبدالواسع ہانسوی) اور 'باغ و بہار' (میر امن) جیسی کتابوں میں اس کی خوبیاں تلاش کرکے وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ کرخنداری ان بولیوں میں سے ہے جن کے اثرات اردو کی تہ میں کارفرما ہیں اور جن کے درمیان ناقابل شکست رشتے ہیں۔ اردو کی بقا اور مضبوطی کے لیے ضروری ہے کہ ان کے رشتے کی اہمیت کو سمجھا جائے۔ نارنگ کی یہ کتاب اپنے آپ میں ایک اجتہادی حیثیت رکھتی ہے اور تحریک کی بھی۔

گوپی چند نارنگ نے لسانیات کے مختلف شعبے کو موضوع بنا کر کئی اہم مقالات پیش کیے، ان میں ایک اہم مقالہ ''اردو زبان کے مطالعے میں لسانیات کی اہمیت'' ہے۔ یہ مضمون جدید ترین لسانیاتی نقطۂ نظر سے آراستہ ہے۔ اس مقالے میں مندرجہ ذیل چار اہم نکات سے بحث کی گئی ہے:

(1) زبان آوازوں کا مجموعہ ہے (2) زبان بنیادی طور پر بول چال کے لیے ہے، تحریر ثانوی چیز ہے (3) زبان تغیر پذیر ہے (4) زبان ایک نظام رکھتی ہے۔

زبان کے مذکورہ نظریاتی اصولوں سے بحث کرنے کے بعد نارنگ نے اردو زبان کی آوازوں اور علامتوں کو بحث کا موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے اس بات پر خاص توجہ دی ہے کہ اردو میں مصوتوں کی تعداد زیادہ ہے اور علامتیں کم، برعکس اس کے مصوتوں کی آوازیں کم ہیں اور علامتیں زیادہ۔ ان کی نظر میں یہ چیزیں عربی اور فارسی کی وراثت ہیں۔ آگے اس مضمون میں انھوں نے اردو قواعد کے سلسلے میں نوام چامسکی کی تشکیلی قواعد (Transformational Grammer) کی وکالت کی ہے تاکہ اردو قواعد کو جدید تر بنایا جاسکے۔

گوپی چند نارنگ نے ہندی اردو کے لسانی اشتراک پر بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ ان کی نظر میں ساخت اور قواعد کے بنیادی اصولوں کے مدِ نظر ہندی اور اردو دونوں کی بنیاد ایک ہی ہے لیکن بعد میں یہ دو مستقل زبانیں ہوگئیں۔ ان کے مطابق اردو کے لگ بھگ تین چوتھائی الفاظ ہندی الاصل ہیں۔ اس لحاظ سے جتنا گہرا رشتہ ان دونوں زبانوں کے بیچ ہے شاید دنیا کی کسی دوسری زبان میں نہیں۔ اس کی وضاحت کے لیے انھوں نے صوتیاتی، صرفی، نحوی اور ساختیاتی تمام سطحوں پر اس کی جانچ کی ہے اور آخر میں اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ایسے سیکڑوں الفاظ کے علاوہ جن سے گنگا جمنی تہذیب کی خوشبو آتی ہے، ان دونوں کے ضمائر، امدادی افعال، حرفِ جار، گنتیاں، اوقاتِ صبح و شام، رشتہ داریاں وغیرہ سب نوے فیصد ایک ہیں۔ اپنی اس بحث کو انھوں نے اپنے مضامین 'اردو اور ہندی کا لسانی اشتراک' اور 'اردو اور ہندی کا رشتہ' میں سمیٹا ہے۔ وہ 'اردو اور ہندی کا لسانی اشتراک' میں لکھتے ہیں:

''جتنا گہرا رشتہ اردو اور ہندی میں ہے، شاید دنیا کی کسی دو زبانوں میں نہیں۔ دونوں کی بنیاد اور ڈول اور کینڈا بالکل ایک ہیں۔ یہاں تک کہ کئی بار دونوں زبانوں کو ایک سمجھ لیا جاتا ہے۔ دونوں ایک ہی سرچشمے سے پیدا ہوئیں، جس کے بعد دونوں کا ارتقا الگ الگ سمتوں میں ہوا اور دو اہم لسانی اور ادبی روایتیں وجود میں آگئیں۔ اگرچہ ہندی اپنا فیضان سنسکرت سے اور اردو پراکرتوں کے علاوہ عربی اور فارسی سے حاصل کرتی ہے جس کی وجہ سے لفظیات میں خاصا فرق ہے، تاہم نسبتی اعتبار سے سگی بہنیں ہونے کی وجہ سے دونوں میں گہرا

لسانی اشتراک پایا جاتا ہے۔'' (ایضاً،ص 78)

گوپی چند نارنگ نے اپنے مضمون 'اردو، ہماری اردو' میں بھی اگر چہ اردو ہندی کے اشتراک کو ہی موضوع بنایا ہے لیکن اس مضمون کا وہ حصہ زیادہ اہم ہے جس میں اردو زبان کی اہمیت و افادیت سے بحث کرتے ہوئے ہندوستانی تہذیب وکلچر سے اس کی گہری وابستگی کی بات کی گئی ہے۔ اس مضمون کی ابتدا میں ہی وہ لکھتے ہیں:

''اپنی زبان کس کو پیاری نہیں لگتی۔ اس بارے میں طرف داری برحق، لیکن سخن فہمی بھی ضروری ہے۔ اردو کی زلف گرہ گیر کے ہم سب اسیر ہیں۔ اردو کے حسن وخوبی کا تذکرہ کون نہیں کرتا۔ اس کے لطف واثر اور شیرینی اور دل نشینی کی کشش کون محسوس نہیں کرتا۔ کون نہیں جانتا کہ اردو ہندوستان کی بلکہ اس برصغیر کی یا جنوبی ایشیا کی ایسی زبان ہے جس میں اخذ وقبول کا حیرت انگیز ملکہ ہے۔ اور جس کا دامن طرح طرح کے پھولوں سے بھرا ہے۔ اور جس کی جادواثری میں ''شکوہ ترکمانی، ذہنِ ہندی، نطق اعرابی تینوں کا ہاتھ ہے۔ کون نہیں جانتا کہ اردو نے ہند آریائی کا دودھ پیا ہے اور اسی دھرتی پر پلی بڑھی ہے۔ کون نہیں جانتا جب نئی تاریخی حقیقتیں ابھرتی ہیں تو نئے سماجی تقاضے پیدا ہوتے ہیں اور نئی سچائیاں وجود میں آتی ہیں۔ اردو ایسی ہی ایک سچائی ہے، لسانی، سماجی اور تہذیبی سچائی جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے صدیوں کے سابقے اور اختلاط وارتباط سے وجود میں آئی۔'' (ایضاً،ص 37)

اس مضمون کو انھوں نے مندرجہ ذیل حصّوں میں تقسیم کیا ہے اور اسی کے تحت اپنی باتوں کو پیش کیا ہے:

(1) ہندستانی زبانوں میں اردو ہندی سے سب سے زیادہ قریب ہے۔ ہندی اور اردو میں اٹوٹ رشتہ ہے

(2) اردو نے عربی فارسی عناصر کی تہنید کی ہے اور انھیں ہندوستانی مزاج کی خراد پر اتارا ہے۔

(3) اردو رسم الخط بدیسی نہیں۔ اردو نے اس کو اپنی ضرورتوں کے مطابق ڈھالا ہے۔

(4) گیسوئے اردو ابھی منّت پذیر شانہ ہے۔

اردو رسم الخط کی تاریخی، تہذیبی ولسانیاتی اہمیت پر بھی انھوں نے اپنی تحریروں میں شرح وبسط سے روشنی ڈالی ہے۔ اس تعلق سے ان کے دو مضامین کافی اہم ہیں 'اردو رسم الخط- ایک تاریخی بحث'' اور 'اردو رسم الخط: تہذیبی ولسانیاتی مطالعہ'۔ یہ دونوں مضامین اردو رسم الخط کے تعلق سے کافی اہم اور قابل دید ہیں۔ ان تحریروں میں گوپی چند نارنگ نے واضح طور پر یہ بیان کیا ہے کہ زبان کا رسم الخط سے نہایت گہرا اور اٹوٹ رشتہ ہوتا ہے بلکہ ان کا رشتہ گوشت اور کھال کی مانند ہوتا ہے جسے ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا ہے۔ وہ 'اردو رسم الخط ایک تاریخی بحث' میں لکھتے ہیں:

''یہ کہنا کہ 'لپی اور بھاشا کا ایک ہونا ضروری نہیں ہے'' مناسب نہیں ہے۔ ہر زبان کا اپنا مزاج ہوتا ہے اور اسی کے مطابق اس کا رسم الخط رائج ہو جاتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو رسم الخط میں کبھی تبدیلیاں رونما نہ ہوتیں اور وہی رسم الخط جو ویدوں کے زمانے میں تھا آج تک جاری رہتا۔ کھر وشٹی سے دیوناگری تک شمالی ہندوستان کے رسم الخط میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں وہ بادشاہ یا اعلی طبقے کے افراد نے نہیں کیں بلکہ زبانوں کے فطری ارتقا کا ساتھ دینے کے لیے ہوئی ہیں۔ ارتقائی سفر کے دوران زبان کی پرانی آوازوں میں تبدیلیاں ہوتی ہیں اور ہر تاریخی موڑ پر نئی آوازیں داخل ہوتی ہیں۔ رسم الخط آوازوں کو علامتوں کے ذریعے ظاہر کرنے کے کام آتا ہے۔ چنانچہ پُرانی علامتیں منسوخ ہوجاتی ہیں اور نئی آوازوں کے لیے نئی علامتوں کے اختیار کرنے کا عمل جاری رہتا ہے۔ گویا اصل چیز بولی جانے والی زبان ہے۔ رسم الخط جس کا تعلق تحریری زبان سے ہے ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ زبان کی تحریری ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔ یعنی رسم الخط تابع ہے زبان کے۔ اس کے برعکس جو لوگ رسم الخط کی تبدیلی کا مشورہ دیتے ہیں وہ رسم الخط کو قائم بالذات سمجھتے ہیں جو صریحاً غلط ہے۔ زبان اور رسم الخط میں نہایت گہرا رشتہ ہے۔ زبان کو اگر جسم قرار دیں تو رسم الخط کھال ہے۔ رسم الخط تبدیل کرنے کا مطلب گویا جسم کو نئی کھال میں داخل کرنا اور ظاہر ہے کہ یہ بات کس حد تک قابلِ عمل ہے''۔

(مضمون: اردو رسم الخط، مشمولہ کتاب اردو زبان ولسانیات، ص 110)

گوپی چند نارنگ کی اردو صوتیات پر بھی مضبوط گرفت ہے۔ انھوں نے اپنے کئی مضامین نیز اپنی کتابوں میں بھی اردو صوتیات کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ صوتیات کے ساتھ ساتھ نارنگ نے اس کی معنیاتی خوبیوں کو بھی اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے اور اسے سماجی سیاق کے مدّنظر جانچا اور پرکھا ہے۔ اس ضمن میں ان کا مضمون 'اردو محاوروں اور کہاوتوں کی سماجی توجیہ' کافی اہم ہے۔ اس میں انھوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ لفظوں کے ماخذ طبقاتی یا مذہبی ہوسکتے ہیں لیکن جہاں تک اس کے عام استعمالات کا سوال ہے تو اس کا کوئی مذہب نہیں ہوتا، یہ اپنی لسانی خوبیوں اور جائے استعمال سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان نکتوں کی وضاحت انھوں نے اردو محاوروں اور کہاوتوں کے پیش نظر کی ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ کثرت استعمال سے محاوروں اور کہاوتوں کی مذہبی حیثیت زائل اور لسانی حیثیت باقی رہ جاتی ہے۔ اطلاقی لسانیات میں اسلوبیات پر بھی ان کی اچھی نگاہ ہے۔ نارنگ کا شمار اردو کے گنے چنے ماہرِ اسلوبیات میں ہوتا ہے۔ انھوں نے انیس، اقبال، میر اور ذاکر صاحب کی تحریروں کا کامیاب اسلوبیاتی جائزہ پیش کیا ہے۔ ان کے لسانی تحقیقی کارناموں میں 'کربل کتھا کا لسانی مطالعہ' (1970) اور 'امیر خسرو کا ہندوی کلام' کا ذکر بھی ناگزیر ہے جن میں انھوں نے کربل کتھا اور امیر خسرو کے کلام کو لسانیاتی اصولوں کے مدِّ نظر پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ علاوہ ازیں 'ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات' (1993) پیش کی جس میں لسانیات کے ایک اہم حصے ساختیات کے بنیادی اصولوں سے بحث کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے عملی پہلوؤں پر بھی مفصلاً روشنی ڈالی ہے۔ اس طرح گوپی چند نارنگ نے اردو لسانیات کے جدید رجحانات کو آگے بڑھانے میں اہم کارنامے انجام دیے ہیں۔ آخر میں اپنی بات گوپی چند نارنگ کے اس اقتباس پر ہر ختم کرنا چاہوں گی جس میں اُردو سے اُن کی محبت کا برملا اظہار ہوتا ہے۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

''اردو ہندوستان کی انتہائی ترقی یافتہ زبانوں میں سے ہے۔ اگر ایک طرف اس کا دامن سامی اور ایرانی زبانوں سے بندھا ہوا ہے تو دوسری طرف اس کی بنیاد آریائی ہے۔ اس کا رسم الخط ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ مشرق وسطیٰ کے بیسیوں ملکوں میں قدرے اختلاف کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ اردو کے تقریباً ساٹھ ہزار الفاظ میں سے دو تہائی الفاظ یعنی چالیس ہزار الفاظ سنسکرت اور پراکرتوں کے ماخذ سے آئے ہیں۔ جس زبان کی جڑیں اپنے ملک کے لسانی ذخیرے اور اس کی تہذیبی سرزمین میں اتنی گہری ہوں، جس کا دامن اتنا وسیع ہو، جس کے لہجے میں ایک خاص کشش اور کھنک ہو، جس کے انداز میں ایک خاص شگفتگی اور شائستگی ہو، جس کی قومی خدمات ایسی وقیع ہوں اور جس کا ادبی سرمایہ بشمول میر، نظیر، غالب، انیس، اقبال، فراق، فیض اتنا شاندار ہو، وہ زبان کبھی مٹ نہیں سکتی۔ اس زبان پر ہندوستان کا ایسا حق ہے جو کبھی ٹھکرایا نہیں جا سکتا اور اردو کا بھی ہندوستان پر ایسا حق ہے جو ضرور وصول ہونا چاہیے۔''

(اردو کی ہندوستانی بنیاد، مشمولہ اردو زبان ولسانیات، ص 55)

■

Darakhshan Zarren
Associate Professor, Dept of Urdu
Aliah University
Kolkata- 700156 (West Bengal)
Mob.: 9051241778

محمد موسیٰ رضا

لعل بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب

پروفیسر گوپی چند نارنگ مرحوم کے تعلق سے کچھ یادیں، کچھ باتیں

1996 میں دہلی آنے کے کچھ برسوں بعد میری ملاقات پروفیسر گوپی چند نارنگ سے ہوئی۔ اُس وقت سے انھوں نے جو شفقت و محبت مجھ ناچیز کو دی اس کے لیے میں زندگی بھر ان کا احسان مند ہوگیا۔ کچھ رشتے پیار کے رشتے ہوتے ہیں، اس میں لین دین، نفع نقصان نہیں ہوتا۔ جب کسی شخص کے لیے کہا جاتا ہو کہ اللہ نے مجھے فرشتہ ودیعت کیا ہے تو بھلا سوچیے کہ وہ شخص کتنا خوش نصیب ہوگا جیسا میں محسوس کرتا ہوں۔ نارنگ صاحب ہمیشہ مجھے اپنا داہنا ہاتھ کہا کرتے تھے۔ حد سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ بیٹا کہا کرتے تھے۔ میرے بچوں کے وہ دادا جی تھے۔ بچوں کو ہر سال عیدی دیتے اور دیوالی کی مٹھائی بھی بھجواتے تھے۔

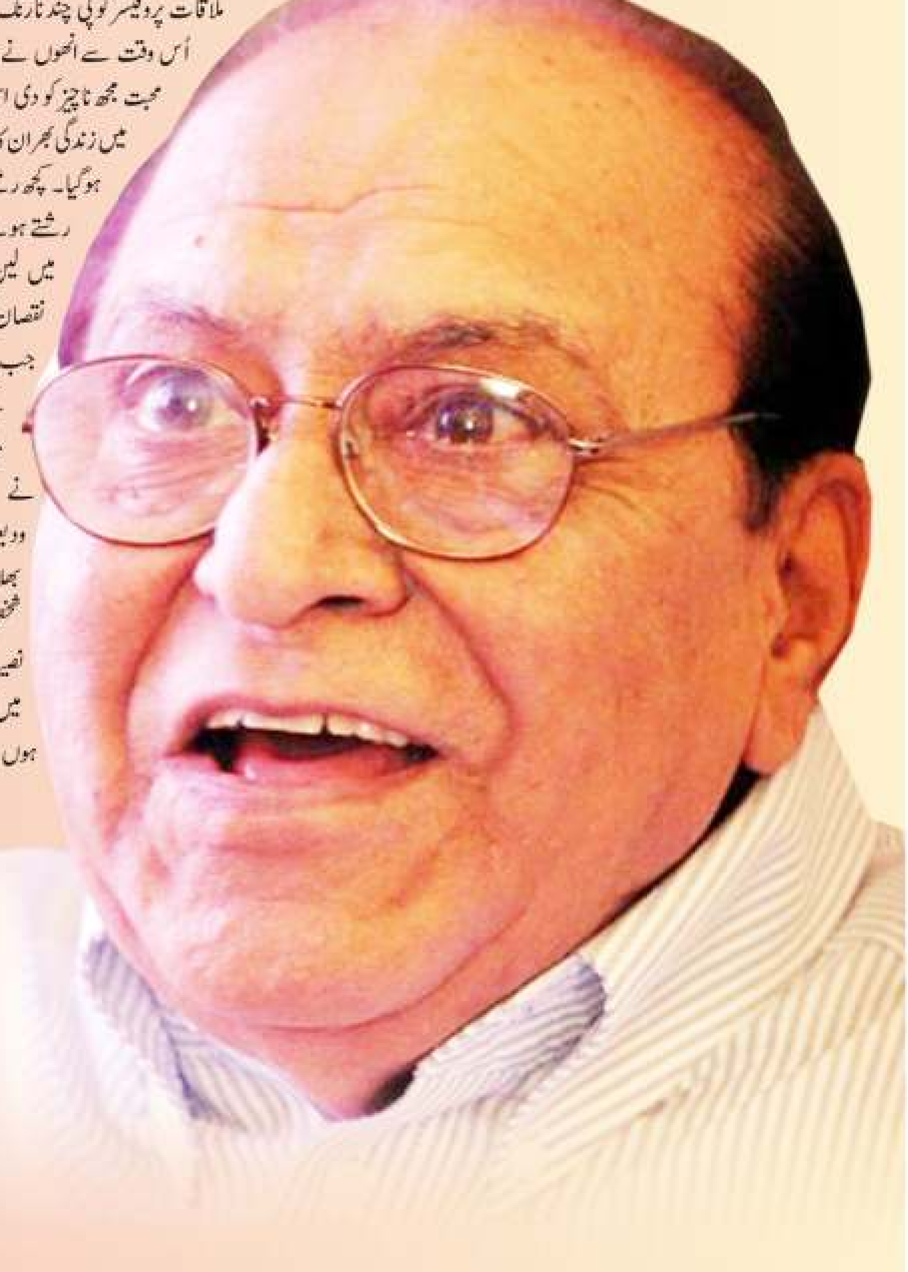

معمولی بیماری کے بعد 15 جون 2022 کو شارلٹ امریکہ میں اُن کا انتقال ہوگیا۔ پچھلے چھ مہینے سے وہ جسمانی طور پر بہت کمزور ہوگئے تھے۔ چند برس پہلے تک معمول سے وہ ہر سال گرمیوں میں امریکہ چلے جایا کرتے تھے لیکن کووڈ اور دوسری وجوہات سے دو برس سے وہ امریکہ نہیں جا پائے تھے۔ جنوری 2022 میں دہلی میں جب اُن کی طبیعت تھوڑی ناساز ہوئی تو مجھے گھر بلایا اور کہنے لگے کہ میں اپنے بیٹے ڈاکٹر ترن نارنگ کے پاس امریکہ جانا چاہتا ہوں۔ وہاں بہتر علاج ہو پائے گا۔ اُن کا سوڈیم لیول کم ہوگیا تھا۔ پھر 28 جنوری کو وہ اپنی شریک حیات مسز منورما نارنگ کے ساتھ امریکہ کے لیے روانہ ہوگئے۔ ان کے چھوٹے بیٹے ڈاکٹر ترن نارنگ انھیں اپنے ساتھ لے گئے۔ امریکہ روانگی سے پہلے میں کئی بار اُن سے ملنے اُن کے گھر گیا۔ اُن کو کووڈ کا تینوں ڈوز (بوسٹر ڈوز سمیت) میں خود اپنے ساتھ لے جا کر اسپتال سے لگوا لایا تھا۔ میرے ڈرائیونگ سیکھنے سے اور اس کے بعد ایک چھوٹی سی گاڑی لینے سے وہ کافی خوش تھے کہ اب میں بآسانی اُن کے پاس پہنچ سکتا تھا۔ جانے سے پہلے اُنھوں نے مجھے دو بیش قیمتی گفٹ عنایت کیے۔ ایک تو اُن کا وہ چیک پرنٹ کا کوٹ جس میں اُن کی تصویر سب سے زیادہ شائع ہوئی ہے، اور دوسرا ایک بریف کیس جسے وہ ساہتیہ اکادمی کی صدارت کے زمانے میں روز اپنے ساتھ آفس لاتے تھے۔ انھوں نے ہدایت کی کہ اسے سنبھال کر میری نشانی کے طور پر رکھنا۔ میرے لیے ان دونوں چیزوں کی قدر و قیمت حد سے زیادہ ہے۔

رہنے کو سدا دہر میں آتا نہیں کوئی
تم جیسے گئے ایسے بھی جاتا نہیں کوئی

(کیفی اعظمی)

پروفیسر گوپی چند نارنگ صاحب کو شاید یہ احساس ہوگیا تھا کہ ان کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ ویسے تو وہ کئی برسوں سے کہا کرتے تھے کہ میں نے اپنا رخت سفر باندھ لیا ہے بس گاڑی آنے کا انتظار کر رہا ہوں۔ لیکن پچھلے ایک سال سے ہر بات پر ان کا یہ کہنا کہ میں نہیں رہوں تب بھی آپ کو یہ کام (کچھ کاموں کی طرف نشاندہی کرتے ہوئے) کرنا ہے، مجھے بہت پریشان کر دیتا تھا۔ وہ شخص میرے لیے سب کچھ تھا۔ انھوں نے میری تربیت

کی ہے، مجھے کام کرنا سکھایا۔ ساہتیہ اکادمی کے ان کی صدارت کے دنوں میں میرا زیادہ تر وقت ان کے آفس میں گزرتا۔ کئی بار جب وہ ڈکٹیشن دیتے تو کافی دیر تک آنکھیں بند کر لیتے۔ مجھے لگتا کہ کہیں ان کو نیند تو نہیں آ گئی، پھر میں کوئی ہلکی آواز کرتا۔ وہ آنکھیں کھولتے، پھر بند کر لیتے اور اس کے بعد کئی کئی صفحات لکھواتے رہتے۔

نارنگ صاحب نے لگ بھگ 92 سال کی عمر پائی۔ صحت بھی ان کی کبھی خراب نہیں رہی۔ ان کی صبح آٹھ بجے ہوتی تھی لیکن دس بجے سے دو بجے تک، پھر دو تین گھنٹے کا آرام، اس کے بعد رات کے دو بجے تک وہ معمول سے پڑھتے لکھتے رہتے تھے۔ اپنی تحریر کو پختہ بنانے کے لیے وہ کئی بار اسے پڑھتے اور ٹھیک کرتے۔ انھوں نے بتایا تھا کہ 'غالب: جدلیاتی وضع، شونیتا اور شعریات' والی کتاب کو انھوں نے بارہ سال میں مکمل کیا ہے۔ جب یہ کتاب تیار ہو گئی تو اس پر نظر ڈالنے کے لیے انھوں نے اسے پروفیسر شریف حسین قاسمی صاحب اور پروفیسر محمد ذاکر کو بھیجا۔ ساتھ ہی شونیتا اور سنسکرت شعریات سے متعلق تحریر کی سند کے لیے پروفیسر کپل کپور سے گفت و شنید کی۔

نارنگ صاحب بتاتے تھے کہ ان کی تربیت پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے کی۔ وہ انھیں حددرجہ عزیز رکھتے تھے۔ ان دونوں کے رشتے کا اندازہ لگانا ہو تو ان کے خطوط کا مجموعہ 'خواجہ احمد فاروقی کے خطوط گوپی چند نارنگ کے نام' جسے خدابخش لائبریری، پٹنہ نے شائع کیا ہے، کا مطالعہ کیجیے۔ نارنگ صاحب نے کبھی کسی خط کو ضائع نہیں کیا۔

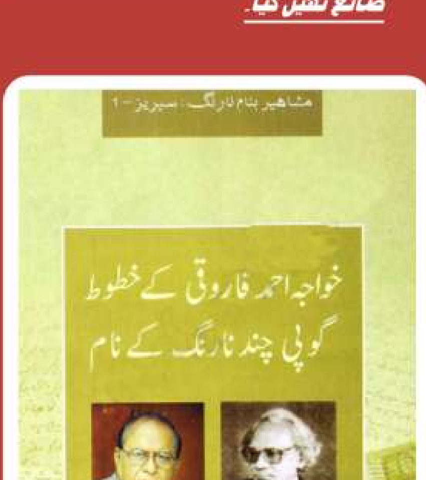

نارنگ صاحب بتاتے تھے کہ ان کی تربیت پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے کی۔ وہ انھیں حددرجہ عزیز رکھتے تھے۔ ان دونوں کے رشتے کا اندازہ لگانا ہو تو ان کے خطوط کا مجموعہ 'خواجہ احمد فاروقی کے خطوط گوپی چند نارنگ کے نام' جسے خدابخش لائبریری، پٹنہ نے شائع کیا ہے، کا مطالعہ کیجیے۔ نارنگ صاحب نے کبھی کسی خط کو ضائع نہیں کیا۔ انھوں نے چند سال پہلے ان خطوط کی گٹھری کو سید تنویر حسین صاحب کے حوالے کیا جو ان دنوں ان کے ساتھ کام کیا کرتے تھے۔ تنویر صاحب نے ان کو حروف تہجی اور تاریخ کے اعتبار سے فولڈر بنا بنا کر رکھا۔ بعد میں دستیاب کچھ خطوط کی ترتیب سازی ڈاکٹر نوشاد منظر نے بھی کی۔ وہ ان خطوط کی کمپوزنگ مجھ سے کرانا چاہتے تھے لیکن وقت کی کمی کے سبب کمپوزنگ کی ذمے داری محمد اکرام صاحب کو دی گئی۔ نوک پلک درست کر کے، اس کی فارمیٹنگ اور فائنل سیٹنگ میں نے کی۔ ایک ایک خط کو نارنگ صاحب نے پڑھا اور غلطیاں نشان زد کیں۔

پچھلے بیس پچیس سالوں میں مجھے ان کی خدمت کرنے اور سیکھنے کا جو موقع ملا وہ میری زندگی کا اہم ترین دور تھا۔ ان کی بیسیوں کتابیں میں نے کمپوز کرا کر طباعت کے مرحلے طے کرائے۔ سائنس کے ایک طالب علم کو اردو زبان کی رغبت انھیں کی دین ہے۔ اس کے بعد میں نے کچھ مضامین اور کہانیاں لکھیں اور چار کتابوں کا ترجمہ شائع کیا جس میں شہناز حسین کی آٹو بایوگرافی 'خوبصورت زندگی' اور کپل سبل کی نظموں کا اردو ترجمہ، چندر بھان خیال کی 'لولاک' کا ہندی ترجمہ شامل ہے۔ پچھلے دنوں امیر خسرو پر ان کی اردو کتاب کا میرا ترجمہ وانی پرکاشن نے شائع کیا جسے ہندی حلقوں میں کافی پذیرائی حاصل ہو رہی ہے۔

1995 میں جب میں نے روزگار کی تلاش میں دہلی کا رخ کیا تو گھر سے نکلتے وقت میری ماں نے ایک نصیحت کی تھی کہ اپنا کام ایمانداری سے کرنا اور جب بھی موقع ملے، دوسروں کی مدد کرنا۔ ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ جس کی تم مدد کرنا، اس سے اپنی مدد کی توقع مت کرنا، تمھاری مدد کوئی اور کرے گا جس کو تم جانتے بھی نہیں ہو گے۔ ماں کی یہ باتیں مجھے آج تک یاد ہیں اور دہلی کے میرے شب و روز اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ میرے ساتھ ہمیشہ ایسا ہی ہوا۔ پروفیسر نارنگ صاحب، جن سے ملنے کے بارے میں بھی میں سوچ نہیں سکتا تھا، انھوں نے ہمیشہ میری اتنی مدد اور حوصلہ افزائی کی کہ ان کے جانے کے بعد میں واقعی پھر سے یتیم محسوس کرتا ہوں۔

موت اس کی ہے کرے جس کا زمانہ افسوس
یوں تو دنیا میں سبھی آتے ہیں مرنے کے لیے
(محمود رامپوری)

کملیشور نے پروفیسر نارنگ کی 75 ویں سالگرہ کے موقع پر ایک تقریب میں کہا تھا کہ بھارت کی تخلیقی اور ثقافتی آتما کو زندہ رکھنے کے لیے ہر زبان کو ایک ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی ضرورت ہے۔ اس تقریب میں قرۃ العین حیدر بھی تشریف لائی تھیں جنھیں میں نے پہلی اور آخری مرتبہ دیکھا تھا۔ کملیشور جی کا یہ جملہ تاریخی نوعیت کا حامل ہے۔ پروفیسر نارنگ ہندوستان کی گنگا جمنی روایت کے سچے علمبردار تھے۔ اردو زبان سے متعلق ان کا مطالعہ کافی وسیع تھا۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے بہت پہلے فرما دیا تھا: ''ڈاکٹر نارنگ عہد حاضر کے ان لکھنے والوں میں ہیں جن کا شمار صف اول کے ادیبوں میں ہوتا ہے۔ ادیب اور صف اول کا ادیب ہونا عمر بھر کی ریاضتِ قلم کا حاصل و مطالعہ شغف کا ثمرہ ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ رتبۂ بلند سب کو نہیں، کسی کسی کو میسر آتا ہے۔''

اللہ نے پروفیسر گوپی چند نارنگ کو بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ ان کا مطالعہ بے حد گہرا تھا۔ اردو سے محبت اُن کو ورثے میں نہیں ملی تھی۔ ان کے والد دھرم چند نارنگ بلوچستان ریونیو سروس میں افسرِ خزانہ تھے۔ ان کا خاندان مغربی پنجاب میں لیہ ضلع مظفر گڑھ میں صدیوں سے آباد تھا۔ ان کے دادا شری چمن لال نارنگ زراعت پیشے سے تعلق رکھتے تھے۔ ملک کے بٹوارے کے بعد ان کی والدہ اور بھائی بہن پانی پت ہوتے ہوئے دہلی آ گئے اور ان کے والد 1956 میں ریٹائرمنٹ کے بعد دہلی آئے۔ ان کے والد کا انتقال 1983 میں اور والدہ 1987 میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

11 فروری 1931 کو گوپی چند نارنگ کی پیدائش تحصیل 'دُکی' میں ہوئی۔ اس کے ڈیڑھ سال بعد ان کے والدین وہاں سے موسیٰ خیل آ گئے۔ موسیٰ خیل کے ایک چھوٹے سے اسکول میں انھوں نے اردو کا پہلا قاعدہ مولوی عبدالعزیز صاحب سے پڑھا۔ پروفیسر نارنگ لکھتے ہیں کہ: ''میں تیسری جماعت میں تھا کہ دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی۔ حکومت ہند بلوچستان کے قبائلی علاقوں میں بے دریغ لٹریچر تقسیم کرتی تھی۔ یہ سارا پشتو اور اردو میں ہوا کرتا تھا۔ اردو پڑھنے کا چسکا یہیں سے پڑا۔'' انھوں نے میٹرک کا امتحان مظفر گڑھ سے پاس کیا جس میں اردو لازمی مضمون تھا۔ علم کے شوق نے انھیں دہلی آنے پر مجبور کیا۔ وہ لکھتے ہیں: ''دلی کالج میں داخلے کا شوق مجھے تقسیم سے کچھ پہلے دہلی لے

پروفیسر نارنگ ایک نستعلیق انسان تھے۔ ہر کام کو قرینے سے کرنا ان کا شیوہ تھا۔ صفائی ستھرائی کا خاص خیال رکھتے تھے۔ انھوں نے ساہتیہ اکادمی کی صدارت کے دوران جو کتاب گھر، صدر کا کمرہ اور آڈیٹوریم کی تعمیر کرائی وہ مثالی نوعیت کا حامل ہے۔ عمر کے آخری پڑاؤ پر انھوں نے D-252 والے گھر کی بھی ازسرنو تعمیر کرائی۔ اس عمر میں گھر بنوانا آسان نہیں ہوتا۔ لیکن نارنگ صاحب نے ایک ایک چیز کا خیال رکھتے ہوئے تنکے تنکے کو قرینے سے سجاکر عالیشان گھر بنوایا جو اب ان کے بغیر ایک طرح سے ویران ہوگیا ہے۔

آیا۔ اجمل خاں روڈ قرول باغ میں دور کے رشتے دار تھے، انھیں کے یہاں آکر ٹھہرا۔ مالی امداد کی چونکہ کوئی صورت نہ تھی، روزگار کے لیے ملازمت کرنا پڑی۔ ایف اے، بی اے میں نے نہایت صبرآزما حالات میں مکمل کیا۔ اور یوں دلّی کالج تک پہنچنے میں مجھے چھ سات برس لگ گئے۔''

پروفیسر نارنگ نے 'بقلم خود' میں ایک جگہ لکھا ہے کہ ''دہلی آنے کے کچھ مدت بعد آزادی کا آفتاب نکلا اور میں اور میرے گھر والے ایک دوسرے کے لیے اندھیرے میں آگئے۔ برسوں پریشانی میں گزرے۔ تین چار سال کے بعد گھر والوں سے ملاقات ہوئی اور زندگی پھر ایک توازن کے ساتھ شروع ہوئی۔'' انھوں نے 1953 میں دہلی کالج میں ایم اے میں داخلہ لیا۔ 1958 میں 'اردو شاعری کے ثقافتی مطالعے' کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کا کام مکمل کیا۔

پروفیسر نارنگ کی دو شادیاں ہوئیں۔ پہلی بیگم کا نام شریمتی تارا نارنگ ہے اور ان کی دوسری بیگم شریمتی منورما نارنگ ہیں۔ وسکانسن سے لوٹنے کے بعد تارا جی سے طلاق ہوگیا جو اپنے بیٹے ڈاکٹر ارون نارنگ کے ساتھ ٹورنٹو میں رہنے لگیں۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ پروفیسر نارنگ 15 جون 2022 کو دارفانی سے کوچ کیے اور تارا جی ایک ہفتہ کے بعد ہی سورگ سدھار گئیں۔ ان کی بیگم مسز منورما نارنگ جی نے ہمیشہ سچے ہمراہی کا فرض نبھایا۔ منورما جی کا گھریلو نام بھولی ہے اور وہ واقعی بھولی ہیں۔ نہایت نیک دل اور خوش مزاج خاتون۔ سبھی سے محبت کرنے والی۔ بتاتی ہیں کہ جب نارنگ صاحب جامعہ ملیہ اسلامیہ میں تھے تو فون پر اطلاع دے دیتے تھے کہ آج ان کے ساتھ بیس مہمان گھر آرہے ہیں۔ منورما جی سب کے لیے کھانا تیار کرتیں اور دل کھول کر مہمان نوازی کرتیں۔ ان کا معمول رہا کہ جب تک نارنگ صاحب اپنے مطالعے میں مشغول رہتے، وہ دوسرے کمرے میں کوئی کتاب اٹھا کر پڑھتی رہتیں جب تک کہ وہ آرام کرنے کے لیے کتابیں بند نہ کردیتے۔ وہ خود بھی دہلی یونیورسٹی میں استاد رہی ہیں۔

جامعہ میں اپنی تقرری کے دوران پروفیسر نارنگ نے عالمی سطح کے کئی تاریخی سیمینار منعقد کرائے۔ انتظار حسین سے ان کے خاص مراسم تھے۔ ساہتیہ اکادمی کی صدارت کے دوران انھوں نے انتظار حسین صاحب کو پہلا 'پریم چند فیلوشپ' دلوانے میں اہم رول ادا کیا جس کے تحت ان کو پندرہ سے زائد دنوں کے لیے ہندوستان آنے کی دعوت دی گئی اور ملک کے مختلف شہروں میں ان کے پروگرام عمل میں آئے۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ میں بہت سی خوبیاں تھیں جس کا زمانہ قائل تھا۔ وہ ایک ایسے مقرر تھے جس کو سننے کے لیے مجمعے میں پن ڈراپ سائلنس ہوجاتا۔ ایک ایک لفظ نپا تلا سیدھے دل میں اترنے والا۔ جب وہ محوِ گفتگو ہوتے تو الفاظ اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے۔ ایک مرتبہ ایک پاکستانی ادیب نے ان سے شکایت کی کہ جب وہ پاکستان آتے ہیں تو ہماری اردو خراب کرجاتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ جس طرح معیاری اردو وہ بولتے ہیں اس سے ان کی اردو کوتاہ قد ثابت ہوتی ہے۔ انھیں آدھا مسلمان بھی کہا گیا۔ ان کی کئی کتابیں قرآنی آیات سے شروع ہوتی ہیں۔ اپنی تحریروں کے درمیان بھی وہ اسلامی روایات کا ذکر کرنا نہیں بھولتے۔ وہ حضرت علیؓ کی کئی باتوں کا حوالہ پیش کرتے اور اپنی دلیل کو قائم کرتے۔ انتقال سے قبل انھوں نے مجھے قرآن مجید کا وہ نسخہ بھی عنایت کیا جسے تاج کمپنی نے شائع کیا ہے جو انھیں کسی پاکستانی دوست نے تحفہ پیش کیا تھا۔

پروفیسر نارنگ ایک نستعلیق انسان تھے۔ ہر کام کو قرینے سے کرنا ان کا شیوہ تھا۔ صفائی ستھرائی کا خاص خیال رکھتے تھے۔ انھوں نے ساہتیہ اکادمی کی صدارت کے دوران جو کتاب گھر، صدر کا کمرہ اور آڈیٹوریم کی تعمیر کرائی وہ مثالی نوعیت کا حامل ہے۔ عمر کے آخری پڑاؤ پر انھوں نے D-252 والے گھر کی بھی ازسرنو تعمیر کرائی۔ اس عمر میں گھر بنوانا آسان نہیں ہوتا۔ لیکن نارنگ صاحب نے ایک ایک چیز کا خیال رکھتے ہوئے تنکے تنکے کو قرینے سے سجا کر عالیشان گھر بنوایا جو اب ان کے بغیر ایک طرح سے ویران ہوگیا ہے۔

جناب شمس الرحمٰن فاروقی اور پروفیسر شمیم حنفی سے ان کے رشتے مد و جزر کا شکار رہے۔ منورما جی بتاتی ہیں کہ اسّی کی دہائی میں فاروقی صاحب برابر نارنگ صاحب کے گھر آیا کرتے تھے۔ ان کی دوستی مثالی تھی۔ اس کے بعد کچھ ادبی اختلافات نے ان کے بیچ دوری پیدا کردی۔ لیکن میں جن باتوں کا گواہ ہوں ان میں فاروقی صاحب کی بیگم کے انتقال کے بعد نارنگ صاحب کا الہ آباد جاکر فاروقی صاحب سے تعزیت کرنا اور جب نارنگ صاحب ساہتیہ اکادمی کے صدر بنے تو شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کا اکادمی آفس آکر ان کو گلے لگانا یاد ہے۔ گزشتہ سال جب فاروقی صاحب کووڈ کے شکار ہوئے تو روز ان کی خیریت معلوم کرنا نارنگ صاحب کا معمول بن گیا تھا۔ فاروقی صاحب کے انتقال سے انھیں بے حد صدمہ پہنچا تھا۔

پروفیسر نارنگ عالمی مجلس فروغ اردو ادب ایوارڈ دوحہ قطر کے ہندستانی جیوری کے سربراہ تھے۔ انھوں نے پچھلے سال اس ایوارڈ کے لیے شمیم حنفی صاحب کا انتخاب کیا جسے شمیم صاحب نے بصد احترام قبول کیا۔ ریختہ کے ایک پروگرام میں پروفیسر نارنگ صاحب کی تقریر سننے کے لیے شمیم حنفی صاحب کا پہنچنا ان کے رشتوں کے درمیان جمی برف کو پگھلانے میں اہم رول ادا کیا۔

یہ سچ ہے کہ رہنے کو سدا دہر میں آتا نہیں کوئی لیکن اپنی لیباریٹری سے بہت دور (وسکانسن سے روانہ ہوتے وقت انھوں نے پروفیسر ہرگووند کھرانہ، جو ایک ناول نگار انعام یافتہ سائنس داں تھے، کو کہا تھا کہ آپ کی لیباریٹری تو یہاں ہے لیکن میری لیباریٹری ہندوستان میں ہے) ایک انجانے شہر میں بیٹے کی محبت میں اپنی آخری سانسیں لینا بھی اتنا آسان نہیں۔ وہ شخص جس نے عمر بھر ہندوستان سے محبت کی، اردو کی زلف سنواری، بیرون ملک میں ابدی نیند سوگیا۔ ان کی آخری رسومات 17 جون 2022 کو شارلٹ، امریکہ میں ہندو رسم کے مطابق عمل میں آئی۔

پروفیسر نارنگ سے جڑی بہت سی باتیں اور یادیں ذہن میں آرہی ہیں لیکن طوالت سے بچنے کے لیے ثاقب لکھنوی کے اس شعر کے ساتھ میں اپنی تحریر ختم کرتا ہوں۔

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا
ہمیں سوگئے داستاں کہتے کہتے

■

Mohd. Musa Raza
H. No. 488, First Floor
Shalimar Garden Extn. 1
Sahibabad, Ghaziabad, UP
Mob. 9811711535
Email : musa535@gmail.com

محمد اطہر حسین

اکیسویں صدی اور ہمارا نصابِ تعلیم

کئی دہائیاں گذر گئیں جب سے ہمارے نصاب تعلیم کی بنیاد اس بات پر ہے کہ بچوں کو 3Rs کی تعلیم فراہم کی جائے یعنی انھیں پڑھنا، لکھنا، اور ریاضی کی مہارتیں سکھائی جائیں اور ساتھ ہی سماجی علوم اور زبان و ادب کی تعلیم بھی اسکولی سطح پر دی جائے۔ یہ ایک روایتی طریقہ تعلیم ہے جس میں اساتذہ بچوں کو بار بار ایک ہی مواد پڑھاتے ہیں، بچوں کو ایک ہی لفظ یا مضمون بار بار بولنے یا لکھنے کو کہتے ہیں جس سے کمرہ جماعت میں طلبا کے اندر دلچسپی کا فقدان ہوتا ہے اور اکتسابی سرگرمیوں میں طلبا مکمل انہاک کے ساتھ مصروف نہیں ہوتے ہیں۔ یہ نمونہ (ماڈل) استاد مرکوز پر مبنی ہوتا ہے جس میں رٹنے پر زیادہ زور دیا جاتا ہے اور اس میں طلبا کو اپنے علم میں اضافے کے لیے بہت سی چیزوں کو رٹنا پڑتا ہے۔ پھر اساتذہ ٹیسٹ یا کوئز کے ذریعے یونٹ کے اختتام یا سال کی تکمیل پر طلبہ کی اکتسابی سطح اور ان کی معلومات کی جانچ کرتے ہیں۔ دوسری جانب یہ بھی ایک مسلم حقیقت ہے کہ آج درسیات کو تیار کرنے والے تعلیمی مقاصد اور طریقہ تدریس کو فروغ دینے کی اہمیت و افادیت سے واقف ہیں تاکہ جو طلبہ آج اسکول میں ہیں وہ آگے کی تعلیم کے لیے کالج اور یونیورسٹیز میں داخلے لے سکیں اور اپنے مستقبل کو تابناک بنا سکیں۔

دور حاضر میں درسیات کی تیاری سے قبل کچھ اہم نکات کو مدنظر رکھنا انتہائی ضروری ہے:

- کیسے طلبا کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ اکیسویں صدی کی ضروریات کی تکمیل کر سکیں؟
- اکیسویں صدی کے نصاب تعلیم کا معیار کیسا ہونا چاہیے؟
- دور حاضر کے نصاب کا معیار کیسا ہو؟

اگر ہم تھوڑا اپنے ماضی کی طرف جائیں تو آج سے 20-25 سال قبل (یعنی بیسویں صدی کی آخری دہائی) کی صورت حال آج کی صورت حال سے بالکل جدا تھی، اس وقت نہ تو ٹکنالوجی کا اتنا زیادہ فروغ ہوا تھا اور نہ ہی علم نے کسی دھماکے کی شکل اختیار کی تھی۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ یکا یک سب تبدیل ہو گیا اور صورت حال بالکل مختلف ہو گئی۔ علم کا فروغ تیزی سے ہونے لگا۔ آج ہمیں جو معلوم کرنا ہو اس کے لیے ہم کسی سے پوچھتے نہیں بلکہ فوراً موبائل کا سہارا لیتے ہیں اور مطلوبہ معلومات تک انٹرنیٹ کے ذریعے رسائی حاصل کر لیتے ہیں۔ ان امور کے مدنظر آج کے نصاب تعلیم میں درج ذیل امور کو شامل کیا جانا چاہیے:

- اکیسویں صدی سے متعلق مہارتوں اور علوم پر زور دیا جائے۔
- بنیادی مضامین کی فہم کے ساتھ اکیسویں صدی کے بین شعبہ جاتی نظریے کو بھی مدنظر رکھنا چاہیے۔
- علم برائے علم نہیں بلکہ علم برائے فہم پر زور دینا چاہیے۔

طلبہ کو حقیقی دنیا کی معلومات، آلات اور مہارتوں سے لیس کرنا چاہیے۔ جو انھیں اعلیٰ تعلیم، روزگار اور حقیقی زندگی میں کام آسکیں۔

اکیسویں صدی کی مہارتیں کون کون سی ہیں۔

اکیسویں صدی کی مہارتوں میں 12 ایسی صلاحیتوں کو شامل کیا گیا ہے جو حصول علم کے دور میں طلبہ کو ضرور حاصل کر لینی چاہیے۔ وہ مہارتیں درج ذیل ہیں:

تنقیدی سوچ و فکر، تخلیقیت، مشارکتی صلاحیت، معلوماتی خواندگی، میڈیا خواندگی، ٹکنالوجی خواندگی، لچیلا پن، قیادت کی صلاحیت، ترسیلی صلاحیت، اقدامی صلاحیت، پیداواری صلاحیت، سماجی مہارتیں۔

یہ وہ مہارتیں ہیں جو طلبہ کو دور حاضر میں دوسروں کے شانہ بشانہ چلنے کا حوصلہ دیتی ہیں اور دور حاضر میں جو ضروری و اہم مہارتیں ہیں اور جس کی ضرورت آج کے مارکیٹ میں ہے اس سے لیس کرتی ہیں۔ ان میں سے ہر مہارت اپنے آپ میں منفرد ہے لیکن ان میں مجموعی طور پر ایک عام خصوصیت ہے وہ یہ کہ انٹرنیٹ کے اس دور میں وہ تمام ضروری اور لازمی ہیں۔

طلبہ کے اندر اکیسویں صدی کی مہارتوں کو فروغ دینے اور مختلف طریقوں کا اطلاق کرتے ہوئے طلبا کی صلاحیتوں کو فروغ دینے میں اساتذہ کا اہم کردار ہوتا ہے۔ اس لیے اساتذہ کو چاہیے کہ اختراعی حکمت عملی اور جدید اکتسابی ٹکنالوجی کا استعمال کریں اس سے علمی مواد کے ساتھ سماجی و وقوفی مہارتوں کے انضمام میں مدد ملے گی نیز مستقبل کی مہارتوں کو فروغ دینے کے لیے اکتسابی ماحول میں طلبا کی شراکت میں اضافہ ہوگا۔ ایسی مختلف حکمت عملیاں اور طریقے ہیں جن کے ذریعے اکتسابی مواد اور مہارتوں کو فروغ دیا جا سکتا ہے اور ساتھ ہی طلبا کو حقیقی زندگی میں مصروف رکھا جا سکتا ہے۔ وہ حکمت عملیاں اور طریقے اختصار کے ساتھ درج ذیل ہیں۔

مسئلہ مرکوز اکتساب

اس ماڈل کے تحت طلبہ حقیقی دنیا سے متعلق مختلف مسائل پر آپس میں تبادلہ خیال کرتے ہیں اور ان مسائل کا تجزیہ کرتے ہیں۔ اس رسائی کے ذریعے طلبا کو یہ موقع ملتا ہے کہ وہ مسائل کی تفتیش کریں، اس کی وضاحت کریں، افکار و خیالات کی تشکیل کریں، ڈاٹا کا تجزیہ کریں اور مناسب حل پانے کے لیے فیصلہ سازی کریں۔ سابقہ

تحققات سے بھی پتہ چلتا ہے کہ مسائل مرکوز اکتساب سے طلبا کمرہ جماعت میں زیادہ سرگرم انداز میں شریک ہوتے ہیں جس سے ان کے اندر تخلیقی سوچ اور تخلیقی مہارتوں کا فروغ ہوتا ہے جو کہ اکیسویں صدی کی مہارتوں میں اہم ترین مہارت ہے۔ (Joyec et al 2009)

مشارکتی اکتساب

اکیسویں صدی کی مہارتوں کو فروغ دینے کے لیے دوسرا اہم طریقہ مشارکتی اکتساب ہے۔ اس طریقے کے تحت طلبا کو ان کی دلچسپیوں اور صلاحیتوں کی بنیاد پر مختلف گروپوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ یہ ایک نفسیاتی اصول بھی ہے کہ تمام طلبا کی دلچسپیاں، صلاحیتیں، لیاقتیں، فکر و سوچ مہارتیں سب مختلف و متنوع ہوتی ہیں اور یہی تنوع اور اختلاف طلبہ کے اندر تحریک پیدا کرتی ہے کہ وہ تخلیقی کام انجام دیں اور اس طرح ہر فرد ایک نئی فکر کو جنم دیتا ہے جس سے پورے گروپ کو فائدہ ہوتا ہے اور اس طرح مشارکتی اکتساب کے ذریعے سب آگے بڑھتے ہیں اور اپنے علم میں اضافہ کرتے ہیں۔

Thrilling and Fadel کے مطابق مختلف گروپوں میں کام کرنے سے طلبا کے اندر مختلف پہلوؤں سے ترقی ہوتی ہے۔ جیسے ساتھی ممبران کے درمیان جذبہ احترام کا فروغ، مشترکہ عمل کو انجام دینے میں مل کر کام کرنے کا جذبہ، عام مقاصد کے حصول کے لیے آپسی سمجھوتہ کرنا، مشارکتی اکتساب سے طلبہ کی صلاحیت و لیاقت پر مثبت اثرات واقع ہوتے ہیں جیسے ان کے اندر تحریک پیدا کرنا ان کی کارکردگی کو بہتر بنانا اور سماجی رابطے کو فروغ دینا وغیرہ۔

اکیسویں صدی کے اساتذہ کو چاہیے کہ وہ طلبا کو ایسی سرگرمیوں میں مصروف رکھیں جو ان کے اندر مشارکتی اکتساب کو فروغ دے جیسے پروجیکٹ دینا، مسائل حل کرنے میں مصروف کرنا، تحقیق پر مبنی اکتساب میں ان کو لگانا۔ ان سرگرمیوں میں جب طلبہ مفوضہ کاموں کی تکمیل کے لیے ایک ساتھ مل کر کام کرتے ہیں تو اس سے ان کی شراکت داری بڑھتی ہے اور حصولیابی میں اضافہ ہوتا ہے، ساتھ ہی سیکھنے کی تحریک بھی ملتی ہے۔ مزید برآں اکیسویں صدی کے تدریسی ماڈل کے تحت علم کو حقیقی دنیا سے جوڑنا بھی بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اس رسائی میں اساتذہ کمرۂ جماعت کی سرگرمیوں میں طلبہ کی شراکت میں اضافہ کر کے اور علم کو حقیقی دنیا سے جوڑ کر کمرۂ جماعت کے اکتساب کو دلچسپ ترین بنا دیتے ہیں۔ جب حقیقی دنیا سے علم کو جوڑا جاتا ہے تو طلبہ کو مختلف وسائل سے تحقیقی معلومات حاصل ہوتی ہیں جو کہ کمرۂ جماعت اور اسکول سے بالکل باہر کی معلومات ہوتی ہیں جیسے کسی شعبے کے باہر وہ جانکاری فرد کا انٹرویو لینا یا ان کی حقیقی زندگی کے تجربات طلبا کے سامنے ان کے ذریعے ہی پیش کرنا وغیرہ اس رسائی کے تحت طلبا کو نئے علوم اور نئی مہارتوں کو سیکھنے کا موقع ملتا ہے بجائے اس کے کہ وہ ٹیسٹ کی تیاری کے لیے اسباق کو سنیں یا معلومات کو زبانی یاد کریں۔

ٹکنالوجی

ٹکنالوجی ایک طاقتور ہتھیار ہے جو طلبا کو خود سے معلومات و دیگر معلومات تک رسائی کا موقع فراہم کرتا ہے۔ اساتذہ کو چاہیے کہ وہ طلبا کو ایسے مواقع فراہم کریں کہ وہ مختلف مہارتوں کو فروغ دینے کے لیے تحقیق کریں اور معلومات حاصل کریں، جس کے نتیجے میں طلبا کو یہ پتہ چلے گا کہ کسی چیز کو کیسے سیکھیں اور کیسے مختلف ویب سائٹ سے معلومات حاصل کریں۔ انٹرنیٹ کے ذریعے طلبا کو اپنے علوم و مہارت میں وسعت کا موقع ملتا ہے۔ مختلف عناوین جیسے عالمی حدت، قحط سالی، غربت، تنگدستی، صحت سے متعلق مسائل، عالمی آبادی اور دیگر ماحولیاتی و سماجی مسائل سے متعلق اقدار کو سمجھنے کا موقع فراہم ہوتا ہے۔ نیز سماج کو درپیش عالمی مسائل سے واقف ہونے اور ان سے نمٹنے میں معاون ہوتا ہے۔

قومی تعلیمی پالیسی 2020 اور ہمارا اسکولی نصاب تعلیم

ہندوستان کی تاریخ میں ایسا پہلی بار ہوا ہے کہ تعلیمی پالیسی کے تحت پرائمری سے قبل کی 3 سالہ مدت کو بھی اسکولی نظام کا حصہ بنایا گیا ہے۔ یہ مرحلہ جو اب تک آنگن باڑی سے متعلق تھا اور جہاں بچے کی پیدائش سے چھ سال کی عمر تک اس کی نگہداشت کی جاتی تھی اور انھیں ماقبل پرائمری تعلیم سے آراستہ کیا جاتا تھا اس کو بھی اب اسکولی نظام تعلیم کا حصہ بنا دیا گیا۔ اسباب و عوامل اور نتائج کیا ہوں گے یہ تو پالیسی کے مکمل نفاذ کے بعد اس کے جائزے سے پتہ چلے گا لیکن فی الوقت حکومت کا یہ ایک خوش آئند قدم ہے۔

نئی تعلیمی پالیسی 2020 اور ہندوستان کا نصابی خاکہ

نئی تعلیمی پالیسی کے اندر درسیات کے حوالے سے بہت ہی اہم اقدامات کیے گئے ہیں جہاں ایک طرف اس میں قدیم طرز تعلیم یعنی 10+2+3 کے تصور کو برطرف کر کے 5+3+3+4 کی بات کی گئی ہے وہیں دوسری جانب جماعت نہم سے طلبہ کو مضامین منتخب کرنے کی آزادی دینے کی بات کی گئی ہے۔ ساتھ ہی سمسٹر نظام جو اب تک کالج و یونیورسٹی تعلیم کا حصہ تھا اب اسکولی تعلیم میں بھی اس کے نفاذ کے اشارے دیے گئے ہیں۔ اس پالیسی میں طلبہ کو فرسٹ ایڈ اور صحت کی بنیادی تربیت کی بات کی گئی ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا ہے کہ طلبہ کی ذہنی و جسمانی صحت کی بہتری کی جانب خصوصی توجہ دی جائے گی۔ پالیسی کے چوتھے باب میں درسیات کا ذکر آیا ہے جس کے تحت مختلف تعمیری امور کی جانب توجہ دی گئی ہے جیسے طلبہ کی مجموعی نشو و نما، درسیاتی مواد میں تخفیف کر کے تنقیدی فکر کو بڑھانا، تجرباتی اکتساب کی سہولیات پیدا کرنا، طلبہ کے اندر کثیر لسانی صلاحیتوں کو فروغ دینا، ضروری مضامین و مہارتوں اور لیاقتوں کو فروغ دینا، مقامی مواد والے قومی درسی کتب وغیرہ ایسے امور ہیں جن کی جانب اس باب میں توجہ مرکوز کی گئی ہے۔

اس پالیسی میں درسیات کے اندر غیر ملکی زبانوں جیسے جاپانی، ہسپانوی، فرانسیسی وغیرہ کو بھی نصاب میں شامل کرنے کی بات کہی گئی ہے، جو یقیناً طلبا کے لیے علوم کے نئے ابواب کھولے گا اور طلبہ بیک وقت مختلف زبانوں میں مہارت حاصل کر سکیں گے۔ جو نہ صرف ان کو آگے لے جانے میں معاون ہوگا بلکہ اس سے ملکی ترقی کی راہیں بھی ہموار ہوں گی۔

پالیسی کے اندر ضروری مہارتوں (جو 21ویں صدی کے موافق ہوں) کو طلبہ میں فروغ دینے کی بھی بات کہی گئی ہے جن کی ضرورت ایک عرصے سے محسوس کی جارہی تھی۔ ان مہارتوں کے فروغ سے طلبہ نہ صرف خود منحصر ہونے میں کامیاب ہوں گے بلکہ اس سے طلبا کے لیے روزگار کے مواقع بھی ہموار ہوں گے اور اکیسویں صدی کی مہارتیں ان کی ترقی کی راہیں کھولیں گی اور ان کے اندر خود اعتمادی کو فروغ دے گی جو کہ آج کے دور میں سب سے اہم امور میں سے ایک ہے، جس کے بغیر انسان تعلیمی میدان میں پسماندگی کا شکار ہو سکتا ہے۔

نئی تعلیمی پالیسی 2020 کا تنقیدی جائزہ

نئی تعلیمی پالیسی کو خوش آئند قرار دیا جارہا ہے کیونکہ اس میں اکیسویں صدی کے لیے ضروری مہارتوں اور لیاقتوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ تعلیمی پالیسی میں نئے خواب بنے گئے ہیں اور مختلف جہات پر توجہ دی گئی ہے۔

■

Dr. Md Athar Hussain
Asst Professor (Education)
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli
Hyderabad - 500032 (Telangana)
Mob.:9849253580

ہندوستان کا میزائل مین

ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام

جہانگیر احمد

ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام نے خلائی تحقیق اور دفاعی ٹکنالوجی میں ہمارے ملک کی ترقی میں انمول کردار ادا کیا ہے، تاہم وہ نہ صرف ایک نامور سائنسدان تھے بلکہ ایک حساس اور فکر انگیز شاعر بھی تھے، سائنسی ذہانت اور شاعرانہ صلاحیتوں کا یہ سنگم واقعی منفرد ہے، اس کتاب میں شامل نظمیں ڈاکٹر کلام کی ہندوستان اور اس کی کثیر جہتی ثقافت سے گہری محبت کو آشکار کرتی ہیں۔

ابوالفاخر زین العابدین عبدالکلام (15 اکتوبر، 1931، 27 جولائی، 2015) کی پیدائش سابقہ مدراس ریاست کے شہر رامیشورم میں ایک متوسط طبقے کے تامل خاندان میں ہوئی تھی۔ ان کے والد زین العابدین کی نہ تو زیادہ رسمی تعلیم تھی اور نہ ہی وہ صاحب ثروت تھے، لیکن وہ روح کی پاکیزگی اور فطری سخاوت کے دھنی تھے۔ ڈاکٹر کلام اپنے بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹے اور معمولی شکل و شباہت کے تھے۔ وہ اپنے جس آبائی گھر میں رہتے تھے، وہ 18 صدی کے وسط میں بنایا گیا تھا۔ مشہور شیومندر، جس نے رامیشورم کو زائرین کے لیے مقدس شہر بنا دیا ہے، ان کے گھر سے تقریباً 10 منٹ کی دوری پر ہے۔ اس علاقے میں زیادہ تر مسلمانوں کے گھر تھے، لیکن وہاں کچھ ہندو خاندان بھی رہتے تھے جو اپنے مسلمان پڑوسیوں کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی بسر کرتے تھے۔

انھوں نے اپنی ابتدائی تعلیم رامیشورم پنچایت ابتدائی اسکول سے حاصل کی اور پھر راما ناتھا پورم شہر کے شوارٹز ہائی اسکول میں داخلہ لے لیا۔ جب انھوں نے شوارٹز میں اپنی تعلیم مکمل کر لی تو وہ خود اعتمادی سے پر اور کامیابی کے لیے پرعزم ہو چکے تھے۔ 1950 میں انھوں نے انٹرمیڈیٹ کے امتحان کے لیے سینٹ جوزف کالج، ترچی میں داخلہ لیا۔ وہیں انھیں انگریزی ادب سے شغف ہوا اور کلاسیکی ادب پڑھنا شروع کیا۔ یہی وہ وقت تھا جب ان کو فزکس میں بڑی دلچسپی پیدا ہوئی۔ جب انھوں نے سینٹ جوزف کالج میں بی ایس سی میں داخلہ لیا تھا تب وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے کسی اور متبادل سے واقف تھے اور نہ ہی ان کو سائنس کے طالب علم کے لیے دستیاب کیریئر کے مواقع کے بارے میں خاص معلومات تھی۔ فزکس میں بی ایس سی کرنے کے بعد انھیں احساس ہوا کہ فزکس ان کا موضوع نہیں ہے۔ وہ اب اپنے خوابوں کی تعبیر کے لیے انجینئرنگ میں جانا چاہتے تھے۔ اسی لیے انھوں نے مدراس انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی (MIT) میں ایرونائٹکل انجینئرنگ میں داخلہ لے لیا۔

ایک سائنسدان کے طورپر ڈاکٹر کلام کا کیریئر

MIT سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد، عبدالکلام ایک ٹرینی کے طور پر ہندوستان ایرونا ٹکس لمیٹڈ (HAL)، بنگلور سے وابستہ ہو گئے۔ وہاں انھوں نے ایک ٹیم ممبر کے طور پر انجن کی اوور ہالنگ پر کام کیا۔ انھوں نے باضابطہ طور پر 1958 سے ڈیفنس ریسرچ اینڈ ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن (DRDO) میں کام کرنا شروع کیا اور 1963 میں انڈین اسپیس ریسرچ آرگنائزیشن (ISRO) میں شمولیت اختیار کر لی۔ ڈاکٹر کلام نے ہندوستان کی پہلی دیسی سیٹلائٹ لانچ وہیکل (III-SLV) تیار کرنے میں پروجیکٹ ڈائریکٹر کی حیثیت سے اہم کردار ادا کیا جس نے روہنی سٹیلائٹ کو کامیابی کے ساتھ زمین کے مدار میں جولائی 1980 میں داخل کر کے ہندوستان کو خلائی کلب کا ایک خصوصی رکن بنا دیا۔ وہ اسرو کے لانچ وہیکل پروگرام، خاص طور پر پی ایس ایل وی کنفیگریشن کے ارتقا کے روح رواں تھے۔ ISRO میں دو دہائیوں تک کام کرنے

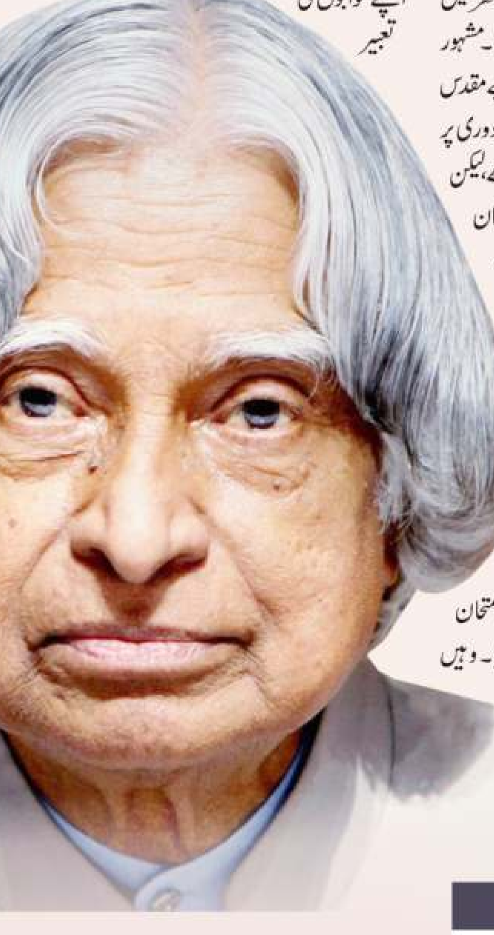

اور لانچ وہیکل ٹکنالوجیوں میں مہارت حاصل کرنے کے بعد، ڈاکٹر کلام نے انٹیگریٹڈ گائیڈڈ میزائل ڈیولپمنٹ پروگرام (IGMDP) کے چیف ایگزیکٹو کے طور پر ڈیفنس ریسرچ اینڈ ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن میں دیسی گائیڈڈ میزائل تیار کرنے کی ذمے داری سنبھالی۔ AGNI اور PRITHVI میزائلوں کی ترقی اور آپریشنلائزیشن اور متعدد اداروں کی نیٹ ورکنگ کے ذریعے اہم ٹکنالوجیوں میں قومی صلاحیت پیدا کرنے کا سہرا بھی انھیں کے سر جاتا ہے۔ وہ جولائی 1992 سے دسمبر 1999 تک وزیر دفاع کے سائنسی مشیر اور دفاعی تحقیق اور ترقی کے محکمہ کے سکریٹری رہے۔ اس عرصے کے دوران انھوں نے ایٹمی توانائی کے محکمہ کے ساتھ مل کر اسٹریٹجک میزائل سسٹم اور پوکھرن- II جوہری تجربات کی قیادت کی جس نے ہندوستان کو ایٹمی ہتھیاروں کا حامل ملک بنا دیا۔ انھوں نے متعدد ترقیاتی کاموں اور مشن پراجیکٹوں جیسے ہلکے جنگی طیاروں کو آگے بڑھا کر دفاعی نظام میں خود انحصاری پر زور دیا۔ اس طرح وہ بیلسٹک میزائل اور لانچ وہیکل ٹکنالوجی کی ترقی میں اپنے غیر معمولی کام کے لیے 'ہندوستان کے میزائل مین' کے طور پر معروف ہوئے۔

ٹکنالوجی انفارمیشن، فورکاسٹنگ اینڈ اسیسمنٹ کونسل (TIFAC) کے چیئرمین کی حیثیت سے اور ایک نامور سائنسدان کے طور پر، انھوں نے 500 ماہرین کی مدد سے ٹکنالوجی وژن 2020 تیار کرنے کے لیے ملک کی قیادت کی جس میں ہندوستان کو ترقی پذیر ملک سے ایک ترقی یافتہ ملک میں تبدیل کرنے کا روڈ میپ دیا گیا تھا۔ ڈاکٹر کلام نے نومبر 1999 سے نومبر 2001 تک حکومت ہند کے پرنسپل سائنٹیفک ایڈوائزر کے طور پر خدمات انجام دی اور کئی ترقیاتی ایپلی کیشنوں کے لیے پالیسیوں، حکمت عملیوں اور مشنوں کو تیار کرنے کی ذمے داری نبھائی۔ ڈاکٹر کلام کابینہ کی سائنٹفک ایڈوائزری کمیٹی (SAC-C) کے چیئرمین، سابق آفیشیو اور انڈیا ملینیم مشن 2020 کے بھی سرخیل تھے۔ ڈاکٹر کلام نے نومبر 2001 سے انا یونیورسٹی، چنئی میں پروفیسر، ٹکنالوجی اور سماجی تبدیلی کی حیثیت سے تعلیمی سرگرمیاں شروع کیں اور تدریسی اور تحقیقی کاموں میں شامل رہے۔

عہدۂ صدارت

ڈاکٹر کلام 25 جولائی 2002 کو ہندوستان کے 11ویں صدر بنے اور 25 جولائی 2007 تک اس عہدہ پر فائز رہے۔

اے پی جے عبدالکلام کی غیر سیاسی شخصیت نے ان کی پہچان 'عوامی صدر' کی بنا دی تھی۔ ہندوستان کے صدر کے اعلیٰ مقام پر فائز ہونے کے باوجود، ڈاکٹر کلام نے ہمیشہ سادگی اور عاجزی کی زندگی گزاری اور اپنے ساتھ کام کرنے والے تمام لوگوں کے ساتھ خلوص و پیار اور گرمجوشی سے پیش آتے رہے۔

صدر جمہوریہ ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام اپنے ہم وطنوں سے مطالبہ کرتے تھے کہ وہ ہندوستان کو ایک 'ترقی یافتہ قوم' میں تبدیل کرنے کے وژن کو عملی جامہ پہنانے کی طرف پوری توجہ دیں۔ 25 جولائی 2002 کو نئی دہلی میں پارلیمنٹ کے سینٹرل ہال میں صدر جمہوریہ کا عہدہ سنبھالنے کے بعد اپنی تقریر میں ڈاکٹر کلام نے کہا تھا، ''اب ہمیں ملک میں ایک تحریک کی ضرورت ہے۔ اس تحریک کے لیے لوگوں کے ذہنوں کو متحرک کرنے کا وقت آگیا ہے۔ ہم اس کے لیے کام کریں گے۔ ہم ایک ترقی یافتہ قوم کے طور پر نہیں ابھر سکتے اگر ہم وقت کی رفتار کے ساتھ چلنا نہیں سیکھیں گے۔''

یوم آزادی 2002 کے موقع پر قوم سے خطاب کرتے ہوئے، صدر جمہوریہ ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام نے کہا تھا، ''آزادی کے بعد، ہندوستان نے زراعت اور خوراک کی پیداوار، توانائی، صحت کی دیکھ بھال، تعلیم اور سائنس و ٹکنالوجی کے مختلف شعبوں میں اہم کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ خاص طور پر ہم نے فارماسیوٹیکل، انفارمیشن ٹکنالوجی، ماس میڈیا اور کمیونیکیشن، اسپیس، دفاع اور نیوکلیئر سائنس کے شعبوں میں بین الاقوامی سطح پر اپنی شناخت بنائی ہے۔'' انھوں نے مزید کہا، ''پہلے وژن کی طرح، جس نے ہمارے لوگوں کو متحد کر کے آزادی کے حصول کے لیے ایک تحریک پیدا کی تھی، ہمیں ایک دوسرے وژن کی ضرورت ہے، جو ہمارے معاشرے کے تمام طبقات کو ایک مشترکہ مقصد کے لیے متحد کرے۔ ہماری قوم کا دوسرا وژن زراعت اور فوڈ پروسیسنگ، تعلیم اور صحت کی دیکھ بھال، بنیادی ڈھانچے کی ترقی بشمول پاور، انفارمیشن اینڈ کمیونیکیشن ٹکنالوجیز اور دیگر اہم ٹکنالوجیوں کے شعبوں میں بیک وقت مربوط کارروائیوں کے ذریعے اسے موجودہ ترقی پذیر ملک سے ایک ترقی یافتہ قوم میں تبدیل کرنا ہے۔ اس عظیم تر وژن کا مقصد غربت، ناخواندگی اور بے روزگاری کو ختم کرنا ہے۔ جب ہمارے ملک کے لوگوں کے اذہان اس وژن کی طرف متحد ہوں گے تو ایک بہت بڑی طاقت ابھرے گی جو ایک ارب لوگوں کی خوشحال زندگی کا باعث بنے گی۔ قوم کا یہ وژن اختلافات اور چھوٹی سوچ سے پیدا ہونے والے تنازعات کو بھی ختم کرے گا۔''

24 جولائی، 2007 کو قوم کے نام شکریے کا خطاب کرتے ہوئے، صدر جمہوریہ ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام نے کہا، ''دہلی کے راشٹرپتی بھون میں اور ہر ریاست اور مرکز کے زیر انتظام علاقوں میں اپنی بات چیت کے دوران اور ساتھ ہی اپنی آن لائن خطاب کے ذریعے، میرے پاس آپ کے ساتھ ساجھا کرنے کے لیے بہت سے منفرد تجربات ہیں جن میں پہلا تجربہ ترقی کی رفتار کو تیز کرنا ہے تاکہ نوجوانوں کی خواہشات کو پورا کر سکیں، دیہات کو بااختیار بنا سکیں اور مسابقت کے لیے دیہی بنیادی اہلیت کو متحرک کر سکیں۔ دوسرا فصل کی پیداوار کے لیے بہتر بیج مہیا کرانا ہے تاکہ زرعی ترقی کو یقینی بنایا جا سکے اور تیسرا ملک کا دفاع ہے۔

ایوارڈ اور اعزازات

ڈاکٹر کلام 30 یونیورسٹیوں اور اداروں سے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری حاصل کرنے کا منفرد اعزاز رکھنے والے ہندوستان کے نامور سائنسداں ہیں۔ انھیں شہری ایوارڈ پدما بھوشن (1981)، پدما وبھوشن (1990) اور اعلیٰ ترین شہری اعزاز بھارت رتن (1997) سے بھی نوازا گیا۔ وہ کئی دوسرے ایوارڈوں کے وصول کنندہ اور کئی پیشہ ورانہ اداروں کے فیلو بھی رہے۔

کتابیں اور شاعری

ان کی ادبی خدمات میں ڈاکٹر کلام کی چار کتابیں "Wings of Fire", "India 2020 - A Vision for the New Millennium", "My journey", "Ignited Minds - Unleashing the power within India" ہندوستانی گھروں اور بیرون ملک ہندوستانی شہریوں میں اپنا اہم مقام بنا چکی ہیں۔ ان کتابوں کا متعدد ہندوستانی زبانوں میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔

Wings of Fire: یہ کتاب ہندوستان کے عام لوگوں کے لیے لکھی گئی ہے جن سے ڈاکٹر کلام کو بے پناہ انسیت اور محبت ہے۔ ان کا عام لوگوں سے جو گہرا رشتہ اور تعلق ہے وہ خود ڈاکٹر کلام کی سادگی اور فطری روحانیت کا مظہر ہے۔ اس کتاب کے ذریعے وہ ہندوستان کے کروڑوں عوام سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ کبھی بھی خود کو چھوٹا یا بے بس محسوس نہ کریں ''ہم سب اپنے اندر ایک الوہی آگ کے ساتھ پیدا ہوئے ہیں۔ ہماری کوشش ہونی چاہیے کہ ہم اس آگ کو ہوا دیں اور دنیا کو اس کی چمک سے بھر دیں۔'' درحقیقت یہ کتاب ڈاکٹر کلام کی زندگی کا مختصر خاکہ پیش کرتی ہے۔

India 2020 - A Vision for the New Millennium: یہ کتاب مضبوطی سے اس خیال کو پیش کرتی ہے کہ ہندوستانی عوام موجودہ غربت سے اوپر اٹھ سکتے ہیں اور اپنی بہتر صحت، تعلیم اور خود اعتمادی کی خوبیوں

سے ملک میں زیادہ پیداواری حصہ ڈال سکتے ہیں۔ ہندوستان کے پاس کافی تکنیکی طاقت آسکتی ہے، جو اس کی اسٹریٹجک، اقتصادی اور تجارتی ترقی کے لیے بہت اہم ہے۔ اس میں ان چند ایکشن پلان کے عناصر کا انکشاف بھی کیا گیا ہے، جو ملک کے بہت سے نوجوانوں کے لیے مشن بن سکتے ہیں۔

Ignited Minds - Unleashing the power within India: قومیں لوگوں سے بنتی ہیں اور ان کی کوششوں سے ایک ملک وہ سب کچھ حاصل کرسکتا ہے جو وہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ہندوستان کے لوگوں اور خاص طور پر یہاں کے نوجوانوں کو تحریک دینا اس کتاب کا مرکزی موضوع ہے، جو ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام کی ابتدائی دو کتابوں، ونگس آف فائر اور انڈیا 2020: اے وژن فار دی نیو ملینیم میں اٹھائے گئے خیالات کے تسلسل کو جاری رکھتی ہے۔ یہ کتاب بالخصوص نوجوان نسلوں کو اپنی طرف مائل کرتی ہے جو ہندوستان کو ایک ترقی یافتہ ملک بنانے میں اہم رول ادا کرسکتے ہیں۔

Envisioning an Empowered Nation: ملک کے تمام حصوں کے طلبا اور نوجوانوں کے ساتھ بات چیت اور انا یونیورسٹی کے انجینئرنگ کے طلبا اور دیگر یونیورسٹیوں، کالجوں اور اسکولوں کے طلبا کو دیے گئے لیکچروں کے نتیجے میں یہ کتاب تیار ہوئی ہے۔ اس لیے یہ کتاب ہندوستان کے نوجوانوں اور طلبہ برادری کو وقف ہے۔

The Life Tree: ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام نے خلائی تحقیق اور دفاعی ٹکنالوجی میں ہمارے ملک کی ترقی میں انمول کردار ادا کیا ہے۔ تاہم وہ نہ صرف ایک نامور سائنسدان تھے بلکہ ایک حساس اور فکر انگیز شاعر بھی تھے۔ سائنسی ذہانت اور شاعرانہ صلاحیتوں کا یہ سنگم واقعی منفرد ہے۔ اس کتاب میں شامل نظمیں ڈاکٹر کلام کی ہندوستان اور اس کی کثیر جہتی ثقافت سے گہری محبت کو آشکار کرتی ہیں۔ معبود حقیقی اور مادر وطن سے ان کی عقیدت کے ساتھ ساتھ ان کی انسان دوستی بھی ان اشعار میں منفرد انداز میں ظاہر ہوئی ہے۔

ڈاکٹر کلام کی دیگر کتابوں میں My Journey, Developments in Fluid Mechanics and Space Technology, The Luminous Sparks, Mission India, Children Ask Kalam, Guiding Souls, Indomitable Spirit, Inspiring Thoughts وغیرہ شامل ہیں۔

خود اعتمادی کی وراثت (Legacy of self-belief): ڈاکٹر کلام مقصد کی وضاحت، اپنے اہداف کو حاصل کرنے کی ایک نادر صلاحیت اور غیر معمولی استقامت کی خصوصیات سے پر تھے۔ وہ کسی بحران سے دوچار ہونے سے کبھی نہیں ڈرتے تھے اور آخری دم تک مسائل کو سمجھنے اور ان کو حل کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔

نوجوان ذہنوں کو متحرک کرنے کا جذبہ (Passion to ignite the young minds): ڈاکٹر کلام کو ہمارے ملک کے لاکھوں نوجوانوں اور طلبا کی تعلیمی اور علمی ترقی کے لیے ایک محرک مانا جاتا ہے۔ بچوں کے متحرک ذہنوں کی طاقت کو آشکار کرنا ان کا خواب تھا۔ وہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ ملک کو 'ترقی پذیر سے ترقی یافتہ' بنانے کے لیے بچوں کی مکمل شمولیت ایک لازمی شرط ہے۔ ان کے خیال میں متحرک ذہنوں کی طاقت کسی بھی دوسری طاقت سے عظیم تر ہے۔ وہ بچوں کو موجودہ سطحوں سے بہت اوپر پہنچنے اور اعلی کامیابی حاصل کرنے کی خواہش سے بھر دینا چاہتے تھے۔ ڈاکٹر کلام نوجوانوں کو اونچے خواب بننے کا مشورہ دیا کرتے تھے کیونکہ خواب، خیالات میں منتقل ہوتے ہیں اور خیالات عمل کے لیے محرک بنتے ہیں۔ راشٹر پتی بھون میں ان کے قیام کے دوران، لوگ ڈاکٹر کلام سے آسانی سے مل سکتے تھے اور ان سے بات چیت کر سکتے تھے۔ وہ بچوں کے خطوط کا جواب انتہائی دلچسپی کے ساتھ دیا کرتے تھے۔

خلائی اور دفاعی شعبوں میں 'آتم نربھر بھارت' کے بنیادگزار (Laying foundations of 'Atma Nirbharta' in space and defence sectors): ڈاکٹر کلام نے ہندوستان کے دفاعی اور خلائی نظام کو خود کفیل بنانے میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ ان کے وژن پر آگے بڑھتے ہوئے، حکومت ہند نے پچھلے کچھ برسوں میں 'میک ان انڈیا' پروگرام کے تحت کئی پالیسی اقدامات کیے ہیں اور ملک میں دیسی ڈیزائن، ترقی اور دفاعی آلات کی تیاری کی حوصلہ افزائی کے لیے اصلاحات کی ہیں۔ ان اقدامات میں دفاعی حصول کے طریقہ کار (Defence Acquisition Procedure-2020) کے تحت گھریلو ذرائع سے سرمائے کی اشیا کی خریداری کو ترجیح دینا؛ صنعت کی قیادت میں ڈیزائن اور ترقی کے لیے 18 بڑے دفاعی پلیٹ فارموں کا اعلان؛ طویل مدت کے لیے صنعتی لائسنسنگ کے عمل کو آسان بنانا؛ براہ راست غیر ملکی سرمایہ کاری (ایف ڈی آئی) کی پالیسی کو آزادانہ بنانا جو خودکار راستے کے تحت 74 فیصد ایف ڈی آئی کی اجازت دیتا ہے؛ دو دفاعی صنعتی راہداریوں کا قیام؛ اسٹارٹ اپس اور مائیکرو، اسمال اینڈ میڈیم انٹرپرائزز (MSMEs) پر مشتمل ڈیفنس ایکسیلنس اسکیم کے لیے اختراعات کا آغاز (iDEX) وغیرہ شامل ہیں۔

زندگی کے تمام شعبوں میں ہندوستان کو مکمل طور پر آتم نربھر بنانے کے لیے، حکومت ہند نے 12.05.2020 کو 'آتم نربھر بھارت ابھیان' کا اعلان کیا تھا اور ملک کو خود کفیل بنانے اور مقامی مینوفیکچرنگ پر توجہ مرکوز کرنے کے مقصد سے 20 لاکھ کروڑ روپے کے ایک خصوصی اقتصادی پیکج کا اعلان کیا تھا۔ یہ ملک کو عالمی سپلائی چین میں سخت مقابلے کے لیے تیار کرنے، کاروبار کرنے میں آسانی پیدا کرنے، MSMEs کو بااختیار بنانے، FDI سمیت سرمایہ کاری کو راغب کرنے اور میک ان انڈیا کی پالیسیوں کو مضبوط بنانے پر توجہ مرکوز کرتا ہے۔ یہ پیکیج کئی طویل مدتی اسکیموں/پروگراموں پر مشتمل ہے جن کا مقصد ملک کو آتم نربھر بنانا ہے۔ ان اسکیموں/پروگراموں کو مختلف وزارتوں/محکموں کے ذریعے نافذ کیا جارہا ہے۔

دفاعی شعبے میں آتم نربھر بھارت کو بڑا فروغ دیتے ہوئے، 3 اکتوبر، 2022 کو ایئر فورس اسٹیشن، جودھپور، راجستھان میں منعقدہ ایک تقریب میں ہندوستانی فضائیہ میں باضابطہ مقامی طور پر تیار کردہ لائٹ کامبیٹ ہیلی کاپٹر (LCH) کو شامل کیا گیا۔ ایل سی ایچ کو 143 ہیلی کاپٹر یونٹ میں شامل کیا گیا اور اس کا نام 'پرچنڈ' رکھا گیا۔ LCH کو ہندوستان ایروناٹکس لمیٹڈ (HAL) نے تیار کیا ہے۔ یہ ایک جدید ترین جنگی ہیلی کاپٹر ہے، جو بنیادی طور پر اونچے علاقوں میں تعیناتی کے لیے ڈیزائن کیا گیا ہے۔ ایل سی ایچ دنیا کا واحد ایسا اٹیک ہیلی کاپٹر ہے جو ہتھیاروں اور ایندھن کے کافی بوجھ کے ساتھ 5000 میٹر کی بلندی پر لینڈ اور ٹیک آف کرسکتا ہے۔

بچوں کے صدر: بچے اے پی جے عبدالکلام کو اپنا آئیڈیل مانتے ہیں اور وہ بھی بچوں کے درمیان وقت گزارنا پسند کرتے تھے۔ ڈاکٹر کلام نے ایک بہتر ہندوستان کی تعمیر کے لیے نوجوانوں کو متحرک کرنے کا نعرہ دیا تھا۔ وہ ایک ماہر سائنسداں تھے اور نوجوان ذہنوں کو سائنس کے اسٹریم میں جانے کی ترغیب دیتے تھے۔ ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام نے ایک بار کہا تھا، 'جب میں اسکول کے بچوں اور نوجوانوں سے بات چیت کرتا ہوں، جہاں بھی جاتا ہوں، ایک سوال اکثر آتا ہے۔ وہ مجھ سے پوچھتے ہیں 'ہمارے رول ماڈل کون ہیں؟' روشن خیال شہریوں کے طور پر زندگی گزارنے کے لیے والدین اور اساتذہ کو بچوں کے لیے مثالی کردار بننا ہوگا۔ بچے مختلف شعبوں میں قومی

سطح پر رول ماڈل تلاش کرتے ہیں۔ ہمارے ملک کی ہر ریاست میں ماضی کی ایسی متعدد ہستیاں موجود ہیں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم موجودہ عہد سے مزید رول ماڈل بنائیں۔

ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام بطور استاذ: ڈاکٹر کلام، اپنی متعدد لافانی کامیابیوں کے باوجود، ہمیشہ ایک استاذ کے طور پر یاد کیا جانا پسند کرتے تھے۔ سوئے اتفاق دیکھیے کہ وہ ایک استاد کے طور پر آئی آئی ایم، شیلانگ میں ایک اجتماع سے خطاب کر رہے تھے کہ انھوں نے 27 جولائی، 2015 کی شام کو آخری سانس لی۔ ڈاکٹر کلام کے الفاظ میں اگر کسی ملک کو بدعنوانی سے پاک اور خوبصورت ذہنوں کا ملک بننا ہے تو تین اہم سماجی ارکان ہیں جو یہ کام کر سکتے ہیں۔ وہ ہیں ماں، باپ اور استاذ۔ ڈاکٹر کلام کے مطابق، استاذ طالب علم کو خود مختار سیکھنے والا بناتا ہے۔ معاشرے اور قومی تعمیر میں استاذ کا اہم کردار ہوتا ہے۔ ڈاکٹر کلام کا خیال تھا کہ حقیقی تعلیم وہ ہے جو انسان کو سوچنے پر مجبور کرے کہ 'میں کیا کر سکتا ہوں' چاہے وہ بچے ہوں، اساتذہ ہوں یا سیاسی قائدین ہوں۔ ان کا خیال تھا کہ اساتذہ کسی بھی ملک کا عظیم اثاثہ ہوتے ہیں اور اساتذہ ہمارے لاکھوں بچوں کی زندگی بدل سکتے ہیں اور معاشرے کو متحرک بنا سکتے ہیں۔

ڈاکٹر کلام کا اکیسویں صدی میں تعلیم کا ماڈل: ڈاکٹر کلام نے ہندوستان کے لیے اکیسویں صدی کا تعلیمی ماڈل بھی تجویز کیا تھا۔ ان کے مطابق ایک اچھا تعلیمی ماڈل نصاب کے اچھے معیار پر مبنی ہونا چاہیے اور پورا تعلیمی نظام صلاحیت سازی کے پروگرام پر مبنی ہونا چاہیے۔ یہ پروگرام مندرجہ ذیل پانچ اجزا پر مشتمل ہے:

- تحقیق اور تفتیش
- تخلیقی صلاحیت اور جدت
- اخلاقی قیادت
- کاروباری فروغ
- سپر ٹکنالوجی استعمال کرنے کی صلاحیت

ڈاکٹر کلام کے مطابق اکیسویں صدی علم اور معلومات کے بہتر انتظام و انصرام کی صدی ہے۔ اس میں ادارے اور اساتذہ، طلبا کو زندگی کا راستہ تلاش کرنے کی سہولت اور ہنر فراہم کرتے ہیں۔ ہمارے آس پاس موجود معلومات کی مقدار بہت زیادہ ہے اس لیے ان کی نیٹ ورکنگ ضروری ہے۔ جب معلومات کی نیٹ ورکنگ ہوتی ہے تو معلومات کی طاقت اور افادیت بڑھ جاتی ہے۔ اکیسویں صدی میں علم کا نظم و نسق ایک فرد کی صلاحیت سے باہر ہے اور اسے فرد کے دائرے سے نکل کر نیٹ ورک گروپس میں منتقل ہونا چاہیے۔ طلبا کو یہ سیکھنا چاہیے کہ علم کو اجتماعی طور پر کیسے منظم کرنا ہے۔ قومی تعلیمی پالیسی 2020 بھی انھیں بنیادی عناصر پر مبنی ہے۔

ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام کی وراثت کو فروغ دینے والی میموریل اور تنظیمیں

اے پی جے عبدالکلام میموریل: ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام کی وراثت کو ہر ہندوستانی کے دل میں زندہ رکھنے کے لیے 30 جولائی، 2016 کو نئی دہلی کے دلی ہاٹ میں کلام میموریل کا افتتاح کیا گیا تھا۔ یہ میموریل ڈاکٹر کلام کے لیے ہماری لازوال محبت کا بین ثبوت ہے۔ ہندوستان کے ہر بچے کے لیے وقف، یہ میموریل سیاحوں، خاص طور پر نوجوان ذہنوں کو متاثر کرتی رہتی ہے۔

ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام میموریل، رامیشورم: 27 جولائی، 2015 کو شیلانگ میں ان کے اچانک انتقال کے بعد، ڈاکٹر کلام کو 30 جولائی، 2015 کو پی کرمبو، رامیشورم میں سپرد خاک کیا گیا۔ تدفین کے مقام پر ایک میموریل تعمیر کی گئی ہے۔ میموریل کے اندر، منتخب تصاویر، پینٹنگ اور میزائلوں کے چھوٹے ماڈل وغیرہ کو دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ میموریل رامیشورم سے محض ایک کلومیٹر کی دوری پر ہے۔

عبدالکلام انٹرنیشنل فاؤنڈیشن (AKIF): ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام انٹرنیشنل فاؤنڈیشن کا آغاز 11 اکتوبر، 2015 کو ہاؤس آف کلام نے ان کی یاد میں کیا تھا۔ یہ فاؤنڈیشن ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام کے نظریات کو آگے بڑھانے کے لیے کام کرتی ہے۔ AKIF کی بنیاد ان کے بڑے بھائی اور خاندان کے لوگوں نے ڈاکٹر عبدالکلام کے ساتھیوں کے تعاون سے رکھی تھی۔ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں، ڈاکٹر کلام اپنے ساتھیوں اور خاندان کے افراد کے ساتھ مل کر ایک ایسی تنظیم قائم کرنے پر غور کر رہے تھے جہاں ان کا وژن حقیقت کا روپ لے سکے۔ زندگی نے ان کو یہ موقع نہیں دیا لیکن ان کے خاندان کے لوگوں اور ساتھیوں نے ان کی اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے انتھک محنت کرنے کا فیصلہ کیا اور اسی کے نتیجے میں AKIF کی بنیاد رکھی گئی۔

عبدالکلام وژن انڈیا موومنٹ: ہاؤس آف کلام نے عبدالکلام کے وژن انڈیا موومنٹ کے آغاز کا بھی اعلان کیا، جو سابق صدر ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام کے وژن کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ایک قومی تحریک ہے۔ اس کا آغاز 4 ستمبر، 2015 کو ہوا تھا۔ اس کا صدر دفتر نئی دہلی میں ہے۔ عبدالکلام وژن انڈیا موومنٹ کا مقصد ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام کے وژن اور مشن کو آگے بڑھانا اور طلبا، نوجوانوں، عوام اور حکومتوں کے ساتھ زمینی سطح پر کام کرنا ہے۔

ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام پرینا استھل: ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام پرینا استھل کا افتتاح 15 اکتوبر، 2021 کو بھارت رتن ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام کی 90 ویں یوم پیدائش کے موقع پر نیول سائنس اینڈ ٹکنالوجی لیبارٹری (NSTL)، وشاکھاپٹنم میں کیا گیا۔ NSTL ڈیفنس ریسرچ اینڈ ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن (ڈی آر ڈی او) کی اہم نیول ریسرچ لیبارٹری ہے۔

اہم کامیابیاں

- ڈاکٹر کلام کی قیادت میں 'اگنی' اور 'پرتھوی' میزائلوں کی کامیابیوں کے بعد ہندوستان ایک بڑی فوجی طاقت بن گیا۔
- انھوں نے ISRO میں دیسی سیٹلائٹ لانچ وہیکل کی ترقی کے لیے پروجیکٹ ڈائریکٹر کے طور پر 10 سال سے زیادہ طویل محنت کی تھی جس کے نتیجہ میں بالآخر ہمارے ملک کو دیسی سیٹلائٹ لانچ وہیکل (SLV) ملا جو ہماری اہم سائنسی ترقیوں میں سے ایک ہے۔
- انھوں نے سوماراجو کے ساتھ ایک کم قیمت والی کورونری اسٹینٹ تیار کیا جس کو 'کلام راجو اسٹینٹ' نام دیا گیا۔
- 1998 میں، پوکھرن-II ٹیسٹوں نے ہندوستان کی جوہری صلاحیت کو مزید مستحکم کیا۔ ڈاکٹر کلام نے اس منصوبے میں اہم کردار ادا کیا۔
- کلام اور سوماراجو کی جوڑی نے 2012 میں دیہی اور کم قابل رسائی علاقوں میں صحت کی دیکھ بھال کے بہتر انتظام کے لیے ایک ٹیبلٹ کمپیوٹر ڈیزائن کیا۔

ڈاکٹر کلام کی بایو پکچر

15 اکتوبر 2021 کو ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام کے 90 ویں یوم پیدائش پر فلمز ڈویژن، وزارت اطلاعات و نشریات نے، ان کی زندگی اور کارناموں پر مبنی ایک بایو پک 'پیپلز پریزیڈنٹ' کی اسٹریمنگ اپنی ویب سائٹ اور یوٹیوب چینل https://www.youtube.com/FilmsDivision پر کی۔ اس کی ہدایت کاری پنکج ویاس نے کی ہے۔ یہ دستاویزی فلم ان کے شاندار کیریئر کے بہت سے اہم سنگ میلوں پر روشنی ڈالتی ہے۔

■

Dr. Jahangeer Ahmad
Researcher, PIB Research Unit
Soochna Bhawan,
CGO Complex
Lodhi Road
New Delhi - 110003

شاہانہ مریم شان

دلّی کالج کی تین صدیاں

(ماضی تا حال)

شہر دہلی جسے ہندوستان کا دل کہا جاتا ہے ہمیشہ ہی علم وادب کا مرکز اور تہذیب وتمدن کا گہوارہ رہا ہے،ہمیں اپنے حال کو بحال کرنے اور مستقبل کو روشن کرنے کے لیے ماضی کے جھروکوں میں جھانکنا ضروری ہے۔یاد ماضی کی پر اسرار حسین گلیوں میں یہ چمن کئی بار اجڑا ہے۔ ہندوستان کی تاریخ میں شہر دلی اور اہل دلی پر بار بار جو مصیبتیں ٹوٹیں اور پھر بار بار یہ شہر اجڑتا اور بستا گیا ایسی مثال کہیں نہیں ملتی ہے۔ بقول شاعر

عصر نو مجھ کو نگاہوں میں چھپا کر رکھ لے
ایک مٹتی ہوئی تہذیب کا سرمایہ ہوں

تہذیب اور تہذیبی اداروں کی جڑیں بھی ماضی کی سرزمین میں پیوست ہوتی ہیں۔ جب تک ہم اپنے ماضی کی جڑوں سے واقف نہ ہوں تب تک ہم اپنے حال اور مستقبل کی صحیح سمت متعین نہیں کر سکتے۔ ہندوستان کا شاید ہی کوئی تعلیمی ادارہ ہو جو کئی بار بند ہونے اور اجڑنے کے باوجود بھی آج تک زندہ وتابندہ ہے وہ ادارہ آج ذاکر حسین دہلی کالج کے نام سے موسوم ہے۔

تعلیمی حیثیت سے یہ پہلا ادارہ ہے جس نے دہلی میں از سر نو تعلیم پھیلانے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ یہ تعلیمی ادارہ ایک خواب نہیں بلکہ ایک تحریک ہے۔ یہ ادارہ ایک تعلیمی اور تہذیبی مقصد کو پورا کرنے کے لیے قائم ہوا تھا۔ یہ ادارہ ہندوستان میں تعلیمی نشاۃ ثانیہ کا نقیب مانا جاتا ہے، اس ادارے کے کارنامے ہندوستان کی تعلیم وتمدن کی تاریخ میں روشن باب ہیں۔شہر دہلی میں خاص کر اس ادارے نے جو تعلیمی سطح پر کارنمایاں کیے ہیں وہ ایک تاریخی دستاویز اور ملک عزیز کا قیمتی ورثہ ہیں۔

مدرسہ غازی الدین ذاکر حسین دہلی کالج کا شاندار ماضی تین صدیوں پر محیط ہے۔ یہ تعلیمی ادارہ ہمارے ملک کا عظیم ورثہ ہے۔ جو ادارہ شروع ہی سے تعلیم ،تہذیب و تمدن کا پروردہ رہا ہو اس شمع کو کون بجھا سکتا ہے۔اس ادارہ نے نا جانے کتنے عظیم سپوتوں کو جنم دیا ہے جس نے اپنی ایک تاریخ رقم کی ہے اور نا جانے کتنے اساتذہ نے اس ادارے کو اپنے خون پسینے سے سینچا ہے اس چمن کی آبیاری کی ہے۔ بقول شاعر

یہ چمن یوں ہی رہے گا اور ہزاروں بلبلیں
اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اڑ جائیں گے

اس ادارے کی بنیاد 1702 میں رکھی گئی تھی اس وقت ملک کے تعلیمی حالات کا نقشہ مذہبی بنیاد پر رائج تھا۔عہد وسطی کے آخر تک ہندوستان میں تعلیم مذاہب کی بندشوں کے تحت ہوا کرتی تھی،مسلمان فارسی اور ہندو سنسکرت کے ذریعے اعلی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اس وقت کے امرا یا اعلی حکام تعلیمی مراکز کی بنیاد ڈالتے ان کی سر پرستی کرتے اس تعلیمی ادارے کا خرچ برداشت کرتے تھے۔ مدرسہ غازی الدین کی بنیاد بھی نواب غازی الدین فیروز جنگ اول صوبہ دار گجرات نے 1702 میں اجمیری گیٹ دلی میں رکھی۔ 1710 میں ان کا انتقال ہو گیا اور اسی مدرسے کے احاطے میں انھیں سپرد خاک کیا گیا اور انہی کی یاد میں اس مدرسے کا نام مدرسہ غازی الدین رکھا گیا۔ 1792-1702 تک کی تاریخ مدرسہ غازی الدین کا ابتدائی دور ہے جو آج بھی اینگلو عربک اسکول کی شکل میں موجود ہے۔

مدرسہ غازی الدین، دلی کالج، اینگلو عربک کالج، ذاکر حسین کالج، اور اب ذاکر حسین دہلی کالج ایک ہی ادارے کے مختلف نام ہیں۔ یہ سبھی نام اس شاندار ادارے کے ارتقائی سفر کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ بس حالات اور وقت کے تقاضے کے تحت اس ادارے نے وقتاً فوقتاً نام اور جگہ بدلے لیکن حال کا ادارہ اور سنہرے مستقبل کا تابناک تعلیمی ادارہ بن کر جگمگاتا رہے گا۔ دلی کالج کی حیثیت ایک تعلیمی ادارے کی ہی نہیں بلکہ زندگی کے تمام شعبوں کو متاثر کرنے والی ایک پر اثر فکری تحریک کی ہے۔

مدرسے کے ابتدائی دور میں ملک کے ابتر حالات اور معاشی تنگدستی کے سبب مدرسہ غازی الدین میں طلبا کی تعداد گھٹنے لگی۔ 1813 میں چارٹر کے مطابق برطانوی ہند میں تعلیم کے فروغ کے لیے ایک لاکھ روپے سالانہ رقم منظور کی گئی۔ 1823 میں مجلس تعلیم عامہ کی جانب سے ایک سرکلر جاری ہوا جس میں یہ بات تجویز کی گئی کہ دہلی میں جدید طرز تعلیم کے لیے ایک کالج قائم کیا جائے۔ آخر کار طے پایا کہ مدرسہ غازی الدین کی عمارت کو اس کام کے لیے استعمال کیا جائے اور دلی کالج وہیں قائم کیا جائے۔ چنانچہ 1825 میں دلی کالج کا افتتاح ہوا۔

1825 سے دلی کالج کے نام سے اس ادارے کے دوسرے دور کا سفر شروع ہوتا ہے۔ جے ایچ ٹیلر کالج کے سکریٹری تھے انھیں باضابطہ طور پر پرنسپل مقرر کیا گیا۔ 1825-27 تک یہ ادارہ مشرقی علوم وفنون کی تعلیم دیتا رہا۔ 1827 میں ریزیڈنٹ کمشنر سر چارلس مٹکاف کے حکم پر انگریزی کا شعبہ قائم ہوا۔ اس شعبے کے قیام کے اثر سے مشرقی شعبہ مفید علوم کی جانب متوجہ ہوا۔ ادارے میں عربی، فارسی، فلسفہ، منطق، سائنس، ریاضی، قانون اور دیگر جدید علوم کی تعلیم ہندوستانی اردو میں دی جاتی تھی۔

1829 میں نواب اعتماد الدولہ اودھ کے نواب نے ایک بڑی رقم اس ادارے کے نام وقف کی تاکہ اس ادارے کی ترقی ہو سکے۔ 1835 سے 1854 کے درمیان ہندوستانی تعلیم کی تاریخ میں ایک اہم موڑ آیا۔ لارڈ ولیم بینٹنگ نے 1835 میں تعلیمی نظام کے تحت کچھ احکام جاری کیے، ان کا حکم تھا کہ سائنس اور مغربی ادب کی تعلیم

انگریزی زبان میں دی جائے،موجودہ تعلیمی اداروں کے وظائف بند کردیے جائیں،مشرقی زبانوں میں کتابوں کی تیاری وترجمے کا کام موقوف کیا جائے۔بینٹنگ کے دست راست لارڈ میکالے نے بھی ان کی تعلیمی پالیسی کے حق میں وکالت کی۔لیکن لارڈ آکلینڈ نے ان کی پالسی کو رد کرتے ہوئے انگریزی طرز تعلیم کے ساتھ ساتھ مدارس میں مشرقی طرز تعلیم کو ترجیح دینے کا حکم دیا اور وظائف بحال کر دیے اور بالآخر اس عظیم ادارے نے انگریزی تعلیم کے ساتھ ساتھ ہندوستانی زبان وادب اور تہذیب و تمدن کو بھی اپنائے رکھا۔انگریزی تعلیم کے ساتھ ساتھ اپنی روایتی طرز تعلیم کوفروغ دیا۔

1835 میں لارڈ میکالے اور 1854 میں ووڈ نے ذریعہ تعلیم انگریزی کے حق میں وکالت کی تھی،لیکن لارڈ آکلینڈ کی تعلیمی پالیسی کے تحت مسٹر جے ایچ ٹیلر کی سرپرستی میں ایک اسکول بک سوسائٹی قائم کی گئی، جس میں ہندوستانی زبانوں میں مختلف کتابیں تیار کرائیں، انھوں نے بہت ہی دیانتداری سے ہندوستانی زبانوں کی خدمت کی۔دہلی کالج کے فروغ میں مسٹر جے ایچ ٹیلر کی کوششوں کا بڑا رول رہا ہے۔1839 میں ایک نئے پرنسپل مسٹر ایف بترو کا تقرر ہوا جو ایک فرانسیسی ماہر تعلیم تھے۔انھوں نے سابق پرنسپل سے بھی زیادہ خدمات انجام دیں۔انھوں نے مسٹر ٹامسن سے مل کر انگریزی اسکولوں کے ساتھ ساتھ اردو اسکولوں کو قائم کروایا۔کالج میں ایک ورنیکلر سوسائٹی قائم کی۔

1842 میں ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی قائم کی گئی، یہ سوسائٹی کبھی دلی کالج ورنیکلر ٹرانسلیشن کہلائی تو کبھی دلی ٹرانسلیشن سوسائٹی کے نام سے مشہور رہی اور کبھی ورنیکلر سوسائٹی کہلائی تو کبھی لائبریری آف یوزفل نالج کے نام سے جانی جانے لگی۔نام تو اس سوسائٹی کے بدلتے رہے یہ نام صرف مصنفین نے اپنی سہولیت کے اعتبار سے رکھے، یہ سارے نام ایک ہی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کے ہی ہیں اور کام تو اس کا تراجم ہی رہا۔جس میں انگریزی اور دیگر زبانوں کی کتابوں کے اردو زبان میں تراجم ہونے لگے۔مغربی ادب اور سائنسی علوم کو اردو میں منتقل کیا جانے لگا۔مغربی فلسفہ وفکر سے لوگ روشناس ہونے لگے۔

ہنگامہ غدر سے قبل تک اس سوسائٹی کے تحت تقریباً 128 کتابیں ترجمے،تصنیف وتالیف کے ذریعے تیار کی گئی تھیں۔دہلی کالج کی یہ خدمات ہر لحاظ سے قابل ستائش ہیں کیونکہ یہاں جن کتابوں کے تراجم ہوئے ہیں ان کا سارا زور علمی وسائنسی کتابوں پر تھا اردو میں اس کی زیادہ ضرورت تھی جبکہ دیکھا جائے تو فورٹ ولیم کالج کے تراجم کا زیادہ تر کام قصے کہانیوں پر مبنی ہے۔اور کہا جائے تو یہ بات صحیح ہے کہ دہلی کالج کے اس ادھورے کام کو بعد میں سرسید احمد خان کی سائنٹفک سوسائٹی نے آگے بڑھایا اور اس کے بعد دکن میں دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ نے اسی طرز پر کام جاری رکھا۔

1845 میں کچھ نامساعد حالات کی وجہ سے کالج کی عمارت کو داراشکوہ لائبریری کی عمارت میں منتقل کیا گیا۔یہ ایک تاریخی عمارت ہے جو کبھی داراشکوہ کا کتب خانہ ہوا کرتا تھا۔

مسٹر ایف بترو کے بعد مشہور مستشرق اسپرنگر نے کالج کی ذمے داری سنبھالی پھر مسٹر کارگل پرنسپل بنے، 1854 کو دوبارہ مسٹر جے ایچ ٹیلر کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے۔1857 کی بغاوت کے وقت جے ایچ ٹیلر ہی کالج کے سربراہ تھے باغیوں نے ان کی جان لے لی۔

1857 ہنگامہ غدر میں اس ادارے کو نقصان پہنچایا گیا۔عوام میں یہ غلط فہمی پھیلائی گئی کہ یہ ادارہ ایک عیسائی مشنری کے تحت اپنے مذہب کی تبلیغ کر رہا ہے اور یہاں پڑھنے والے طلبا و طالبات کو عیسائی بنایا جا رہا ہے۔اس غلط فہمی اور بھرم نے اس ادارے کو کافی نقصان پہنچایا۔اس ہنگامے کے دوران کتب خانے کا کچھ حصہ نذر آتش ہوگیا اور کچھ کتب کو لاہور منتقل کر دیا گیا۔اس وقت کے پرنسپل ٹیلر کی جان لے لی گئی۔ہندوستانی عملہ ان کی حفاظت نہیں کر سکا۔ٹیلر کے قتل کا الزام مولوی محمد باقر کے سر لگا اور انھیں بھی توپ سے باندھ کر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

اس ہنگامے کے بعد کچھ عرصے کے لیے اس ادارے کو بند کر دیا گیا۔تقریباً سات سال بعد 1864 میں دوبارہ از سرنو اس ادارے کا احیا ہوا۔لیکن اسے پنجاب یونیورسٹی لاہور کے ساتھ الحاق کر دیا گیا۔ڈاکٹر لائٹنر جو پنجاب لاہور کالج کے پرنسپل تھے اور پنجاب گورنمنٹ میں بڑا رسوخ رکھتے تھے اور اپنے لاہور کالج کو فروغ دینا چاہتے تھے اور ملک کی اچھی چیزوں کو وہ اپنے قبضے میں لینے لگے اسی میں یہ ادارہ بھی شامل تھا۔اسی منصوبے کے تحت اسے لاہور کالج میں ضم کیا گیا، یہاں کے اساتذہ بھی وہاں منتقل کیے گئے،اور دلی اس ادارے سے دوبارہ محروم ہوگئی۔

1872 میں دلی کے کچھ پڑھے لکھے متمول آزاد خیال لوگوں نے یہ فیصلہ لیا کہ اعتمادالدولہ فنڈ جو دلی کالج فنڈ میں شامل تھا اسے علاحدہ کر کے اس فنڈ کی مدد سے اس ادارے کو از سرنو شروع کیا جائے،اور اسی بات پر عمل کرتے ہوئے دلی میں اینگلو عربک مڈل اسکول کے نام سے اسی ادارے کو دوبارہ کھولا گیا،پرانی عمارت کو چونکہ ہنگامہ غدر کے دوران فوجیوں نے اپنی رہائش بنا رکھا تھا اسی لیے نئی عمارت چاندنی محل موجودہ ٹاؤن ہال میں اس ادارے کی شروعات ہوئی۔اس ادارے کے اخراجات اس فنڈ سے پورے ہوتے رہے۔ماسٹر امیر علی پہلے پرنسپل ہوئے۔ان کے بعد شہاب الدین حسن صاحب پرنسپل بنے۔

1884 میں یہ مڈل اسکول سرکی والان کی حویلی میں منتقل ہوگیا۔اس وقت تک یہ ادارہ مڈل اسکول سے ہائی اسکول کی شکل اختیار کرگیا تھا۔1892 تک یہ ادارہ سرکی والان میں چلتا رہا۔بالآخر 1893 میں دوبارہ اپنی پرانی عمارت اجمیری گیٹ دلی مدرسہ غازی الدین میں منتقل ہو گیا۔1908 میں پرنسپل شہاب الدین ریٹائر ہوئے اور نئے پرنسپل مولوی فضل الدین مقرر ہوئے۔1924 تک یہ ادارہ انٹرمیڈیٹ تک ترقی کر گیا اور اسی سال اس کالج کا الحاق دہلی یونیورسٹی میں ہوگیا اور اب اس کا نام اینگلو عربک کالج کے نام سے جانا جانے لگا۔1927 میں مولوی فضل الدین پرنسپل ریٹائر ہوئے اور سی آر واکر اس کالج کے پرنسپل بنے۔1929 تک یہ کالج ڈگری کالج بن گیا۔1943 میں پوسٹ گریجویشن کی تعلیم شروع ہوئی۔

یہ وہ عہد تھا جب سارے ملک میں جدوجہد آزادی کی تحریک چل رہی تھی۔اس ملک کی آزادی کی لڑائی میں نا جانے کتنی قربانیاں دی گئیں۔بالآخر 1947 میں ملک آزاد تو ہوگیا لیکن ستمبر 1947 میں دوبارہ اس ادارے کو بند کرنا پڑا کیونکہ ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت جس طرح 1857 میں عیسائی مشنری کے نام پر ادارے کو نقصان پہنچایا جا چکا تھا بالکل اس بار بھی اس ادارے کو مسلمانوں کا نمائندہ ادارہ کہہ کر اسے لوٹ لیا گیا۔نوے سال بعد پھر وہی تاریخ دہرائی گئی۔سب کچھ دوبارہ سے اجڑ گیا۔کتب خانہ نذر آتش کردیا گیا۔دلی کے حالات بد سے بدتر ہوگئے۔1925 سے لے کر 1947 تک کی یہ تاریخ نہایت دردناک رہی، دلی کالج اور دلی والوں کے لیے یہ گھڑی قیامت صغریٰ سے کم نہ تھی۔

ملک کے حالات چاہے جیسے بھی رہے ہوں اس ادارے نے زبان ادب تہذیب ریاضی سائنس صحافت کی تعلیم میں نمایاں کارنامے انجام دیے ہیں،مغربی طرز تعلیم کے ساتھ ساتھ مشرقی علوم وفنون کو ساتھ ساتھ لے کر چلتے ہوئے ہندوستانی زبان وادب کی وراثت کو آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کیا۔اسی زمانے میں عظیم شخصیتیں اس ادارے سے وابستہ تھیں۔ماسٹر رامچند رجو ریاضی کے پروفیسر تھے 1845 میں وہ دہلی کالج سے وابستہ ہوئے، اور اپنی غیر معمولی خدمات انجام دیں۔مولانا امام بخش صہبائی، رام کشن، مولوی مملوک العلی، مولوی کریم الدین،

منشی شیونرائن کے علاوہ اور بھی اصحاب ہیں جنھوں نے اپنی زندگی درس وتدریس تصنیف وتالیف کے کاموں میں اس ادارے کے لیے وقف کردی۔

تعلیمی حیثیت سے شہر دہلی کو بار بار بسانے میں دہلی کالج کا بڑا حصہ ہے۔ ملک کے نامی گرامی عظیم رہنماؤں اور اسکالرز کی اس ادارہ سے وابستگی رہی ہے، جنھوں نے قدامت اور توہمات پر جدید نظریہ فکر کو فوقیت دی، آزادیِ رائے کو فروغ دیا، جن میں ہر شخص ایک ادارہ بلکہ ایک جامعہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

مارچ 1948 میں ڈاکٹر ذاکر حسین، مولانا ابوالکلام آزاد اور سر مارس گائر پروفیسر ہمایوں کبیر کی مدد سے دلی کالج کے نام سے اسے دوبارہ شروع کیا گیا۔ مرزا محمود بیگ کو پرنسپل بنایا گیا۔ 1958 میں دلی کالج کے شبینہ اوقات میں بھی کلاسس کی شروعات ہوئی۔ جواب ذاکر حسین پوسٹ گریجویٹ ایوننگ کالج کے نام سے جانا جاتا ہے۔ 27 اگست 1975 میں اس کالج کا نام ذاکر حسین دلی کالج تجویز ہوا، ذاکر حسین کالج میموریل ٹرسٹ قائم ہوا۔ اس ٹرسٹ کے صدر وزیر اعظم ہند اور نائب صدر وزیر تعلیم ہند مقرر ہوئے، اندرا گاندھی اس ٹرسٹ کی پہلی صدر ہوئیں اور اس ادارے کی تاریخی اہمیت کے پیش نظر اس ادارے کا نام ذاکر حسین دہلی کالج قرار پایا۔ پرانی دلی کے علاقہ جواہر لعل نہرو مارگ میں اس کالج کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا اور بالآخر 1986 میں کالج کیمپس کو موجودہ مقام جواہر لعل نہرو مارگ کی نئی عمارت میں منتقل کیا گیا۔

رفتہ رفتہ ملک کے حالات سازگار ہونے لگے اور یہ ادارہ اپنی محنت جستجو لگن سے دن دوگنی رات چوگنی اپنے تعلیمی میدان میں ترقی کے منازل طے کرتا گیا۔ اس طرح ملک کے معیاری تعلیمی اداروں میں اپنی ایک چھاپ بنائی اور آج تک اپنے نام اور معیار کو برقرار رکھے ہوئے سرچشمہ تعلیم ومنبع ہدایت بنا ہوا ہے۔

مختصراً اس کالج کے چند اہم پرنسپل اور اساتذہ اکرام جنھوں نے دل وجان سے اس ادارے کی خدمت کی ہیں ان کے اسمائے گرامی میں ڈاکٹر الواس اشپرانگیر، مسٹر فیلکس بوترو، جے ایچ ٹیلر، مسٹر جے کارگل، پروفیسر مسٹر ہٹینسن، مسٹر ایڈمنڈ ولموٹ، مسٹر ی آر کک، پروفیسر ایلس، جے سائم، مرزا محمود بیگ، منظور حسین موسوی، سید احمد علی، موہت کمار ہلدر، سلمان غنی ہاشمی، ہری شنکر، روی چترویدی، خورشید عالم خان، شیو پرشاد، جاوید وسشٹ، ضمیر حسن دہلوی، سید نیاز احمد، عبادت بریلوی، عظمت اللہ خان، یونس جعفری، افتخار صدیقی، اسلم پرویز، اوشا عالم، بھیشم ساہنی، وریندر کمار، ظہیر احمد صدیقی، تنویر احمد علوی، ایل کول کالیا، افسری افتخار، محمد فیروز احمد، صلاح الدین، مسرور احمد بیگ، عبدالعزیز، خالد علوی، عائشہ سلطانہ، ممتاز مجیب، مظہر احمد، شاہینہ تبسم، محمد جعفر احراری، محمد نوشاد عالم، ظہیر علی خان، نریندر سنگھ، محمد اعلم شمس، پنکج کانت، ہردے بھانو پرتاب جیسے اساتذہ اس چمن کی آبیاری کرنے والے باغباں ہیں طوالت کے پیش نظر سب کے نام یہاں پیش کرنا ممکن نہیں، ابھی اس وقت ذاکر حسین دہلی کالج مارننگ اور ایوننگ میں تقریباً چار سو سے زائد اساتذہ اپنی تدریسی خدمات انجام دے رہیں ہیں۔

کالج کے ابتدائی دور سے دور حاضر تک جو مضامین یہاں پڑھائے جاتے رہے ہیں ان میں اردو، انگریزی، عربی، فارسی، ہندی، سنسکرت، بنگالی، تاریخ، معاشیات، منطق، کیمیا، بناتات، حساب، حیوانیات، طبعیات، اقتصادیات، فلسفہ، موسیقی، سائیکلوجی، سماجیات، کمپیوٹر، ماس کمیونکیشن وغیرہ اہم مضامین ہیں۔ اس ادارے کے شعبوں کی اپنی سوسائٹیاں ہیں جن کے نام شعبہ نباتات کی نرگس سوسائٹی، شعبہ اردو کی بزم ادب سوسائٹی، شعبہ بنگلہ کی بنگال لیٹریری سوسائٹی، شعبہ انگریزی کی انگلش لیٹریری سوسائٹی، شعبہ ہندی کی ہندی ساہتیہ سبھا سوسائٹی، شعبہ فارسی کی انجمن فارسی، شعبہ فلسفہ کی فلاسفی سوسائٹی دی مائیسٹ، شعبہ پولیٹکل سائنس کی عوام سوسائٹی، شعبہ سنسکرت کی سنسکرت لیٹریری سوسائٹی، شعبہ حیوانات کی جیالوجی سوسائٹی ان ہیرٹینس، شعبہ کیمیا کی کیمسٹری کیمیکو کیٹ سوسائٹی اور ان کے علاوہ شبینہ کالج کی سوسائٹیز میں شعبہ عربی کی النادی العربی، اور شعبہ اردو کی بزم ادب جیسی سوسائٹیز موجود ہیں

تمام شعبہ جات اپنے رسائل ہر سال نکالتے ہیں، یہ سلسلہ ملک کی آزادی کے بعد 1953 سے شروع ہوا تھا، کالج نے اپنا پہلا میگزین اردو زبان میں نکالا تھا جس کا نام دلی کالج اردو میگزین تھا جس کے نگراں خواجہ احمد فاروقی اور معاون مدیر گوپی چند نارنگ تھے۔ اس قدیم دلی کالج نمبر میں کالج کی شروعات کی تاریخ سے لے کر 1947 تک کے تاریخی حالات موجود ہیں۔ کالج کی جانب سے میگزین نکالنے کا سلسلہ چلتا تو رہا لیکن کبھی کبھی معاشی تنگدستی کے سبب یہ میگزین نکل نہیں پایا اور بعد میں اس میگزین کا نام بدل کر فکر نو کردیا گیا اتنے عرصے بعد آج بھی یہ میگزین اپنی آب وتاب کے ساتھ نکلتا ہے۔

کالج کے مختلف شعبہ جات کی جانب سے کئی ایک رسائل نکلتے ہیں، جن کے نام سریشٹی (سائنس)، آواز (پولیٹکل سائنس)، فکر نو (اردو)، رشمی (ہندی)، ورلڈ کام (کامرس)، رائس (معاشیات) Antyodaya (گاندھی اسٹڈی سنٹر)، rambler (انگریزی) behind the reins (فلاسفی) psynapse (سائیکالوجی) شعبہ اردو شبینہ کالج کی شمع حیات کالج کے اہم رسائل ہیں۔

کالج کا سالانہ لیکچر سریز ذاکر حسین میموریل لیکچر کی کالج کی عملی زندگی میں بڑی اہمیت ہے مشہور اسکالرس نے یادگار لیکچرز دیے ہیں اس کے علاوہ کالج کا اپنا ایک ادبی ثقافتی پروگرام سالانہ ہوتا ہے جو اپنی بہت ساری سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہے۔ طلبا کی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے کھیل کود اور سماجی خدمات کے لیے کالج میں این سی سی، این ایس ایس کی تنظیمیں اور کلب ایک اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ یہاں سے فارغ التحصیل طلبا وطالبات ملک بھر میں اور دوسرے ممالک میں بڑے بڑے عہدوں پر اپنی نمایاں خدمات انجام دے رہیں ہیں۔

دیکھا جائے تو اس عظیم الشان ادارے نے اپنے نام بدل بدل کر تین طرح کی حکومتوں اور سرپرستوں کی تاریخ دیکھی ہے اپنے ابتدائی دور میں مغلیہ حکومت اپنی پھر انگریزی حکومت کا دور اور اس سے اور آزاد ہندوستان کا ہندوستانی دور میں جی رہا ہے۔ اس کالج نے ملک کی عموماً اور اہل دہلی کی خصوصاً جو تعلیمی خدمات انجام دی ہے کم ہی لوگ اس سے واقف ہیں، اس حقیقت کو نئی نسل سے واقف کروانا اور اس کی عظمت کا احساس دلانا اور اس کی خدمات کا اعتراف کرنا ہمارا فریضہ ہے۔

تقاضائے وقت ہے کہ اس ادارے سے وابستہ شخصیتوں پر از سرنو تحقیق کریں اور ان کے علمی وادبی کارنامے جو ابھی تک پردہ خفا میں ہیں ان سے زمانے والوں کے سامنے پیش کریں۔ ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کو از سرنو شروع کریں۔

علم وعمل کے ان قدیم مرکزوں اور اداروں کی یاد کو تازہ رکھنا اور آنے والی نسلوں تک ان کارناموں کو پہنچانا ہمارا فرض ہے۔ اس عظیم ورثے کی مدد سے نئے ہندوستان کے تمدنی نقشے میں ہمیں رنگ بھرنا ہے۔ جس طرح اس ادارے سے وابستہ اساتذہ کے دل میں ماضی کی محبت ان کے ارادوں میں حال کی قوت اور ان کی آنکھوں میں مستقبل کا نور رہا۔ تقاضائے وقت کے تحت ہمیں ڈھل کر ان ادھورے کاموں کو آگے بڑھانا ہوگا۔ مجھے امید ہے کہ یہ ادارہ مثل سابق تعلیمی مشن کے کارناموں کو برقرار رکھتے ہوئے اپنی خدمات انجام دیتا رہے گا۔

■

Dr. Shahana Begum
Dept of Urdu, Zakir Husain Delhi College
University Of Delhi-110007
Mob.: 9650677959
E-mail.: Shan786hcu@yahoo.com

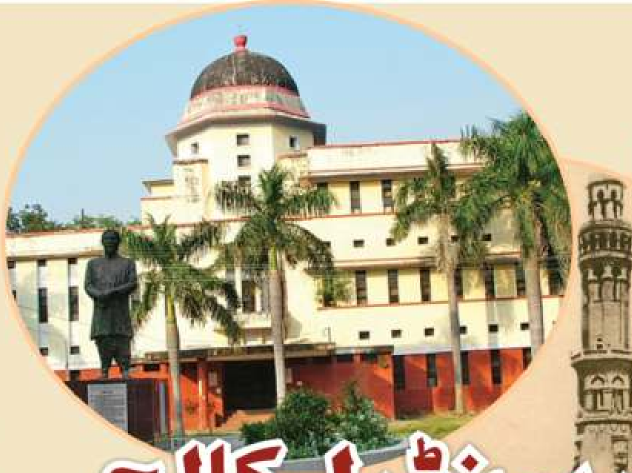

ندیم راعی مرادآبادی

میور سنٹرل کالج اور الہ آباد یونیورسٹی

کانوینٹ اور اسکولوں کی ابتدا کلکتہ سے ہوئی اور کلکتہ ہی ملک کی تعلیم کا مرکز رہا بعدہٗ انگریزوں نے ملبڑے بڑے شہروں میں انٹر کالجز کے علاوہ ڈگری کالجیز اسی مستعدی کے ساتھ قائم کیے جن میں انگلش، جغرافیہ، ریاضی، قانون، حساب اردو سنسکرت عربی فارسی کی تعلیمات دی جاتی تھیں۔

سر ولیم میور لیفٹیننٹ گورنر صوبۂ الہ آباد کی کاوشوں سے کرائے کی جگہ لاؤدر ہال الہ آباد جو اب دربھنگہ ہال سے جانا جاتا ہے۔ یکم جولائی 1872 سے 'میور سنٹرل کالج' کا قیام عمل میں آیا اور کالج کے پہلے پرنسپل مسٹر آگٹس ہریسن انگریزی ادب کے ماہر پروفیسر ڈبلو ایچ رائٹ حساب کے پروفیسر جے ایلیٹ سائنس ولٹریچر کے پروفیسر مولوی ذکاء اللہ سنسکرت کے پروفیسر پنڈت آدتیہ رام بھٹاچاریہ مقرر ہوئے۔

کالج کا تعمیری کام 9 دسمبر 1873 سے شروع ہوگیا تھا ملک کے مختلف علاقوں سے روسا، امرا، نوابین، راجے مہاراجے، معززین حکومت نیز علم دوست حضرات اس تقریب میں مدعو کیے گئے تھے۔ اس موقع پر سر ولیم نے اپنے خطبے میں کہا تھا:

''جس روز سے میں نے اپنا عہدہ اختیار کیا الہ آباد میں ایک سنٹرل کالج قائم کرنے کی میری شدید خواہش تھی یہاں آنے کے کچھ عرصے بعد میں نے یہ بات محسوس کی کہ الہ آباد کے کچھ علم دوست حضرات کے قلوب میں بھی تعلم و تدریس کے بہترین نظام کا ویسا ہی جذبہ پوشیدہ ہے جیسا میں اپنے اندر محسوس کرتا ہوں میں نے پہلا عوامی دربار اسی مقصد کے لیے منعقد کیا تاکہ ان حضرات سے اس کار عظیم میں تعاون کرنے کی اپیل کرسکوں میری اپیل بہت کارگر ثابت ہوئی لوگوں نے اس میں دلچسپی لی اور ایک اچھی خاصی رقم چندے کے ذریعے وصول کرکے مجھ سے یہاں ایک کالج قائم کرنے کی خواہش ظاہر کی گئی۔

(اے ہسٹری آف میور سنٹرل کالج: ڈاکٹر اے این جھا، ص 1)

میور سنٹرل کالج جس کی سنگ بنیاد آج دوپہر کے وقت وائس رائے رکھیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ جب یہ عمارت مکمل ہوگی تو شمالی مغرب کے صوبے جات میں 'تاج محل' کے بعد دوسری سب سے خوبصورت عمارت ہوگی۔ اس عمارت کا ڈیزائن مسٹر ڈبلو ایمرسن نے جدید مغربی طرز پر تیار کیا ہے امید ہے مارچ 1885 تک کالج کی عمارت میں درجات شروع ہوسکیں گے.....''

کالج کی عمارت کو تیار ہونے میں تقریباً بارہ برس لگ گئے وجے نگرم ٹاور اور لائبریری پتھر سے تعمیر کی گئی دیگر کمروں و دفتروں میں پتھروں کے ساتھ اینٹ کا استعمال بھی ہوا اور کالج کی تعمیر میں 8,89,627 (آٹھ لاکھ، نواسی ہزار چھ سو ستائیس روپے) خرچ ہوئے........

کالج کا آغاز صرف پانچ اساتذہ کے ساتھ اردو انگریزی میڈیم سے ہوا تھا۔ قدیم و جدید علوم، سائنس، قانون، فلسفہ، ریاضی، عربی فارسی اور سنسکرت میں ایف اے اور بی اے کے درجات تھے۔

اور وہ دن 18 اپریل 1886 بھی آیا جب کرائے کی جگہ چھوڑ کر میور سنٹرل کالج کینٹ علاقے کی نو تعمیر عمارت میں منتقل ہوا۔ جس کا افتتاح سر الفریڈ نے کیا اور ایک یادگار افتتاحی جلسہ کالج بذا وجے نگرم ہال میں منعقد ہوا۔ جس میں سرکاری غیر سرکاری یوروپی، ہندوستانی حتیٰ کہ شمالی مغربی صوبہ جات کا تقریباً ہر معزز فرد شریک تھا۔ سر الفریڈ نے اپنی تقریر میں مندرجہ ذیل تاثرات پیش کیے:

''کالج کی عمارت ان لوگوں کی عوامی خدمت کے جذبات کی یادگار ہے جنھوں نے کالج کے قیام کے لیے کھلے دل سے چندہ دیا اور اسے قائم کرنے میں کوئی کوشش باقی نہیں رکھی۔ یہ اس استقامت محنت لگن اور اعتماد کی بھی یادگار ہے جسے سر ولیم میور اور دوسرے پیش رو حضرات، سماج کے اہم نمائندگان اور نہایت قابل عالموں نے ہندوستان کے اس خطہ میں اعلیٰ تعلیم کی تدریج و ترقی کے لیے نہایت کوششوں کے بعد قائم کیا اور انھیں اس کالج کے عوامی مفاد اس کے مقصد اور مستقبل میں اس کی ترقی کا مکمل یقین ہے۔ اگر ہم میں سے کسی کو فن تعمیر سے ذرا سی بھی دلچسپی ہے تو اسے اس بات کا احساس ہوگا کہ اس کالج کی تعمیر میں مغربی اور مشرقی دونوں طرح کے فنون تعمیر کا استعمال ہوا ہے یہاں پر ہر طرح کی تعلیم فراہم ہوگی۔ اب ہمارے طلبا کی سہولت کے لیے وسیع النظر ہال ہے جس میں ہم یکجا ہیں۔ کشادہ لیکچر کے کمرے اور لائبریری ہے جس سے ہماری آنے والی نسلیں استفادہ حاصل کریں گی۔ ہماری تعلیم کا معیار محض جدید علوم پر مبنی نہیں ہوگا بلکہ ہم اس کالج کو درس و تدریس کا ایک ایسا گہوارہ بنانے کے متمنی ہیں جس میں قدیم، موثر اور ضروری علوم بھی شامل ہوں گے اور صدیوں تک اس کا نام باقی رہے گا۔ میور سنٹرل کالج کرائے کی جگہ چھوڑ کر اپنی تعمیر نو میں جیسے ہی منتقل ہوا تھا۔ لیفٹیننٹ گورنر نے اس وقت کے وائس رائے لارڈ ڈفرزن سے گذارش کی کہ اب الہ آباد میں یونیورسٹی کے قیام کی منظوری دے دی جائے وائس رائے نے اس تجویز پر اپنی دلچسپی ظاہر کی۔ اس سے قبل 1873 میں ہندوستانی محکمۂ تعلیم نے بھی شمالی ہند میں ایک یونیورسٹی کے قیام کی تجویز پیش کی تھی چنانچہ الہ آباد میں یونیورسٹی کے قیام کی کوششیں تیز ہوگئیں علاوہ ازیں کچھ بیدار مغز حضرات نے بھی اس کے قیام کے سلسلے میں وزارتِ داخلہ سے رجوع کیا جن میں سر سیّد احمد خاں پرمود داس میرا، پرنسپل کنگ کالج لکھنؤ مسٹر ڈیٹن انسپکٹر آف اسکول روہیل کھنڈ، پروفیسر ایس، اے، ہل، استاد میور سنٹرل کالج مسٹر جے سی نیسفلڈ وغیرہ خاص ہیں۔ ان سبھی کی کوششوں کا مثبت ردعمل ہوا محکمۂ تعلیم نے شمالی مغربی صوبہ جات و اودھ کا تعلیمی جائزہ لیتے ہوئے اپنے 17 اگست 1886 کے Despatech الہ آباد میں لکھا۔

ہر پریسڈینسی شہر میں جہاں پر کافی تعداد میں تعلیمی ادارے ہیں اور جن سے طلبا کی کثیر تعداد ڈگری کورسوں کے لیے دستیاب ہوسکتی ہے وہاں پر ایک یونیورسٹی کا ہونا لازمی ہے ایسی ہی ایک یونیورسٹی پنجاب کے لاہور میں قائم ہو چکی ہے اور اب معقول وقت آگیا ہے کہ اس جانب مزید آگے بڑھ کر شمالی مغربی صوبہ جات اودھ وصوبہ وسطیٰ نیز الہ آباد میں ایک یونیورسٹی قائم کی جائے۔

اس مرحلے میں الہ آباد میں یونیورسٹی قائم کرنے کی

مندرجہ ذیل وجوہات پیش کی گئیں:

1 کلکتہ یونیورسٹی اور اس کے اساتذہ پر کام کا بار زیادہ ہونا۔

2 کلکتہ یونیورسٹی مشرقی زبانوں کی تعلیم پر اچھی طرح توجہ نہیں دے پاتی۔

3 مغربی علوم اور سائنس کی تشہیر وفروغ کے لیے ضروری ہے کہ ہندوستانی زبان کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے۔

4 یونیورسٹی کی صورت میں ایک ممتحن ادارہ (Examing Body) کا قیام عمل میں آئے۔

بابو پرمیشور مشرا جو کہ کوئنس کالج بنارس میں استاد تھے۔ اپنی ایک تجویز پر انھوں نے کہا:

''اگر کلکتہ یونیورسٹی میں انگریزی کا پرچہ لازمی ہے تو ہماری یونیورسٹی میں سنسکرت یا عربی مضمون کو ضروری قرار دیا جانا چاہیے۔''

(ایم۔ایل بھارگو ہنڈریڈ ایرس آف الہ آباد یونیورسٹی،ص 6-5)

ڈاکٹر ظہیر اختر اپنے مقالے 'شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی کا تاریخی پس منظر' میں رقم طراز ہیں 'آخر کار تمام دلائل کی روشنی میں وائس رائے مشیر و سکریٹری نے اپنے مراسلے نمبر 18، (Despatched 18 Public Education) میں الہ آباد یونیورسٹی کے قیام کی منظوری دے دی۔ سکریٹری مذکور کے قلم کی تعمیل میں مغربی شمال صوبہ جات اودھ کی حکومت نے 10 جون 1887 کو الہ آباد یونیورسٹی کی تجویز کو منظور کر لیا۔ 29 جون 1887 کو اسی مقصد کے تحت ایک کمیٹی کی تشکیل دی گئی جس کے ممبران میں آکلینڈ کالون، اسکوبل، پیلے، کرنل ویس اور صدر کوئنٹن تھے۔

(ڈاکٹر ظہیر اختر کی اردو شعبہ الہ آباد یونیورسٹی کا تاریخی پس منظر،ص 154)

مسٹر کوئنٹن کی سفارش کے مطابق الہ آباد یونیورسٹی کے پہلے چانسلر شمالی مغربی صوبہ جات و اودھ کے لفٹنٹ گورنر آنریبل سر الفریڈ کامنس لائل اور پہلے وائس چانسلر الہ آباد ہائی کورٹ کے چیف جسٹس آنریبل سر جان ایج ہوئے اور 23 ستمبر 1886 کو الہ آباد یونیورسٹی پوری طرح وجود میں آ گئی یونیورسٹی کا باضابطہ افتتاحی جلسہ 15 نومبر 887 کو 3 بجے دن میور سنٹرل کالج کے وجے نگرم ہال میں منعقد ہوا جس کی صدارت چانسلر سر الفریڈ لائل نے کی اس جلسے میں جن قابل ذکر شخصیات نے حصہ لیا ان کے نام نامی مندرجہ ذیل ہیں۔

سر جان ایج، ڈگلس اسٹریٹ، ڈبلو ٹائریل، سر سیّد احمد خاں بہادر سیّد محمود، جے وڈ بش، اجودھیا ناتھ پنڈت، کرنل فوربس، ای، وہائٹ، میجر کلیگرن، سرجیون، اے ای گف، راجہ شو پرساد، راجہ جے کشن داس اے جے لارنس، ایم ایس ہاویل نے جے سی نیسفیکڈ، کے ڈیٹن، ڈبلوس بینٹ، اے تھامپن، راجہ اودے پرتاپ سنگھ، بابو پرمود داس مترا، پنڈت بابو دیو شاستری، ڈبلو ایچ رائٹ، ایم بوٹ فلاور، مولوی ذکاء اللہ خاں بہادر، ایس اے ہل، سی ایچ ووڈ، پنڈت لکشمی شنکر مشرا تھوڈر بیک، پنڈت آدتیہ نرائن بھٹاچاریہ، منشی نول کشور بھارگوا، بابو میر یشور مترا، ڈاکٹر مکند لال، رام سرن داس وغیرہ۔

(ایم۔ایل بھارگو ہنڈریڈ ایرس آف الہ آباد یونیورسٹی ص 26)

چانسلر یونیورسٹی مسٹر سر الفریڈ لائل نے صدارت کرتے ہوئے اپنے صدارتی خطبے میں کہا ''ہندوستان کے اس خطے کی کلکتہ سے دوری ہمیشہ نقصان دہ رہی ہے۔ ذات پات رہائش اور زبان کی تفریق بھی اس کی ایک وجہ ہے ذہنی ترقی اور نشو ونما کے لیے کوئی طریقۂ کار ایجاد ہونا چاہیے۔''

طلبا کے ذہنی فروغ اور کھیل کود کے لیے کالج ہذا میں ڈیبیٹ کلب، اسپورٹس کلب اور طلبا کی یونین Student Representive Council کی تشکیل کی گئی تا کہ طلبا براہ راست اپنی شکایتیں پریشانیاں کالج کی انتظامیہ تک پہنچا سکیں۔

ٹھیک ایک سال بعد میور سینٹرل کالج کی عمارت کے ایک حصہ میں 'الہ آباد یونیورسٹی' قائم کر دی گئی جس کے لیے پہلے رجسٹرار دوسرے پرنسپل اے ای گف مقرر ہوئے۔

یونیورسٹی میں اہم جگہوں پر زیادہ تر میور کالج کے حضرات کا ہی تقرر کیا گیا۔ تعلیمی تدریسی امور کی نگرانی کے لیے ایک سینیٹ کی تشکیل کی گئی یونیورسٹی کے جو قوانین وضع کیے گئے اس رو سے سینیٹ کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ یونیورسٹی میں داخلہ امتحان، درجات میں حاضری اور ڈگری فراہم کرنے کے لیے فیس کی وصولیابی کرے۔

الہ آباد یونیورسٹی ہندوستان کی پہلی یونیورسٹی تھی جہاں قانون میں داخلے کے لیے گریجویٹ ہونا لازمی نہیں تھا داخلے کے لیے انٹرمیڈیٹ کی تعلیمی لیاقت ضروری تھی اور امیدوار دو برس کے بعد لا گریجویٹ کی ڈگری حاصل کر کے وکالت کر سکتے تھے بعدہٗ یونیورسٹی کے قوانین میں جب تبدیلی کی گئی تو قانون کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے داخلے گریجویشن کے بعد ہونا قرار پائے۔

سینیٹ نے اپنی ایک میٹنگ میں قانون وقاعدے میں ترمیم و اضافہ کے علاوہ مندرجہ ذیل حضرات کو یونیورسٹی فیلو بھی مقرر کیا۔ جن میں سینیٹ جانسن کالج آگرہ کے ہینری پی برنٹ، بیرسٹر الہ آباد ہائی کورٹ، موتی لعل نہرو، کنگ کالج لکھنؤ کے پروفیسر ایم بی کیمران، کالج ہٰذا کے پروفیسر بھٹاچاریہ، کرائسٹ چرچ کالج کانپور کے استاد اے کے کراسویٹ، بیرسٹر ایٹ لا عبد الماجد، ٹی کا ٹلان، ڈبلو آر پورٹر، سیّد کرامت حسین، وکیل الہ آباد ہائی کورٹ پنڈت بشمبر ناتھ، ڈی این بنرجی، مدن موہن مالویہ، ستیش چندر بنرجی، پنڈت سندر لال۔ نام نامی قابل ذکر ہیں۔

ہندی ادب کے مشہور و معروف شاعر ہری ونش رائے بچن کا تعلق بھی شعبۂ انگریزی الہ آباد یونیورسٹی سے تھا وہ تقریباً بیس برس تک شعبے میں استاد رہے اور جناب رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری جو اردو شعر و ادب کی ناقابل فراموش شخصیت ہیں شعبۂ انگریزی سے ہی منسلک تھے۔ ڈاکٹر ظہیر اختر نے اپنے تحقیقی مقالے شعبۂ اردو الہ آباد کے اساتذہ کی ادبی خدمات میں رقم طراز ہیں:

''شعبۂ مشرقی ادبیات Orintial Languages، 1922 میں قائم ہوا اور مہا مہو پادھیائے ڈاکٹر پی کے اچاریہ شعبے میں پروفیسر و صدر مقرر ہوئے اس شعبے میں سنسکرت ہندی اور عربی و فارسی کی تعلیم کا بندوبست تھا۔ بعد میں شعبۂ سنسکرت اردو ہندی اور عربی و فارسی کے شعبے وجود میں آئے۔ شعبۂ اردو کے آغاز میں پروفیسر سیّد ضامن علی تنہا استاد تھے اور شعبے کے صدر بھی۔''

پروفیسر گنگا ناتھ جھا وائس چانسلر الہ آباد یونیورسٹی، پروفیسر سیّد محمد ضامن علی، مولانا حمید الدین فراہی، شیخ مہدی حسن ناصری و دیگر دردمندان اردو کے تعاون سے 1924 میں الہ آباد یونیورسٹی میں شعبۂ اردو باضابطہ قائم ہوا اور پہلے صدر شعبہ پروفیسر سیّد ضامن علی منتخب ہوئے۔ وہ شعبہ میں اکیلے استاد تھے اس زمانے میں ملک کے کسی کالج یونیورسٹی میں ایم اے (اردو) کے درجات نہیں تھے، تاہم عربی فارسی کے درجات تو ملک کے کئی کالج میں تھے۔

شعبہ اردو کے باضابطہ قیام کے بعد 1926 میں ایم اے سے درجات کا آغاز ہوا جہاں ریسرچ کی سہولیات بھی مہیا کرائی گئیں۔ پروفیسر سیّد محمد ضامن علی نے اردو کی اہمیت و افادیت کی وضاحت کے لیے اردو میں ایک نظم 'فریاد اردو' جس میں اردو سے متعلق تشبیب و فراز کی طرف اشارہ کیا۔ یہ نظم ہندوستانی اکیڈمی جلسے نیز دہلی دربار کے جشن میں پڑھی گئی۔ نومبر 1931 کے 'مبشر' میں شائع ہوئی۔ شعبۂ اردو کے دیگر اساتذہ ڈاکٹر محمد حفیظ، مولوی اجمل احمد خاں، ڈاکٹر تارا چند وغیرہ کی اپنی انفرادی شناخت تھی ان کے شاگردوں میں ایسے منفرد نام ہیں جنھوں نے اعلیٰ اور منفرد مقام حاصل کیا جن میں پروفیسر اعجاز حسین، پروفیسر سیّد وقار، پروفیسر گیان چند جین، پروفیسر احتشام حسین، حامد بلگرامی، تاج نقوی، غفران احمد فاروقی، ابو طالب نقوی وغیرہ اہم ہیں۔

■

Nadeem Rayee Moradabadi
198, Chaudhry House, Galshaheed,
Moradabad- 244001 (UP)
Mob.: 8188937127

زبان کی موت، قوم کی موت ہے!

خطاب عالم شاذ

اردو رسائل میں عموماً ان ادبی مباحث اور مسائل پر زیادہ ارتکاز ہوتا ہے جن سے عوام یا معاشرے کا زیادہ گہرا رشتہ نہیں ہوتا۔ اردو زبان کے تعلق سے جو بھی گفتگو ہوتی ہے ان سے حقیقی صورتِ حال کا ادراک نہیں ہوپاتا۔ زبان کی زمینی صورت حال کیا ہے اس سے آگہی کے لیے ضروری ہے کہ تحریکات و رجحانات کے بجائے ان بنیادی مسائل پر توجہ دی جائے جن کا زبان کے فروغ اور تحفظ سے تعلق ہے۔ عموماً اردو کے حقیقی مسائل سے اجتناب کیا جاتا ہے اور یہ جاننے کی کوشش نہیں کی جاتی کہ کن کن علاقوں میں اردو کی حقیقی صورتِ حال کیا ہے؟
ماہنامہ 'اردو دنیا' میں سوال نامے کے ذریعے دراصل اردو زبان کے بنیادی مسائل سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے تاکہ یہ اندازہ ہوسکے کہ ملک کے مختلف علاقوں میں تعلیم، تدریس اور دیگر سطحوں پر اردو زبان کی صورت حال کیا ہے اور وہاں کس طرح کی دشواریاں اور مشکلات پیش آرہی ہیں۔ جب تک اردو زبان کے بنیادی مسائل پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا جائے گا تب تک اردو زبان کے تحفظ اور بقا کے لیے مربوط لائحہ عمل تیار کرنا مشکل ہوگا۔

س: زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟

ج: ترسیل کا سب سے موثر وسیلہ زبان ہے۔ زبان کے ذریعے ہی ہم اپنے خیالات، احساسات و جذبات کا اظہار کرتے ہیں اور جس زبان میں کرتے ہیں وہ ہماری مادری زبان کہلاتی ہے۔ مادری زبان ہی ہماری پہچان ہے۔ کسی قوم کی ترقی یا تنزلی زبان پر منحصر ہے۔ کسی مفکر یا دانشور نے کہا ہے کہ ''کسی قوم کو مٹانا ہوتو اس کی زبان مٹا دو، تو قوم کی روایات اور تاریخ سب کچھ مٹ جائے گی'' اگر ہم اپنی شناخت یعنی اپنی زبان سے ہی بیگانے ہوتے چلے جائیں گے تو یقیناً ہماری زبان کی موت ہو جائے گی۔ اس لیے اس دورِ جدید میں ہمیں چاہیے کہ جدید تکنالوجی سے ہم آہنگ ہوکر اپنی زبان کی حفاظت کریں۔ جو قوم اس معاملے میں پیچھے رہ جائے گی آئندہ دنوں ان کی زبان یقیناً زوال پزیر ہوگی۔

س: زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ اختیار کیا جانا چاہیے؟

ج: جو قوم اپنی زبان کی حفاظت کرے گی وہ یقیناً ترقی کی ساری منزلیں طے کریں گی۔ زبان کو روز مرہ کی زندگی میں بول کر اور اسے تحریر میں لاکر ہی زندہ رکھ سکتے ہیں۔ تحریری سلسلے میں اس کی نشر واشاعت پر زیادہ دھیان دینا ہوگا۔ سرکاری اور غیر سرکاری اداروں میں زبان کو زندہ رکھنے کے لیے اسے رائج کرنا تاکہ اس کی حفاظت ہو سکے۔ درس وتدریس کا کام بھی ہر سرکاری اور غیر سرکاری اسکولوں میں کرانا ہوگا۔ زبان کو زندہ رکھنے کے لیے مختلف موضوعاتی پروگرام کا انعقاد کرنا ہوگا۔ اس کے علاوہ نئے لکھاریوں کی حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ ان کی اصلاح بھی کرنا ہوگی۔ دوسری زبانوں کی تہذیب وثقافت کو اپنی زبان میں منتقل کرنا ہوگا۔

س: زبان کا تہذیب وثقافت سے کیسا رشتہ ہے؟

ج: زبان سے تہذیب وثقافت کا گہرا رشتہ ہے۔ یہ زبان ہی ہے جو کسی قوم کی تہذیب کی عکاسی کرتی ہے۔ ہم زبان میں اس کی جھلک پاتے ہیں۔ ہم کسی قوم کی تہذیب ان کی زبان میں ہی لکھی ہوئی کتابوں سے حاصل کرتے ہیں۔ ہاں یہ بات اور ہے کہ جب کوئی خاص موضوع کی تہذیب وثقافت ہماری آنکھوں سے گزرتی ہے اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ اسے اپنی زبان میں عام کرنا چاہیے تو اسے ترجمہ کرکے اپنی زبان میں منتقل کردیتے ہیں۔ ہندی کے علاوہ اردو زبان میں بھی ہندوستانی تہذیب وثقافت کے تمام عناصر ملتے ہیں۔ سبب یہ ہے کہ اردو زبان خالص ہندوستانی زبان ہے، جو اسی ملک میں پیدا ہوئی، یہیں پلی اور بڑھی، اس لیے یہ اس ملک کی تہذیب کی مکمل عکاسی کرتی ہے۔ ایک ہی سکے کے دورخ 'زبان اور تہذیب' ہیں۔

س: کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟

ج: جی بالکل جڑا ہوا ہے۔ کسی زبان کی موت کا مطلب

اس قوم کی موت ہے۔ اس لیے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ زبان سے ہی جڑا ہو ہے۔ اگر ہم اپنی زبان کی حفاظت کر پاتے ہیں تو اس کا مطلب ہم اپنی وراثت کی حفاظت کرتے ہیں۔

س: کسی زبان میں خواندگی، سائنسی اور سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟

ج: سائنس اور ٹکنالوجی ہمارے دور کی روشن حقیقت ہے۔ میرے خیال میں سائنسی مواد کی کمی سے ہم پیچھے رہ جائیں گے۔ ہم اردو والوں کے ساتھ یہی ہوا ہے۔ لہٰذا اردو میں سائنسی مواد کی کمی کے باعث ہم یا ہمارے بچے سائنسی میدان میں اپنی قابلیت کا مظاہرہ نہیں کر پا رہے ہیں۔ یہ ہمارے سماج کا بہت بڑا مسئلہ ہے۔ یہ جدید ترقی کا دور ہے۔ اس ترقی کے دور میں خواندہ کی کمی یعنی ناخواندہ انسان، جو زندہ لاش کی مانند ہے۔ اب لاش سے مثبت اثر کی سوچ بالکل احمقانہ ہے۔

س: موجودہ حالات میں ارد و زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟

ج: موجودہ دور میں اردو زبان کو کئی طرح کے خطرات لاحق ہیں۔ جن میں سب سے پہلا روزگار ہے۔ اردو میڈیم سے پڑھنے والوں کو روزگار کی عدم موجودگی کا سامنا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اردو والے اب اپنی آل و اولاد کو دوسری زبان پڑھانے پر مجبور ہیں جس میں روزگار کے زیادہ مواقع دستیاب ہیں۔ دوسرا خطرہ سائنس اور ٹکنالوجی سے ہم آہنگ نہ ہونا ہے۔ مگر اس ضمن میں ابھی کام ہی شروع ہوا ہے، اس معاملے میں ہم دوسری قوموں کے مقابلے میں بہت پیچھے ہیں۔ تیسرا سب سے بڑا خطرہ ہم اردو والوں میں ہی کچھ افراد ایسے ہیں جو صرف نام و نمود کی خاطر اردو کا دم بھرتے ہیں۔

س: اردو کا مستقبل کیا ہے؟

ج: میں بیک وقت اردو کا طالب علم اور مدرس ہوں۔ ایک طرف پڑھتا ہوں تو دوسری طرف پڑھاتا ہوں۔ سماجی سطح کے مضامین لکھنے والوں کی کمی کے باعث مجھے کبھی مایوسی ہوتی ہے تو کبھی ٹکنالوجی سے جڑے اردو کی جانکاری رکھنے والے نوجوانوں میں ایک امید کی کرن نظر آتی ہے۔ دو دہائی قبل کے بیشتر ادبا، "من ترا حاجی بگویم تو مرا ملا بگو" کے مصداق ایک دوسرے کو خوش کرتے نظر آتے ہیں۔ اس سے سماج کا کوئی بھلا ہونے والا نہیں۔ اس کے باوجود ایک امید باقی ہے کہ نئی نسل میں جو ٹکنالوجی سے جڑے ہیں ان سے ڈیجیٹل ورلڈ میں اردو کا مستقبل تاباں ہوگا۔ ان شاء اللہ

س: زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہوا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جاسکتی ہیں؟

ج: زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہوا ہے اس میں ہماری سوچ کا بڑا دخل ہے۔ ہم انگریزی بولنے پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ ہم نے اردو کے ساتھ انگریزی الفاظ کا بیجا استعمال کر کے اردو زبان کی روح کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ ہمیں چاہیے کہ جب ہم اردو میں بات کریں تو صد فیصد اردو الفاظ کا ہی انتخاب کریں۔ سوشل میڈیا پر پیغام رسانی کے لیے اردو رسم الخط کا ہی استعمال کریں۔ جہاں تک ممکن ہو رومن اردو لکھنے سے اجتناب کریں۔ سوشل میڈیا کے کچھ شارٹ کٹ انگریزی الفاظ وہیں تک محدود رہیں تو بہتر ہے۔

س: کیا اردو ادارے، تنظیمیں زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبانوں سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟

ج: ہاں۔ یہ بات بالکل درست ہے آج کل اردو کے ادارے زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں۔ ادب کے ساتھ زبان پر بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے تا کہ زبان وادب کا توازن برقرار رہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ زبان کے تعلق سے کتابوں کی اشاعت رک سی گئی ہے، جو مستقبل کے بچے و بچیوں کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔ نئی نسل کے بچے ادب پڑھیں گے مگر ان کی مثال اس شخص کی مانند ہوگی جو" تاریک شب میں بغیر فانوس لیے سفر کر رہا ہو"۔

س: کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ کی گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟

ج: میرے خیال میں کلاسیکیت یا جدیدیت کی گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا بلکہ زبان سے ان کو فائدہ پہنچا ہے۔

س: آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور اس میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟

ج: ہمارے علاقے میں پرائمری اسکولوں کی تعداد دس، جس میں پانچ غیر سرکاری اور پانچ سرکاری اسکول ہیں۔ آبادی کے لحاظ سے اسکولوں کا تناسب ٹھیک ہے اور سرکاری اسکولوں میں طلبا اور اساتذہ کا تناسب بھی ابھی گزشتہ پانچ یا چھ سالوں سے ٹھیک ہے۔ سکنڈری اسکول کی تعداد صرف چار ہے، جس میں ایک اردو میڈیم لڑکیوں کے لیے مخصوص ہے۔ ان اسکولوں کے نام (1) کانکی نارہ حمایت الغربا ہائی اسکول (2) کانکی نارہ اردو گرلس ہائی اسکول (3) چشمۂ رحمت ہائی اسکول (4) شمس اردو ہائی اسکول۔ شمس اردو ہائی اسکول کے علاوہ بقیہ تمام اسکولوں میں ہائر سکنڈری تک کی پڑھائی ہوتی ہے۔ یہاں طلباء اور اساتذہ کا تناسب ٹھیک نہیں ہے۔ سکنڈری اور ہائر سکنڈری اسکولوں میں اساتذہ کی کمی ہے۔

س: آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات ورسائل آتے ہیں؟

ج: حال میں ایک بھی لائبریری نہیں ہے۔ دو دہائی قبل ہمارے علاقے میں چار مشہور لائبریریاں تھیں۔ قومی لائبریری (کانکی نارہ)، بزم انشاء لائبریری (بڑی پاڑہ)، سیون اسٹار اور فیض الرسول لائبریری (جگتدل)۔ ان چاروں میں قومی لائبریری سب سے مشہور اور فعال لائبریری تھی۔ جو مشہور آرٹسٹ وادب نواز عبدالوہاب محسنی کے زیرِ سر پرستی چلتی تھی۔ جس میں سیکڑوں نایاب کتابیں تھیں۔ اب شعرا وادبا کے گھر میں ہی چھوٹی چھوٹی لائبریری ہے۔ یہاں کتابوں کے علاوہ اخبارات، رسائل و جریدے جس میں اردو دنیا، فکر وتحقیق، ایوانِ اردو، فروغ ادب، زبان و ادب اور عالمی فلک وغیرہ خاص ہیں۔

موجودہ دور میں اردو زبان کو کئی طرح کے خطرات لاحق ھیں۔جن میں سب سے پھلا روزگار ھے۔ اردو میڈیم سے پڑھنے والوں کو روزگار کی عدم موجودگی کا سامنا ھے۔ یھی سبب ھے کہ اردو والے اب اپنی آل و اولاد کو دوسری زبان پڑھانے پر مجبور ھیں جس میں روزگار کے زیادہ مواقع دستیاب ھیں۔ دوسرا خطرہ سائنس اور ٹکنالوجی سے ھم آھنگ نہ ھونا ھے۔مگر اس ضمن میں ابھی کام ھی شروع ھوا ھے ،اس معاملے میں ھم دوسری قوموں کے مقابلے میں بھت پیچھے ھیں۔ تیسرا سب سے بڑا خطرہ ھم اردو والوں میں ھی کچھ افراد ایسے ھیں جو صرف نام و نمود کی خاطر اردو کا دم بھرتے ھیں۔

س: آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں؟

ج: ہمارے علاقے میں بنام کانکی نارہ اسٹوڈنٹس ویلفیئر سوسائٹی، کانکی نارہ اسٹوڈنٹس سپورٹ کاؤنسل، کانکی نارہ خدمتِ خلق فری کوچنگ سنٹر، بڑی پاڑہ ایجوکیشنل سوسائٹی جیسے چار ادارے ہیں، جو طلبا و طالبات کی تعلیمی سرگرمی کے تعلق سے کام کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں کانکی نارہ

کاروانِ علم وادب اور قرطاس وقلم (کانکی نارہ اور جگتدل) جیسے فعال ادارے جو ادب کے حوالے سے ماہانہ ادبی نشست، کتابوں کی رسم رونمائی اور ادب کی اشاعت اور فروغ پر کام کر رہے ہیں۔ انجمن ترقی اردو ہند کی شاخ بھی یہاں موجود ہے جو اردو کے فروغ کے لیے کام کرتی ہے۔ مگر جیسا ہونا چاہیے ویسا کام ابھی نہیں ہو پا رہا ہے، ہوسکتا ہے آئندہ دنوں میں ہو پائے۔

س: آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کر رہے ہیں؟

ج: جیسا کہ اوپر بیان کیا ہے کہ میں بیک وقت اردو کا طالب علم اور معلم دونوں ہوں تو طالب علم ہونے کے ناطے اردو اخبارات، رسالے و جریدے پڑھتا ہوں۔ معلم کی حیثیت سے میری یہی کوشش رہتی ہے کہ میرے کلاس میں بچے اردو میں زیادہ دلچسپی لیں۔ اس لیے دلجمعی کے ساتھ اردو پڑھاتا ہوں۔ اپنی مادری زبان کے حوالے سے اس کی اہمیت اور افادیت سے گاہے بگاہے روشناس بھی کراتا رہتا ہوں۔ اب آگے اللہ کی مرضی۔ اس کے علاوہ انجمن ترقی اردو ہند سے جڑا ہوا ہوں تاکہ اس بینر تلے اردو کی کچھ خدمت کر سکوں۔ انجمن ترقی اردو ہند مغربی بنگال صوبائی کمیٹی کا ممبر اور انجمن ترقی اردو ہند (کانکی نارہ وجگتدل شاخ) کا سکریٹری بھی ہوں۔ انجمن ترقی اردو ہند کی ہدایت کے مطابق سال میں دو تین بڑے پروگرام کا انعقاد کیا جاتا ہے جس میں ہم اپنے اسلاف کو ہی یاد نہیں کرتے بلکہ مقابلہ ذاتی پروگرام کے ذریعے طلبا و طالبات کی حوصلہ افزائی بھی کرتے ہیں۔

س: آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟

ج: اردو کے فروغ کے لیے میری ادنیٰ رائے یا مشورہ یہ ہے کہ ہر کالج میں اردو کا ایک شعبہ ہو۔ بہت سارے کالج میں اردو کا شعبہ نہ ہونے کی وجہ سے اس کالج میں اردو کے طالب علم داخلہ نہیں لیتے۔ اگر ہر کالج میں اردو طالب علم جائیں گے تو یقیناً ہر کالج میں اردو کا ماحول بنے گا اردو کی بو وباس نظر آئے گی۔ اس کے علاوہ اردو کو روزگار سے جوڑنے کا کام کیا جائے تاکہ اس زبان کو پڑھنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو۔ جہاں جہاں اردو والے گزر بسر کرتے ہیں وہاں وہاں اردو اسکولوں کا قیام قومی سطح پر ہو یا قومی یا ریاستی زبان کے ساتھ ان اسکولوں میں اردو بھی شامل ہو۔

س: اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کیا جاسکتی ہیں؟

ج: اردو زبان کا حسن و جمال ’رسم الخط اور تلفظ کی صحیح ادائیگی‘ میں ہے۔ تلفظ کی صحیح ادائیگی سے زبان میں چاشنی پیدا ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کو شیریں زبان کہا جاتا ہے۔ اردو رسم الخط کی بقا کے لیے مستحکم اقدام اٹھانے کی ضرورت ہے۔ سب سے پہلے پرائمری اسکولوں میں ہفتے میں ایک دن خوش خط تحریر کا کلاس ہونا چاہیے۔ پھر وقفے وقفے پر ایک مقابلہ ذاتی پروگرام کا انعقاد بھی ہوتا کہ کیلی گرافی اور خوشخطی سے بچوں میں دلچسپی پیدا ہو۔ ان پروگراموں میں کیلی گرافی یا خوشخطی ماہرین کو بھی مدعو کیا جانا چاہیے۔ بعد ازاں یہ اپر پرائمری اسکولوں تک پہنچے تاکہ بچوں کو اپنی مادری زبان سے محبت ہو، محبت ایسی کہ اردو زبان ان کا اوڑھنا بچھونا ہو جائے اور مستقبل میں وہ محبِ اردو کہلائیں۔ اس طرح یہ بچے ہی ایک دن اردو رسم الخط کے محافظ بن جائیں گے۔ اس کے علاوہ یہ سوشل میڈیا کا زمانہ ہے۔ سوشل میدیا پر ہم جہاں تک ممکن ہو یہ کوشش کریں کہ ہماری تحریر اردو رسم الخط میں ہوتا کہ اس کی بقا ممکن ہو سکے۔

س: آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا؟

ج: اردو سے جڑی شخصیات میں پہلا نام مجیب الحق (مرحوم) کا آتا ہے۔ جن کی شرعی بینکنگ جیسی خدمت کو علاقائی یا قومی سطح پر اعتراف نہیں کیا گیا۔ ان کے علاوہ موجودہ دور میں جناب عبدالودود انصاری (استاد محترم) کی سائنس، سائنسدانوں اور سائنسی خطوط جیسی نادر کتابوں کی اشاعت اور ڈاکٹر خورشید اقبال کی جدید لوازم سے لیس، لائف سائنس کلاس نہم اور دہم کی کتاب کے علاوہ دنیا کا اولین آن لائن اردو میگزین ’کائنات‘ اور ویب پورٹل ’اردو دوست ڈاٹ کم‘ جیسی خدمات کا اعتراف علاقائی یا قومی سطح پر اس طرح نہیں کیا گیا جیسا کہ ہونا چاہیے تھا۔

س: دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہوسکتی ہیں؟

ج: اردو اسی ملک ہندوستان میں پیدا ہوئی۔ یہیں پلی اور بڑھی۔ میرا ماننا ہے کہ اردو ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس لیے اردو زبان کو دوسری علاقائی زبانوں میں فروغ پانا چاہیے۔ ہماری ریاست مغربی بنگال میں بنگلہ زبان کے ساتھ اردو زبان بھی عام ہے۔ اسی طرح ہر دوسری علاقائی زبانوں میں اگر اردو عام نہیں ہے تو اسے عام کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے ہمیں انتھک محنت کرنا پڑی گی۔

س: کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان پڑھنا لکھنا جانتے ہیں؟

ج: جی ہاں۔ میرے اہل خانہ کی زبان اردو ہے۔ گھر کے افراد اردو پڑھنا لکھنا جانتے ہیں اور بچوں کو اردو بولنے، پڑھنے اور لکھنے کی تربیت بھی دی جاتی ہے۔

س: آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟

ج: جی بالکل، میرے بعد بھی میرے گھر میں اردو زندہ رہے گی۔

س: غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی کی جانی چاہیے؟

ج: ہماری زبان اردو میں شاعری کو عروج حاصل ہے جو کسی دوسری زبان کو حاصل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل انٹرنیٹ پر شاعری سے شغف رکھنے والے غیر اردو داں حضرات بھی اردو شاعری سنتے اور سمجھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اردو سیکھیں۔ اس لیے اگر کوئی شخص اپنی خواہش کا اظہار کر کے اس ضمن میں ایک قدم بڑھانا چاہے تو ہمیں اس ضمن میں سو قدم بڑھانا چاہیے۔ اس کے علاوہ اردو ہندی کوی سملین کروانا چاہیے تاکہ دونوں زبان کے لوگ اکٹھے ہوسکیں یا ممکن ہو تو سہ لسانی کوی سمیلن کرائیں۔

س: آپ کے علاقے میں کتنے کالجیز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟

ج: ہمارے علاقے یا اطراف میں چار پانچ کالجیز اور تین یونیورسٹیز ہیں جس میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے، یہاں اردو پڑھنے والوں کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے۔ اگر مغربی بنگال میں اردو سے روزگار کے مواقع معلّمی پیشے کے علاوہ دوسرے شعبوں میں بھی دستیاب ہوتے تو یہ خوش آئند بات ہوتی۔

س: ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں کس طرح کی مدد لی جاسکتی ہے؟

ج: اردو کی ترویج واشاعت کے لیے سائنسی مواد کی کمی کو پُر کرنے کے لیے غیر سرکاری ادارے سے مدد لی جاسکتی ہے تاکہ اس خلا کو پُر کیا جاسکے۔

س: سنٹرل اسکول اور نو ودے ویدیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

ج: ریاست مغربی بنگال میں قائم شدہ سنٹرل اسکول اور نو ودے ویدیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام نہیں ہے۔ ان اسکولوں میں ہمارے بچے آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔

■

Khatab Alam Shaaz
Osman Manzil, H/No. 387/1/166
Sthirpara Road West, Purbasha
PO-Kankinara,
Distt. North 24 Parganas, 743126, (West Bengal)
Mob.: 8777536722

تاریخ

امرین عزیز

ایران کے صفوی سلاطین اور ان کے اجداد

صفی الدین نے بچپن میں مذہبی علوم کی تحصیل کی اس کے بعد کسب فیض کے لیے شیخ تاج الدین زاہد گیلانی کے پاس گئے اور ان کے ہاتھوں پر بیعت کی اور ان کی بیٹی سے نکاح کیا۔ 700ھ میں شیخ زاہد کا انتقال ہوگیا اور شیخ صفی الدین ان کی جگہ مقام ارشاد پر فائز ہوئے۔ شیخ زاہد کے تمام مریدین شیخ صفی الدین کے اردگرد جمع ہوگئے اور کسب فیض کرنے لگے تعلیم و ارشاد کی بدولت وہ مرجع خلائق بن گئے۔ لوگ جوق در جوق ان کے ہاتھ پر بیعت کرتے اور اس زمانے کے تمام اکابر ان کا بہت احترام کرتے تھے۔ ان میں سے خواجہ رشیدالدین فضل اللہ اور اس کے صاحب زادہ خواجہ غیاث الدین محمد کانام خاص طور سے قابل ذکر ہے۔

ایران میں آل تیمور کے زوال کے بعد ترکمانوں کا سورج طلوع ہورہا تھا۔ ان کے دو قبیلے بہت طاقتور تھے۔ ایک قراقویلنو قبیلے کے ترکمان جن کے سردار قرامحمد اور قرایوسف تھے دوسرے آق قویونلو جو قرایوق عثمان اور اوزون حسن کے وفادار تھے۔ ان قبائل نے 780ھ سے 908ھ (1378 سے 1502) تک حکومت کی۔ تیموری خاندان کا آخری حکمران ابوسعید تیموری اوزون حسن کے ہاتھوں مارا گیا۔ اوزون حسن نے قراقویلنو ترکمانوں کو بھی شکست دی اور آذربائیجان اور عراق کو مغلوب کرلیا اسی دوران شاہ اسماعیل صفوی نے اس کی پیش قدمی کو روک دیا۔ ان قبائلیوں کی حکومت ایران کے لیے انتہائی مصیبت خیز تھی۔ دوسری طرف عثمانی ترک بھی ایران کو اپنے تصرف میں لانے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ اسی دوران ایک روحانی پیشوا صفی الدین اردبیلی کے خاندان سے ایک مذہبی رہنما اور صاحب شمشیر شخص اسماعیل اٹھا اور اپنے سرفروش مریدین قزلباشوں کی مدد سے ایران پر اپنی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہوگیا اور اپنے مورث اعلیٰ شیخ صفی الدین کے نام کی نسبت سے صفوی حکومت کی بنیاد رکھی۔

اصل ونسب صفوی

بیشتر مورخین نے لکھا ہے کہ صفوی خاندان کا نسب حضرت امام موسیٰ کاظم سے ملتا ہے امام موسیٰ کاظم کے فرزندوں میں سے ایک محمد معروف بہ حمزہ ان کے جد امجد تھے۔[1] لیکن عباس اقبال آشتیانی اور حسن پیرنیا اس خیال سے متفق نہیں ہیں ان کا کہنا ہے کہ شاہ اسمٰعیل صفوی اور شاہ طہماسپ سے پہلے لکھی گئی تاریخ کی کتابوں میں صفوی خاندان کی نسبت امام موسی کاظم سے نہیں ملتی ہے:

''مورخین عہد صفویہ این سلاطین را از طرف پدر بامام موسی کاظم منتسب نمودہ ونسب نامہ ای نیز جہت ایشان ساختہ اند۔ اما این نسبت ہیچ وقت مسلم نیست و در کتبی کہ قبل از عہد شاہ طہماسپ اول و در ایام شاہ اسمٰعیل و اجداد او نوشتہ شدہ وجود ندارد۔''[2]

ترجمہ: عہد صفویہ کے مورخین نے ان سلاطین کو باپ کی طرف سے امام موسی کاظم سے منسوب کیا ہے اور ان لوگوں کے لیے نسب نامہ بھی تیار کیا ہے۔ لیکن یہ نسبت کبھی بھی تسلیم نہیں کی گئی ہے۔ وہ کتابیں جو شاہ طہماسپ اول کے زمانے سے پہلے اور شاہ اسمٰعیل کے زمانے میں اور ان کے اجداد کے بارے میں لکھی گئی ہیں، کوئی وجود نہیں ہے۔

تاریخ کی کتابوں میں مذکور ہے کہ صفوی خاندان کا قدیم ترین شخص فیروزشاہ زرین کلاہ تھا جو اردبیل میں حکومت کرتا تھا اور رشد و ہدایت میں بھی مشغول تھا۔[3]

فیروزشاہ زرین کلاہ کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا عوض الخواص معروف بہ محمد حافظ اس کا جانشین ہوا لیکن اس کے حالات دستیاب نہیں ہیں۔ محمد حافظ کے انتقال کے بعد صلاح الدین رشید اور اس کے بعد قطب الدین مقام ارشاد پر فائز ہوئے قطب الدین کے بیٹے امین الدین جبرائیل اس خاندان کے معروف شخص تھے جو لوگوں کو پرہیزگاری اور دین اسلام کی اشاعت کی ترغیب دیتے تھے شیخ صفی الدین اسی امین الدین جبرائیل کے بیٹے تھے جن کی ولادت 650ھ میں اردبیل میں ہوئی۔

صفی الدین نے بچپن میں مذہبی علوم کی تحصیل کی اس کے بعد کسب فیض کے لیے شیخ تاج الدین زاہد گیلانی کے پاس گئے اور ان کے ہاتھوں پر بیعت کی اور ان کی بیٹی سے نکاح کیا۔ 700ھ میں شیخ زاہد کا انتقال ہوگیا اور

شیخ صفی الدین ان کی جگہ مقام ارشاد پر فائز ہوئے۔ شیخ زاہد کے تمام مریدین شیخ صفی الدین کے اردگرد جمع ہوگئے اور کسب فیض کرنے لگے تعلیم وارشاد کی بدولت وہ مرجع خلائق بن گئے۔ لوگ جوق در جوق ان کے ہاتھ پر بیعت کرتے اور اس زمانے کے تمام اکابر ان کا بہت احترام کرتے تھے۔ ان میں سے خواجہ رشید الدین فضل اللہ اور اس کے صاحب زادہ خواجہ غیاث الدین محمد کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے۔[4]

735ھ میں شیخ صفی الدین کا اردبیل میں انتقال ہوگیا۔ صفی الدین کے بعد ان کے بیٹے صدرالدین (704-794ھ) نے ان کی جگہ تعلیم وارشاد کی مسند سنبھالی۔ ان کے مقام و مرتبے کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ امیر تیمور ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں۔ انھوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ دیار بکر سے جو ترک قیدی بنا کر لائے گئے ہیں انھیں رہا کردیا جائے۔ چنانچہ امیر تیمور نے ان کی یہ خواہش پوری کردی ترکوں نے رہائی پاکر ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ ان کے مرید ہوئے اور صوبہ گیلان میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ آگے چل کر یہی ترک اور ان کے لواحقین صفوی حکومت قائم کرنے میں مددگار رہے۔[5]

شیخ صدرالدین کچھ عرصے تک ملک اشرف چوپانی کی قید میں رہے۔ رہائی کے بعد اردبیل سے ہجرت کرکے گیلان چلے گئے۔ ملک اشرف کو جانی بیگ نے 758ھ میں قتل کردیا۔ اسی بادشاہ کی درخواست پر آذربائیجان چلے گئے اور دوبارہ اردبیل میں مقیم ہوئے۔ 796ھ میں ان کا انتقال ہوگیا۔

صدرالدین کے انتقال کے بعد ان کی وصیت کے مطابق ان کے بیٹے خواجہ علی کو مسند ارشاد ملی۔ وہ 26 سال تک اس مقام پر متمکن رہے۔ اس دوران امیر تیمور نے تین بار اس سے ملاقات کی۔[6] خواجہ علی معروف بہ سلطان علی زندگی کے آخری ایام میں مکہ تشریف لے گئے۔ واپسی میں بیت المقدس میں ان کا انتقال ہوگیا۔[7]

سلطان علی کے انتقال کے بعد ان کے صاحب زادے سلطان ابراہیم معروف بہ شیخ شاہ ان کے جانشین مقرر ہوئے۔ 851ھ میں انھوں نے اس جہان فانی کو الوداع کہا۔ ان کے بیٹے شیخ جنید ان کے جانشین ہوئے۔ ان کا حلقۂ ارادت بے حد وسیع ہوگیا اور ان کے اثر ورسوخ، جاہ وجلال اور شہرت اور مقبولیت کو دیکھ کر شہزادہ جہان شاہ قراقویونلو اپنے لیے خطرہ محسوس کرنے لگا اور انھیں اردبیل سے نکل جانے کا حکم دیا۔ سلطان جنید اپنے تمام مریدوں کے ساتھ دیار بکر چلے گئے اور وہاں آق قویونلو خاندان کے امیر اوزون حسن نے ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا اور عزت و احترام سے پیش آیا اور اپنی بہن خدیجہ بیگم کو ان کی زوجیت میں دے دیا۔[8]

سلطان جنید کچھ عرصے بعد اردبیل چلے گئے۔ جہان شاہ کو جب اس واقعے کی اطلاع ملی تو وہ ان کی سرکوبی کے لیے روانہ ہوا۔ سلطان جنید بھی اپنے دس ہزار مریدوں کے ساتھ اس سے مقابلے کے لیے شیروان کے لیے روانہ ہوگئے۔ حاکم شیروان سلطان خلیل اور شیخ جنید کے درمیان جنگ میں 860ھ میں سلطان جنید مارے گئے ان کی جگہ ان کے فرزند سلطان حیدر ان کے جانشین ہوئے، 872ھ میں اوزون حسن نے جہان شاہ کو شکست فاش دی۔ اوزون حسن نے اپنی بیٹی علم شاہ یا عالم شاہ کی شادی سلطان حیدر سے کردی جو یونانی ملکہ مارتھا کے بطن سے تھی۔[9]

شیخ حیدر کے تین فرزند ہوئے جن کے نام سلطان علی، ابراہیم مرزا اور شاہ اسماعیل ہیں۔ سلطان حیدر نے اپنے باپ کے خون کا انتقام لینے کے لیے اپنے سرفروش ترک مریدوں کی مختصر سی فوج تیار کی اور اتباع کا حکم دیا کہ ترکی ٹوپی کی جگہ بارہ گوشے والی سرخ رنگ کی ٹوپی اپنے سر پر اوڑھیں جو شیعوں کے بارہ اماموں کی علامت ہے۔ اسی وجہ سے یہ جماعت 'قزلباش' یا سرخ سر کے نام سے مشہور ہوئی۔

''شیخ حیدر اتباع خود را امر داد تا بجای کلاہ ترکی کلاہ سرخ رنگ (تاج دوازدہ ترک) بر سر گذارند و دوازدہ ترک رمز 'دوازدہ امام است' از ھمین جہت این جماعت موسوم بہ 'قزلباش' یا سرخ سر گشتند''[10]

ترجمہ: شیخ حیدر نے اپنی پیروی کرنے والوں یعنی مریدین کو حکم دیا کہ ترکی ٹوپی کی جگہ سرخ رنگ کی ٹوپی (بارہ ترکوں کا تاج) سر پر پہنیں اور بارہ ترک 'بارہ امام' کی علامت ہے۔ اسی وجہ سے یہ جماعت 'قزلباش' یا سرخ سر کے نام سے موسوم ہوئی۔

اپنے مریدوں کے ساتھ اپنے باپ سلطان جنید کا بدلہ لینے کے لیے عازم شیروان ہوئے۔ شیروان شاہ میں مقابلے کی طاقت نہ تھی۔ اس نے اوزن حسن کے بیٹے یعقوب آق قویونلو سے مدد مانگی۔ دربند کے نزدیک 893ھ میں شدید جنگ میں سلطان حیدر مارے گئے[11]۔

سلطان حیدر کے قتل کے بعد اوزون حسن کے بیٹے امیر یعقوب نے ان کے تینوں بیٹوں علی، ابراہیم اور اسماعیل کو کسی خدشے کی بنا پر فارس کے قلعۂ اصطخر میں قید کردیا۔ امیر یعقوب کی موت کے بعد آق قویونلو ترکمانوں کی حکومت اس کے بیٹے بایسنقر کو ملی لیکن کچھ لوگوں نے اس کی مخالفت کی اور اس کے چچازاد بھائی رستم مرزا کے پاس جمع ہوئے۔ بایسنقر نے اس شورش کو دبانے کے لیے شیروان شاہ سے مدد مانگی۔ رستم مرزا میں بایسنقر سے مقابلے کے لیے طاقت نہ تھی۔ اس نے سلطان حیدر کے بیٹوں کو قید سے رہا کردیا اور بایسنقر سے جنگ کے لیے بھڑکایا۔ اس نے سلطان علی کو تبریز بلایا اور بہت ہی عزت واحترام سے

شاہ اسماعیل صفوی نے ان سرفروش قزلباشوں کی ایک فوج تیار کی جن کی تعداد تقریبا سات ہزار تھی۔ ان قزلباشوں کے ساتھ وہ اپنی والدہ کے دیدار اور اپنے آباواجداد کے مقابر کی زیارت کی غرض سے اردبیل پہنچے۔ وہاں سے شیروان ہوتے ہوئے شمال میں اپنے باپ کے قاتل شیروان شاہ کو دھکدہ گلستان میں شکست دی اور قتل کرڈالا اور باکو شہر پر بھی قبضہ کرلیا۔

پیش آیا اور بایسنقر سے جنگ کے لیے روانہ کیا۔ سلطان علی نے 'اھر' کے مقام پر بایسنقر کو شکست دی اور اسے مارڈالا۔ رستم اگر چہ بایسنقر کے شر سے نجات پا گیا لیکن وہ سلطان علی سے خوف زدہ ہوگیا اور اسے ٹھکانے لگانے کی تدبیریں کرتا رہا۔[12]

سلطان علی کو اس کی اطلاع مل گئی۔ 898ھ میں رستم بیگ نے انھیں دربار میں حاضر ہونے کا حکم دیا سلطان علی خوف زدہ ہوکر اردبیل کی طرف نکل بھاگے لیکن دشمنوں نے اسے گرفتار کرلیا اور 900ھ میں وہ مارے گئے۔ ابراہیم اور اسماعیل راہ فرار اختیار کر کے گیلان پہنچ گئے۔ اسی دوران ابراہیم بھی موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔[13]

لیکن ژنرال سر پرسی سائیکس کے بقول ابراہیم مرزا اور اسماعیل گیلان پہنچنے میں کامیاب ہوگئے لیکن وہاں پہنچ کر ابراہیم کا انتقال ہوگیا۔[14]

شاہ اسماعیل صفوی کو حضرت علیؓ کے گھرانے سے بڑی عقیدت تھی۔ وہ دینی رہنما ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب شمشیر بھی تھے اس لیے اہل ایران ان کی اطاعت کے لیے پروانہ وار بڑھے۔ 905ھ کے اوائل میں مختلف مقامات مثلاً آذربایجان، اران، ارمنستان اور دیگر مقامات سے ترکوں کے سات 'ے' قبائل، شاملو، استاجلو، قاچار، تکلو، ذوالقدر، افشار اور روملو شاہ اسماعیل کے پرچم تلے جمع ہوگئے جو اپنے پیشواؤں کی تقلید میں 12 گوشے کی سرخ ٹوپی پہننے کی وجہ سے قزلباش کہلاتے تھے۔ یہ قزلباش شیعہ عقائد کے پیرو تھے اور شیعیت کے نام پر مرمٹنا اپنا مقدس فرض سمجھتے تھے۔

شاہ اسماعیل صفوی نے ان سرفروش قزلباشوں کی ایک فوج تیار کی جن کی تعداد تقریباً سات ہزار تھی۔ ان قزلباشوں کے ساتھ وہ اپنی والدہ کے دیدار اور اپنے آباواجداد کے مقابر کی زیارت کی غرض سے اردبیل پہنچے۔ وہاں سے شیروان ہوتے ہوئے شمال میں اپنے باپ کے قاتل شیروان شاہ کو دبکدہ گلستان میں شکست دی اور قتل کرڈالا اور باکو شہر پر بھی قبضہ کرلیا۔ فتح سے سرشار ہوکر اسماعیل نے آق قویونلو شہزادہ الوند بیگ ترکمان کو 907ھ میں آذربائیجان میں نخچوان کے نزدیک شرور کے مقام پر شکست دی اور تبریز کو بھی فتح کرلیا۔ تبریز میں اس نے اپنی بادشاہت کا اعلان کردیا۔ تاج پوشی کے مراسم ادا کیے اور اپنے مورث اعلیٰ شیخ صفی الدین اردبیلی کے نام کی نسبت سے صفوی حکومت کی بنیاد رکھی۔ اس نے تبریز کو اپنا پایہ تخت قرار دیا۔ اپنے نام کا سکہ جاری کیا اور اثنا عشری شیعہ مذہب کو سرکاری مذہب قرار دیا۔[15]

شاہ اسمٰعیل صفوی کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا شاہ طہماسپ تخت پر بیٹھا۔ اس نے ترکوں سے صلح کرلی اور آپسی اختلاف دور ہوگئے۔ ازبکوں اور ترکمانوں سے بھی وہ بر سر پیکار رہا اور انہیں شکست دے کر ایران سے مار بھگایا اور حدود سلطنت کو بھی وسیع کیا۔ اس نے اپنا دارالخلافہ تبریز سے قزوین منتقل کیا۔ اس کے زمانے کا ایک اہم واقعہ مغل بادشاہ ہمایوں کا سفر ایران ہے جو شیر شاہ کے ہاتھوں شکست کھاکر ایران کا رخ کیا اور شاہ کی کمک سے دوبارہ اپنی کھوئی ہوئی سلطنت کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔اس طرح دونوں ملکوں کو ایک دوسرے کے قریب آنے کا موقع ملا۔

شمال مغربی ایران فتح کرنے کے بعد شاہ اسماعیل نے خراسان کا رخ کیا جہاں ازبیک حکمران شیبانی خان کی حکومت تھی۔ سمرقند، بخارا، تاشقند، فرغانہ وغیرہ اس کے ماتحت تھے۔ 26 شعبان 916ھ میں شاہ اسماعیل صفوی نے مرو کے قلعے پر حملہ کردیا۔ اس معرکے میں شیبانی خان مارا گیا۔ یکے بعد دیگرے ماوراء النہر کے تمام علاقے کو صفوی سلطنت میں شامل کرلیا گیا۔ شاہ اسماعیل صفوی کی فتوحات کا سلسلہ جاری رہا اور کچھ ہی عرصے میں اس نے عراق، فارس، کرمان، ہمدان، خراسان اور خوارزم تک کے علاقے کو فتح کرلیا۔

حکومت عثمانی اہل سنت کا طرفدار تھا شاہ اسماعیل صفوی کی پیش قدمی کو روکنے کے لیے عثمانی سلطان سلیم اول نے آذربائیجان پر حملہ کردیا۔ 920ھ میں چالدران کے مقام پر شاہ اسماعیل صفوی کو شکست کا سامنا کرنا پڑا اور اسے فرار ہونا پڑا۔ لیکن یہ شکست دیرپا ثابت نہیں ہوئی اور چالدران کی تلافی شاہ اسماعیل نے ارمنستان اور گرجستان کو فتح کرنے کے بعد کردی اس طرح شاہ اسماعیل نے ایران کے بیشتر علاقے کو مسخر اور متحد کر کے 930ھ مطابق 1544 میں 38 سال کی عمر میں وفات پائی۔

شاہ اسمٰعیل صفوی کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا شاہ طہماسپ تخت پر بیٹھا۔ اس نے ترکوں سے صلح کرلی اور آپسی اختلاف دور ہوگئے۔ ازبکوں اور ترکمانوں سے بھی وہ برسر پیکار رہا اور انھیں شکست دے کر ایران سے مار بھگایا اور حدود سلطنت کو بھی وسیع کیا۔ اس نے اپنا دارالخلافہ تبریز سے قزوین منتقل کیا۔ اس کے زمانے کا ایک اہم واقعہ مغل بادشاہ ہمایوں کا سفر ایران ہے جو شیر شاہ کے ہاتھوں شکست کھاکر ایران کا رخ کیا اور شاہ کی کمک سے دوبارہ اپنی کھوئی ہوئی سلطنت کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ اس طرح دونوں ملکوں کو ایک دوسرے کے قریب آنے کا موقع ملا۔

شاہ طہماسپ کے انتقال کے بعد اس کے محبوس شہزادے اسمٰعیل دوم کو قید سے باہر نکال کر 984ھ / 1576 میں تخت نشین کیا گیا۔ وہ ایک عیاش اور خونخوار شخص تھا۔ اس کی تعلیم وتربیت ہرات میں سنی عقائد کے مطابق ہوئی تھی۔ اس نے شیعیت کی جگہ اہل سنت والجماعت کو اہمیت دینی شروع کی۔ عنان حکومت سنبھالتے ہی اس نے شہزادوں اور امرا کو قتل کروادیا۔ اپنے بھائی سلطان محمد میرزا اور بیٹے عباس میرزا کو بھی قتل کروانا چاہتا تھا کہ اسی دوران کثرت شراب نوشی کی وجہ سے 17 رمضان 985ھ کو چل بسا۔

شاہ اسمٰعیل دوم کی موت کی خبر سن کر اس کا بھائی سلطان محمد میرزا 25 رمضان 985ھ کو شیراز میں اپنے بھائی کی جگہ تخت پر بیٹھا اور 2 شوال کو قزوین میں داخل ہوکر خدابندہ کا لقب اختیار کیا۔ دوسری طرف امرائے خراسان نے اس کے بیٹے عباس میرزا کی بادشاہت کا اعلان کردیا۔ یہ وہی عباس ہے جو تاریخ میں عباس اعظم کے نام سے مشہور ہے۔ بالآخر دس سال کی حکومت کے بعد خدابندہ 996ھ / 1587 میں اپنے بیٹے کے حق میں حکومت سے دستبردار ہوگیا اور شاہ عباس اس کا جانشین ہوا۔

تخت نشین ہونے کے بعد شاہ عباس نے ایرانی سلطنت کو ایسی قوت اور عظمت عطا کی جو اس سے پہلے اس کو نصیب نہ ہوئی تھی۔ اس نے ازبکوں کو خراسان سے نکال باہر کیا۔ ترکوں کو مختلف مقامات پر شکست دی۔ عراق اور آذربائیجان پر دوبارہ تصرف قائم کیا۔ انگریزوں کی مدد سے جزیرہ ہرمز پرتگالیوں سے واپس لیا۔ قزلباش سرداروں کو متحد کر کے ایک نئے گروہ 'شاہسون' یعنی 'دوست شاہ' تشکیل کی اور خود اس کا رہنما مقرر ہوا۔ اس نے اپنا دارالخلافہ قزوین سے اصفہان منتقل کیا اور 'اصفہان نصف جہان' کے نام سے مشہور ہوا۔ فن تعمیر، صنعت و حرفت، نقاشی وغیرہ کے اعتبار سے اس سے زیادہ زرخیز اور خوشحال دور کی نظیر نہیں ملتی۔ 1038ھ / 1628 میں مازندران میں اس کا انتقال ہوا۔

شاہ عباس کے بعد اس کی وصیت کے مطابق اس کا پوتا اور تذکرہ تحفۂ سامی کے مؤلف سام میرزا صفوی کا بیٹا شاہ صفی تخت نشین ہوا۔ اس نے 1038ھ سے 1052ھ (1628 سے 1642) تک فرمانروائی کی۔ وہ ایک ظالم شخص تھا اور امرا اور وزرا کی ایذا رسانی کا بہت شوق تھا۔

اس کی عدم توجہی کی وجہ سے ایران کے کئی علاقے اس کے ہاتھ سے نکل گئے اور عثمانی ترکوں سے بھی اس کا نزاع رہا۔ بالآخر دونوں کے درمیان صلح ہوگئی اور بغداد ترکوں کے حوالے کردیا گیا۔ کثرت شراب نوشی کے اثر سے 2 صفر 1052ھ کو کاشان میں اس کا انتقال ہوگیا اور قم میں سپرد خاک کردیا گیا۔

شاہ صفی کے بعد اس کا بیٹا شاہ عباس دوم 1052ھ / 1642 میں تخت پر بیٹھا وہ ایک عدل پسند اور رعایا پرور بادشاہ تھا۔ اسی کے زمانے میں مغل شہنشاہ جہانگیر کے حکم پر اس کے جانشین شاہجہاں نے قندھار کو فتح کیا اور روس کے زار نے بھی ایرانی حدود کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی اور داغستان (چیچنیا) اور گرجستان (جارجیا) پر قبضہ کرلیا اور ایرانی سرحدوں کو غیر محفوظ کردیا۔ 24 ربیع الاول 1077ھ / 1666 کو دامغان میں اس کا انتقال ہوگیا اور قم میں تدفین ہوئی۔

شاہ عباس دوم کے بعد اس کے بیٹے شاہ صفی دوم نے 1077ھ سے 1105ھ / 1666 سے 1693 تک حکومت کی جسے شاہ سلیمان کے نام سے جانا جاتا ہے۔ وہ انتہائی ضعیف النفس اور عیاش حکمراں تھا۔ ملکی امور سے غافل ہوکر عورتوں اور خواجہ سراؤں کے درمیان زیادہ وقت گذارتا تھا۔ ناتجربہ کاری اور ظلم و ستم کی وجہ سے سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا۔ اس کے عہد حکومت کی سب سے خاص بات یہ تھی کہ ایران کے ہمسایہ ممالک نے اپنی داخلی کمزوری کے سبب کوئی مداخلت نہیں کی بلکہ خارجی ممالک سے تجارتی روابط مستحکم ہوئے۔

شاہ صفی دوم کے بعد اس کا بڑا بیٹا سلطان حسین میرزا باپ کی جگہ 1105ھ / 1666 میں تخت پر بیٹھا۔ اس کی تخت نشینی کے بعد سے صفویوں کی تباہی و بربادی کا آغاز ہوگیا۔ اس سے سب سے بڑی غلطی یہ سرزد ہوئی کہ اس نے شاہنواز خان گرجی کو قندھار کی حکومت عطا کی جس سے افغان باغی ہوگئے اور صفوی سلطنت کے زوال کا سبب بنے۔ ان میں سب سے خطرناک غلزائیوں اور ابدالیوں کی بغاوت تھی۔ غلزائی سردار ملک محمود صفاری سیستانی نے مشہد میں آزادی کا پرچم لہرایا اور ابدالی سردار عبداللہ خان نے ہرات پر قبضہ کرلیا۔ ملک محمود سیستانی نے ہرات پر لشکرکشی کی اور عبداللہ خان اور اس کے بیٹے اسد اللہ خان کو قتل کرڈالا۔ اس کے بعد ملک محمود نے کرمان فتح کیا اور وہاں سے آگے بڑھ کر اصفہان کا محاصرہ کرلیا۔ سلطان حسین نے اپنے بیٹے طہماسپ کو کمک کے لیے قزوین روانہ کیا۔ اس دوران اصفہان میں سخت قحط پڑا۔ چار ماہ تک محصور رہنے کے بعد سلطان حسین قلعے سے باہر آیا اور فرخ آباد کے مقام پر خود کو محمود سیستانی کے حوالے کردیا۔ سلطان حسین کو قید کرلیا گیا اور 12 محرم 1135ھ / 1722 کو ملک محمود اصفہان میں داخل ہوا اور چہل ستون میں سلطان حسین کی جگہ تخت پر بیٹھا۔

دوسری طرف جب سلطان حسین کے بیٹے طہماسپ کو اس کی خبر ملی تو اس نے افغانوں سے مقابلہ کرنے کی ٹھان لی۔ ملک محمود نے قزوین پر تصرف قائم کرنے کے لیے ایک لشکر روانہ کیا۔ اہل قزوین نے سخت مقابلہ کیا اور بہت سے افغان سرداروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا لیکن اس کا انجام بہت ہی عبرتناک ہوا۔ ملک محمود نے آگ بگولہ ہوکر قتل عام کا حکم دیا۔ خوفزدہ ہوکر طہماسپ تبریز بھاگ گیا۔ اصفہان میں ہی ایک دن میں 114 ایرانی امرا اور خاندان صفویہ کے 31 نفر کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اس سانحہ کے بعد ملک محمود زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہ پایا۔ اس کے چچازاد بھائی اشرف نے 1137ھ / 1725 میں اپنے باپ عبداللہ کے قتل کے قصاص میں ملک محمود کو مار ڈالا اور خود بادشاہ بن بیٹھا۔

طہماسپ میرزا نے اپنی حکومت کی بحالی کے لیے ملک محمود کے خلاف نادر قلی خان سے مدد مانگی۔ نادر ملک محمود کی ملازمت میں رہ چکا تھا۔ لیکن اختلافات کے باعث ملک محمود، نادر (نادر شاہ) کو قتل کرنا چاہتا تھا لیکن وہ وہاں سے بھاگنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ نادر نے طہماسپ میرزا کی درخواست قبول کرلی اور مقابلے کے لیے اصفہان کی طرف چل پڑا۔ اس دوران ملک محمود کا قتل ہوگیا۔ نادر نے طہماسپ میرزا کی طرفداری میں اصفہان کے دروازے پر اشرف افغان کو شکست دی لیکن طہماسپ کے اصفہان میں داخل ہونے سے پہلے افغانوں نے سلطان حسین کو قتل کرڈالا۔ نادر کی مدد سے طہماسپ دوم کی تاجپوشی عمل میں آئی اور قندھار میں ایک بلوچ سردار نے اشرف کو ہلاک کردیا۔ اس طرح صفویوں کی کھوئی ہوئی سلطنت دوبارہ بحال ہوئی اور ایران میں آخری افغان حکمراں کا دور ختم ہوا۔

طہماسپ دوم کی حکومت دیر پا ثابت نہیں ہوئی۔ اگرچہ اس نے نادر کو اپنا سپہ سالار اعظم مقرر کیا اور طہماسپ قلی خان کے لقب سے سرفراز کیا۔ اس نے ایران کے بیشتر کھوئے ہوئے علاقوں کو واپس لے لیا لیکن شاہ طہماسپ دوم کی نااہلی اور ناعاقبت اندیشی کی وجہ سے نادر بدظن اور برہم ہوگیا۔ شاہ نے نادر کی غیر موجودگی میں عثمانی ترکوں اور روسیوں سے معاہدہ کرلیا اور کچھ مفتوحہ علاقے ان کے سپرد کردیے گئے۔ نادر ان معاہدوں سے غضبناک ہوگیا اور ایرانی امرا اور بزرگوں کی موجودگی میں شاہ طہماسپ دوم کو معزول کردیا گیا۔ 1145ھ / 1731 میں شاہ کے شیر خوار بیٹے عباس سوم کی بادشاہت کا اعلان کردیا گیا اور خود نادر نائب السلطنت بن بیٹھا۔ پس پردہ ایران کی حکومت اس کے ہاتھوں میں چلی گئی اور خود ملک کے انتظام و انصرام میں منہمک ہوگیا اور سرحدوں کو متعین کیا۔ امرا اور عمائد کی موجودگی میں اس نے حکومت سے دستبرداری کی خواہش ظاہر کی لیکن سب نے متفقہ طور پر 24 شوال 1148ھ کو نادر کے سر پر تاج شاہی رکھا۔ اب اس نے طہماسپ قلی خان کے لقب کو چھوڑ کر نادر السلطان یا نادر شاہ کا لقب اختیار کیا۔ تخت پر بیٹھتے ہی اس نے طہماسپ دوم اور اس کے بیٹے عباس سوم کو سبزوار بھیج دیا جہاں بعد میں نادر شاہ کے بیٹے رضا قلی میرزا نے طہماسپ دوم اور عباس میرزا کو قتل کروادیا اور صفویوں کا چراغ ہمیشہ کے لیے گل ہوگیا۔

منابع و حواشی

1 تاریخ دہ ہزار سالہ ایران، عبدالعظیم رضا۔ جلد سوم، ص 357

2 عباس اقبال آشتیانی: تاریخ مفصل ایران، کتاب خانہ خیام، تہران، ص 662

ایضاً (تاریخ ایران، حسن پیرنیا۔ ص 662

3 تاریخ دہ ہزار سالہ ایران، عبدالعظیم رضا۔ جلد سوم، ص 357

4 تاریخ ایران، حسن پیرنیا۔ ص 661

5 مقبول بیگ بدخشانی، ادب نامہ ایران، ص 612

6 تاریخ ایران، حسن پیرنیا۔ ص 661

7 تاریخ دہ ہزار سالہ ایران، عبدالعظیم رضا۔ جلد سوم، ص 308

8 تاریخ دہ ہزار سالہ ایران، عبدالعظیم رضا۔ جلد سوم، ص 308

ایضاً۔ تاریخ ایران، حسن پیرنیا۔ ص 664

9 عباس اقبال آشتیانی: تاریخ مفصل ایران، کتاب خانہ خیام، تہران، ص 662

10 عبداللہ رازی: تاریخ ایران، چاپخانہ اقبال، تہران 1317، ص 539

11 تاریخ دہ ہزار سالہ ایران، عبدالعظیم رضا۔ جلد سوم، ص 309

ایضا عباس اقبال آشتیانی: تاریخ مفصل ایران، کتاب خانہ خیام، تہران، ص 662

12 عبداللہ رازی: تاریخ ایران ص 540-539

13 عباس اقبال آشتیانی: تاریخ مفصل ایران، کتاب خانہ خیام، تہران، ص 662

14 تاریخ ایران، جلد دوم، سرپرسی سائیکس، فارسی ترجمہ فخر داعی گیلانی، دنیای کتاب، تہران۔ 1368، ص 227

ایضا: مرزا مقبول بیگ بدخشانی، ادب نامہ ایران، لاہور، ص 613)

15 عباس اقبال آشتیانی: تاریخ مفصل ایران، کتاب خانہ خیام، تہران، ص 663

■

Dr. Amreen aziz
Dept. of Persian
Aligarh Muslim University
Aligarh- 202001 (UP)

محمد امان اے کے

زلیخا حسین

محرومیت میں امید کا استعارہ

زلیخا حسین ایک ایسا نام ہے جو ایک عرصے تک پردۂ خفا میں رہا اور جسے پہچان بہت بعد کے زمانے میں ملی۔ کیرلا جیسی ریاست میں، جہاں اردو بولنے والوں کی تعداد 15,000 سے زیادہ نہیں، کسی کا اردو فکشن لکھنا، اس کی اشاعت ہونا اور اس کا مقبول ہونا بڑے تعجب کی بات ہے۔ مجھے زلیخا حسین کے متعلق سب سے زیادہ ڈاکٹر شمس الدین ترورکاڈ کے اردو اور ملیالم مضامین سے علم ہوا۔ اس کے بعد اپریل 2012، کے اردو دنیا میں شائع گلشن خطائی کاشمیری کا انٹرویو بھی نظر سے گزرا جس میں انھوں نے زلیخا حسین کی نجی زندگی اور تحریروں کے بارے میں مختصر گفتگو پیش کی ہے۔ ان تمام معلومات کی روشنی میں زلیخا حسین کا مختصر خاکہ پیش کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے، تاکہ جن لوگوں کے لیے یہ نام اجنبی ہے، وہ واقف ہوجائیں۔

زلیخا، جو گھر میں زلیخا بائی اور ادب کی دنیا میں زلیخا حسین کے نام سے پہچانی جاتی ہیں، کیرلا کے شہر کوچین میں سن 1930 میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد حاجی عبداللہ احمد سیٹھ سیاسی و سماجی کارکن تھے۔ زلیخا حسین جب 12 برس کی تھیں تب ان کے سر سے والد کا سایہ اٹھ گیا۔ تقریباً ایک سال بعد ہی والدہ انتقال کرگئیں۔ بعد ازاں ان کی پرورش ان کے نانا جانی سیٹھ اور نانی آسیہ بائی نے کی۔ ان کا خاندان کچھی میمن برادری سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ لوگ تقریباً تین سو سال پہلے گجرات سے بسلسلۂ تجارت کیرلا آئے اور یہیں مقیم ہوگئے۔ یہ لوگ صرف تجارت ہی نہیں بلکہ دینی، اصلاحی اور سماجی کام بھی کرتے تھے، جس کے پیش نظر انھوں نے کئی اسکول، کالج، یتیم خانے بھی بنوائے۔ انھیں کے قائم کردہ ایک زنانہ مدرسہ آسیہ بائی میں زلیخا حسین نے قرآن، حدیث، دینیات اور ملیالم کے ساتھ ساتھ اردو کی بھی تعلیم حاصل کی۔ ان کے نانا کو شعر و شاعری کا شوق تھا اور شوق تخلص کرتے تھے۔ گھر میں ادبی ماحول ہونے کی وجہ سے زلیخا حسین میں بھی اردو ادب کے مطالعے کا ذوق پیدا ہوا۔

1945 میں محمد حسین سیٹھ کے ساتھ شادی نے ان کی تخلیقی زندگی کو جلا بخشی۔ شوہر کی حوصلہ افزائی کی وجہ سے انھیں کافی ہمت ملی اور انھوں نے یکے بعد دیگرے 28 ناول اور 8 منی ناول تخلیق کیے۔ اس کے علاوہ انھوں نے کئی افسانے بھی لکھے جو مختلف ادبی رسالوں، مثلاً خاتونِ مشرق اور شمع وغیرہ میں شائع ہوئے لیکن بدقسمتی سے ایک بھی دستیاب نہیں۔ ان کا پہلا ناول 'میرے صنم' 1950 میں دہلی کے چمن بک ڈپو سے شائع ہوا تھا۔ زلیخا حسین کے کل 28 ناول اور ایک ترجمہ شدہ ناول کا نام ملتا ہے، جو ذیل میں پیش کیے جارہے ہیں:

میرے صنم، آپا، صبا، پتھر کی لکیر، یادوں کے ستم، مارِ آستین، زندگی مسکرائی، وہ ایک فریاد تھی، لہو لہو منجدھار، ایک پھول ہزار غم، آسمان کے تلے، اپنے اور پرائے، بھولنے والے، دشوار ہوا جینا، ایک ہی ڈگر، حسرتِ ساحل، نصیب نصیب کی بات، رشتہ کا روگ، شاکرہ، تاریکیوں کے بعد، روح کے بندھن (1969)، ایک خواب ایک حقیقت (1983)، مرجھائی کلی (1985)، اپنا کون (1986)، گر سہارے نہ ملتے (1986)، کل کیا ہو (1988)، آدمی اور سکے (1989)، راہ اکیلی (1989)۔ ان کے ترجمہ شدہ ناول کا نام 'دُنیا سے دور' ہے۔ زلیخا حسین پریم چند، گلشن نندہ اور مہیندر ناتھ جیسے ناول نگاروں کو شوق سے پڑھتی تھیں، جس کا اثر ان کی تحریروں میں صاف جھلکتا ہے۔ گلشن نندہ کی طرح ہی زلیخا حسین کے ناولوں میں بھی عشق و محبت، ہجر و وصال، دھوکا اور فریب، مجبوریاں اور ان سے پیدا ہونے والے انسانی احساسات و اقدار کا نمایاں اظہار ملتا ہے۔ ان کے ناولوں میں خاندانی رشتے، طبقاتی تفریق، انصاف اور ناانصافی کی نہ ختم ہونے والی کشمکش ہر جگہ نظر آتی ہے۔ ان کے ناولوں میں ان کی اپنی زندگی کی محرومیوں، دشواریوں اور مصیبتوں کا عکس بھی ملتا ہے۔

زلیخا حسین کے ناول 'روح کے بندھن' (1969) کا موضوع انسان کے آپسی رشتوں کی سچی تصویر ہے۔ ناول میں انھوں نے انسانی زندگی کے فلسفے کو بہت ہی مختصر اور دل نشیں انداز میں پیش کیا ہے۔ زلیخا حسین کی خوبی یہ ہے کہ ان کا ناول بھلے ہی عشق و محبت کی داستان ہو اور اس میں کرداروں کی پریشانیاں اور دکھ درد کا بیان کتنا بھی کیوں نہ ہو لیکن ناول کا اختتام خوشگوار ہوتا ہے۔ جس کے پیش نظر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ زلیخا حسین اپنی ساری مشکلات اور پریشانیوں کو خدا کے بھروسے چھوڑ کر صبر و ہمت کے ساتھ جینے کی تلقین کرتی ہیں۔ ناول میں گھریلو مسائل، طبقاتی کشمکش، بے جوڑ شادی اور خواتین کے دلوں کے احساسات و جذبات کو انھوں نے بہت ہی خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔

فنی لحاظ سے ناول 'روح کے بندھن' کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انھوں نے اس ناول میں بہت ہی سیدھے سادے پلاٹ کا استعمال کیا ہے۔ پلاٹ میں کوئی پیچیدگی نہیں ہے اس لیے عام قاری کے لیے اس ناول کو پڑھنے اور سمجھنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوتی۔ ناول کے کردار بھی ہمارے آس پاس کی زندگی میں شامل لوگوں کی طرح ہی نظر آتے ہیں۔ ناول کا مرکزی کردار شبانہ ہے، جو چالیس برس کی سمجھدار اور

باہمت عورت ہے۔ ناول کا تانا بانا اسی کردار کی زندگی کے مسائل کے اردگرد گھومتا ہے۔ گھر کی تمام ذمہ داری، اپاہج شوہر کا علاج اور بیٹی کی شادی کا مسئلہ اس کردار کو خوداعتماد اور متحرک بنا دیتا ہے۔ شبانہ کا کردار بچپن سے ہی احساسِ کمتری کا شکار ہے۔ والدہ کے انتقال کے بعد سوتیلی ماں اور سوتیلی بہن کے جبر و استحصال اور حقارت بھری نظر نے اس کے جذبات اور خواہشات کا گلا گھونٹ دیا۔ شبانہ کے اس کردار میں ہم خود زلیخا حسین کی زندگی کا عکس دیکھ سکتے ہیں۔ بھلے ہی ان کے نانا نانی نے ان کی اچھی پرورش کی تھی لیکن کم سنی میں والدین کے کھونے کا غم زلیخا حسین کی زندگی میں ہمیشہ بسا رہا۔ یہی غم ان کے اکثر ناولوں میں رچ بس گیا ہے۔ اس ناول میں بھی مرکزی کردار یتیم ہے اور بار بار اسے اس کی یتیمی کا احساس بھی دلایا جاتا ہے۔

''تیری سالگرہ۔ ہوں۔ منحوس! تو کیا جانے تیری سالگرہ کے ساتھ تیری ماں کی برسی لگی ہوئی ہے۔ دیکھتی نہیں۔ ہر سال یہاں غریبوں، محتاجوں کو کھانا کھلایا جاتا ہے۔ تیری ماں کی روح کو ثواب پہنچایا جائے یا تجھ جیسی منحوس کی پیدائش کی خوشی منائی جائے جس نے دنیا میں آتے ہی ماں کو عدم کی راہ دکھا دی۔''[1]

ایک سچا ادیب اپنی تخلیق کا خمیر اپنے سماج، معاشرے اور ماحول سے تیار کرتا ہے۔ اپنی تخلیق میں وہ سماج کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے۔ اس میں وہ سیاسی، سماجی، اقتصادی، نفسیاتی، دیہی اور شہری مسائل کو پیش کرتا ہے۔ لوگوں کے آپسی تعلقات، نفرت و محبت، دوستی اور دشمنی کو ظاہر کرتا ہے۔ زلیخا حسین نے اس ناول میں انسانوں کے انہی رشتوں کو پیش کیا ہے۔ ناول میں خاندانی ماحول اور آپسی تعلقات کے اظہار کے لیے کئی کرداروں کا استعمال کیا گیا ہے۔ شبانہ کا والد شوکت جو پہلی بیوی کے انتقال کے بعد دوسری شادی کر لیتا ہے اور اپنے کاروبار میں اتنا مشغول ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی یتیم بیٹی کے لیے وقت نہیں نکال پاتا اور نہ ہی اپنی بیٹی سے کبھی شفقت کا اظہار کرتا ہے۔ اسے کبھی اپنی بیٹی کی خواہشوں کا احساس نہیں ہوتا لیکن جب وہ گھر سے بھاگ جاتی ہے تو اسے بڑا صدمہ پہنچتا ہے۔

شبانہ کی سوتیلی ماں عشرت اور سوتیلی بہن انجم اس سے ہمیشہ برا سلوک کرتی ہیں۔ عام کہانیوں اور فلموں کی طرح اس ناول میں بھی سوتیلے رشتے کی کڑواہٹ بڑی ترش نظر آتی ہے۔ اس کے برعکس انجم کا شوہر وحید ایک نیک اور فعال کردار ہے۔ اس کردار کو اس ناول کا ہیرو کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ بھلے ہی شبانہ ناول کی مرکزی کردار ہے لیکن وحید کی کوششوں سے ہی مرکزی کردار کی زندگی میں خوشیاں آتی ہیں۔ اس لیے ہم اس کردار کو ناول کا ہیرو کہہ سکتے ہیں۔ وحید لندن سے تعلیم یافتہ ہے لیکن اس کا دل ہندوستانی ہے اور وہ ہندوستانی تہذیب و ثقافت کا پرستار ہے۔ وہ شبانہ کو بہن کی طرح مانتا ہے اور اس کی زندگی کی مشکلات کے حل کی کوشش میں لگ جاتا ہے۔ وہ اپنی خوشی سے زیادہ دوسروں کی خوشی کا دھیان رکھتا ہے۔ وحید ہی عادل کے علاج، شبانہ اور اس کے والد کے بیچ کی دوری اور شبانہ کی بیٹی کی شادی جیسے مسائل کا حل کرتا ہے۔

عادل، شبانہ کا شوہر ہے۔ عادل بھی شبانہ کی طرح یتیم ہے۔ بچپن میں ہی اس کے سر سے والدین کا سایہ اٹھ چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ شبانہ کے دکھ درد کو بہتر طریقے سے سمجھتا ہے۔ شبانہ بھی اس کے مزاج اور اس کی محنت کی وجہ سے اسے پسند کرنے لگتی ہے۔ شبانہ کی دادی کو دونوں کی شادی سے کوئی اعتراض نہیں لیکن ان کے اچانک مرجانے کی وجہ سے عادل کو شبانہ کے ساتھ بھاگ کر شادی کرنی پڑتی ہے۔ شادی کے کچھ عرصے بعد ایک حادثے میں اپاہج ہونے کی وجہ سے اس کی خوداعتمادی بحال نہیں رہتی جس کی وجہ سے وہ احساسِ کمتری کا شکار ہو جاتا ہے۔ ٹھیک ہونے کی اسے کوئی امید نظر نہیں آتی:

''ہو چکی اب طبیعت اچھی، صحت مند ہونا تو میرے لیے خواب جیسی بات ہے، تیری ماں پگلی ہے، سمجھتی نہیں خواہ مخواہ میرے علاج میں پیسہ برباد کرتی ہے۔''[2]

ناول کے آخر میں وحید کی مدد سے عادل کا علاج ہو جاتا ہے اور وہ نقلی ٹانگ کی مدد سے دوبارہ چلنے پھرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ زلیخا حسین نے اپنے ناولوں میں محرومیوں کے بیان کے ساتھ امید کی کرن بھی جگائی ہے۔ خود زلیخا حسین کی زندگی اس طرح کی کئی محرومیوں سے دوچار تھی۔ 1997 میں شوہر کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے فاروق کے سڑک حادثے میں اپاہج ہونے اور پھر 2006 میں اس کی موت نے انھیں اور ان کے خاندان کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اس کے بعد ان کی 23 سالہ پوتی کا ریل حادثے کا شکار ہونا اور تیسری بیٹی کی نفسیاتی بیماری نے انھیں اپنی عمر کے آخری سالوں میں بہت پریشان رکھا۔ ان سب مصائب و آلام کے باوجود انھوں نے خدا سے امید کا دامن نہیں چھوڑا۔ وہ خدا سے دعا مانگا کرتی تھیں کہ ان کی مریضہ بیٹی کی موت کے بعد ہی انھیں موت آئے، کیونکہ ان کے بعد اس کا اس دنیا میں اور کوئی نہیں تھا۔ خدا نے آخرکار ان کی دعا سن لی اور بیٹی کے انتقال کے بعد ہی انھوں نے اس دارِفانی کو خیرباد کہا۔

ناول 'روح کے بندھن' کے مطالعے سے زلیخا حسین کے اندازِ بیان کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ زلیخا حسین کی تحریروں سے یہ بالکل ظاہر نہیں ہوتا کہ ناول نگار کسی ایسے علاقے سے تعلق رکھتی ہے جہاں اردو زبان میں بات کرنے والے نہ کے برابر ہیں۔ ان کی تحریروں میں تشبیہات و استعارات کے ساتھ ساتھ تلمیحات، محاورات اور کہاوتوں کا بھرپور استعمال دکھائی دیتا ہے۔ ان کے محاوراتی بیانیے کی مثال ملاحظہ کیجیے:

''اشفاق صاحب کی باتیں کان میں پگھلے ہوئے شیشے کی مانند جا رہی تھیں اور وہ اپنے غصے کو ضبط کرنے اور اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔''[3]

''میری امی ہمیشہ کہا کرتی تھیں طلب سچی ہو تو رائیگاں نہیں جائے گی مجھے ان کی بات کا پورا تجربہ ہے۔''[4]

زلیخا حسین اپنے ناولوں میں زیادہ ثقیل الفاظ کا استعمال نہیں کرتیں، جس کی وجہ سے ایک عام قاری اسے پڑھنے میں کوئی دقت محسوس نہیں کرتا۔ ان کے ناولوں میں زیادہ تر عورتوں کی محرومیت اور ان کی پریشانیوں کا ذکر ہے۔ اس کی وجہ شاید یہی ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے جن رسالوں میں اپنی کہانیاں شائع کروائیں، ان کے قاریوں میں ایک بڑا طبقہ خواتین کا تھا۔ زلیخا حسین کے بیانیے میں اس قدر روانی ہے کہ کوئی بھی ان کی تحریروں کو مکمل پڑھے بغیر نہیں رہ سکتا۔ انھوں نے شبانہ کے گھر سے بھاگنے کا جو منظر پیش کیا ہے اسے پڑھ کر یوں لگتا ہے کہ ہم کوئی ناول نہیں پڑھ رہے فلم دیکھ رہے ہیں اور ہمارے سامنے ناول کے اوراق نہیں بلکہ پردۂ سیمیں ہے:

''ڈرائنگ روم کے گھڑیال نے بارہ بجائے تو وہ اٹھ کر باہر آگئی۔ سب سونے کے لیے اپنے اپنے کمروں میں جاچکے تھے۔ ادھر ادھر دیکھا کوئی نہیں تھا۔ اچھی طرح اطمینان کرنے کے بعد وہ اپنے کمرے سے سوٹ کیس اٹھا لائی اور سانس روکے دبے پاؤں چلتی ہوئی بیرونی دروازے تک پہنچ گئی۔ پوری احتیاط سے دروازہ کھولا۔ باہر نکل کر دروازہ بند کرلیا۔ پھر وہ تیزی سے بھاگتی ہوئی بڑے پھاٹک تک جا پہنچی۔ وہاں بڑا سا تالا لگا ہوا تھا اور کنجی تھی چوکیدار کے پاس۔ چند لمحے وہ کھڑی غور کرتی رہی کہ اب کیا کرے تب اسے خیال آیا۔ بچپن میں وہ اس مضبوط پھاٹک کے اوپر چڑھ جاتی تھی اور پھر دھم سے ریت پر کود پڑتی یہ اس کا دلچسپ کھیل تھا۔ اب تو اس حویلی سے ہمیشہ کے لیے جا رہی ہے۔ اچھا ہے جو آخری بار یہ ایک کھیل بھی ہو جائے۔ یہ سوچ کر وہ پھاٹک کی سلاخوں پر پیر جماتی ہوئی اوپر چڑھ گئی۔ پہلے سوٹ کیس اس طرف ڈال دیا پھر خود اس طرف کود پڑی۔ دوسری

طرف ریت نہیں پتھریلی زمین تھی سخت چوٹ لگی مگر اس وقت اسے چوٹ کی پرواہ نہیں تھی۔ جب جان پر بنی ہو تو معمولی چوٹ کی کیا اہمیت۔''5

زلیخا حسین کے ناولوں کی محور عورت ہے۔ وہ عورت کے اردگرد ہی اپنی کہانی کو بنتی ہیں۔ اس کا اظہار انھوں نے خود ایک انٹرویو میں کیا تھا۔ جب ان سے ان کے تصورِ عورت کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے جواب دیا:

''آپ میرے ناول غور سے پڑھیں تو سمجھ ہی جائیں گے کہ میرے ہاں عورت ہی زندگی کا محور ہے۔ اس کے اطراف زندگی حرکت کرتی ہے۔ اگر اسے ہٹا دیا جائے تو زندگی منتشر ہو جائے گی۔ عورت زمانے کے ستم سہتے ہوئے، قدرت کا ایک کھلونا بن کر وفا کے پیکر کی طرح، ہمارے اردگرد گھومتی پھرتی ہے۔ عورت اتنی بھولی بھالی ہے بھی نہیں جو سب کچھ سہہ کر خودکشی کرنے پر آمادہ ہو یا وہ باغی بھی نہیں جو سماج کی چوکھٹ پر دستک دے کر شکایت کرے، مرد سے بدلہ لے۔''6

مذکورہ بالا اقتباس کے پیش نظر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ زلیخا حسین نے کس طرح سماج میں، یا یوں کہیے کہ خدا کی بنائی اس دنیا میں عورتوں کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ ان کے ناولوں میں پیش کردہ عورتیں زمانے کے ستم سہتے ہوئے، قدرت کا ایک کھلونا بن کر وفا کے پیکر کی طرح، ہمارے اردگرد گھومتی نظر آتی ہیں۔ ان کے دیگر ناولوں میں بھی ان کے مرکزی کردار خواتین ہی ہیں جن میں یہی خوبیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ان کے ناولوں کے مطالعے سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی نظر میں انسانیت ہی انسان کی وہ واحد خوبی ہے، جس کے فقدان سے سماج میں ابتری اور فتنہ پھیلتا ہے۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں عورتوں کے مسائل کو تو پیش کیا ہے ساتھ ہی یہ بھی دکھانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح ایک عورت ہی دوسری عورت کی مصیبت اور پریشانی میں اضافہ کرتی ہے۔

ناول میں زلیخا حسین نے کہانی کو آگے بڑھانے کے لیے بیانیہ تکنیک کے علاوہ کئی دوسری تکنیک کا بھی استعمال کیا ہے۔ انھوں نے ناول کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے، جس میں سب سے پہلے آج کے دور کی کہانی چل رہی ہے۔ اس وقت، ناول کا مرکزی کردار شبانہ، چالیس سال کی عورت ہے جو اپنے اپاہج شوہر اور بیٹی کا خیال رکھ رہی ہے۔ اسے اب اپنی بیٹی کی شادی کی فکر ستائے جا رہی ہے۔ کہانی کے دوسرے حصے میں شبانہ کی کہانی فلیش بیک میں چلی جاتی ہے، جہاں ہمیں شبانہ کا بچپن، جوانی، شادی اور اس کی موجودہ حالت کی وجہ بیان ہوتی ہے۔ ناول کے آخری حصے میں ساری پریشانیوں کا حل پیش کیا گیا ہے۔ شبانہ کی بیٹی شان اور اعجاز کی شادی، شبانہ اور اس کے والد شوکت کا ملنا اور اپنے گلے شکوے دور کرنا اور عادل کا علاج جیسے کئی خوشگوار مناظر ناول کے تیسرے حصے میں پیش کیے گئے ہیں۔ ناول میں سوانحی انداز کے ساتھ ساتھ مراسلے کی تکنیک کا بھی کچھ جگہوں پر استعمال ہوا ہے۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ناول کے ابتدائی حصے میں ناول نگار نے قاری کے ذہن میں تجسس پیدا کیا ہے۔ اس کے بعد قصے کے انجام تک پہنچنے کی طلب قاری کو ناول مکمل پڑھنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

ناول میں انسان کی زندگی کی خوشی کے ساتھ ساتھ ادھورے پن کا احساس بار بار نظر آتا ہے۔ انسانی رشتوں کی پختگی اور ان کے احساسات و جذبات کا بھی اظہار کیا ہے۔ ناول کا اختتام طربیہ انداز میں کرنے کا مطلب ہی یہی نکلتا ہے کہ کوئی بھی انسان اپنے رشتوں سے دور رہ کر خوش نہیں رہ سکتا۔ انسان کی خوشی اس وقت مکمل ہوگی جب اس کے اپنے اس کے ساتھ ہوں۔ زلیخا حسین نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ مال و دولت کے سہارے کبھی کسی کو حقیقی خوشی میسر نہیں آتی۔ ان صادق جذبات کا عکس ناول کے اس حصے سے عیاں ہوتا ہے:

''چاہنے کو وہ بہت کچھ چاہتی تھی۔ دولت سے خریدی جانے والی کوئی چیز نہیں۔ وہ تو شوہر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں پیار دیکھنا چاہتی تھی۔ یہ بھی چاہتی تھی کہ وہ اس کے پورے وجود سے پیار کرے مگر اسے کبھی بھی ان کی آنکھوں میں پیار کی ہلکی سی جھلک بھی نظر نہیں آئی۔ وہ بہت مصروف آدمی ہے۔ وقت کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔ پیار و محبت کی فضول باتوں کے لیے وقت کہاں۔ چہرے پر چوبیس گھنٹے سوچ بچار کی لکیریں پھیلی رہتیں۔ ہونٹ جیسے مسکرانا جانتے ہی نہ تھے۔ ایسے آدمی سے دل کا درد کہنے سے کیا فائدہ۔''7

ناول 'روح کے بندھن' میں زلیخا حسین نے عورتوں کے ان چھوٹے چھوٹے احساسات و جذبات کا ذکر کیا ہے جنھیں ایک عورت کے سوا کوئی اور بیان نہیں کر سکتا۔ خاندانی رشتوں میں احساسات و جذبات کی کمی ہونے کی وجہ سے آپسی دراڑ پیدا ہوتے ہیں اور رشتے ٹوٹنے اور بکھرنے لگتے ہیں۔ زلیخا حسین نے انھیں احساسات و جذبات کا ذکر اپنے ناولوں میں کیا ہے، اسی لیے انھوں نے ناول کا عنوان 'روح کے بندھن' رکھا ہے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو زلیخا حسین کے ناول اپنے دور کے دیگر پاپولر فکشن نگاروں کے معیار پر پورا اترتے ہیں۔ بھلے ہی ان کے ناول میں وہ ادبی چاشنی یا فکری جہت نہ ہو جو ان کی تحریروں کو اردو ادب کے ممتاز ناول نگاروں کی صف میں لا سکے، پھر بھی ان کے انداز بیان اور ان کے تصور عورت کی گہرائی انھیں ان ناول نگاروں سے پیچھے رہنے نہیں دیتی۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ زلیخا حسین نے ناول اس دور میں لکھے جب اردو ادب میں جدیدت کے رجحان کا بول بالا تھا۔ لیکن زلیخا حسین ان سب سے الگ ایک ایسی جگہ رہ کر اردو ادب کی تاریخ میں اپنا نام درج کر رہی تھیں جہاں ان کی تحریروں کو پڑھنے والا، ان کی قدر کرنے والا یا ان کی ستائش کرنے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ زلیخا حسین نے اسی گمنامی میں اپنی پوری عمر گزار دی اور آخری زمانے میں جب شہرت اور عزت ان کے پاس آئی تو وہ اس قدر ضعیفہ ہو چکی تھیں کہ محفلوں میں جانے، پرانی یادوں کو پھر سے یاد کرنے کی سکت ان میں باقی نہ تھی۔ زلیخا حسین کی گمنامی کی وجہ ہمارے دقیانوسی سماج کی تنگ نظری ہے جو ایک خاتون کو اپنی تخلیقات میں اپنا نام لکھنے کی اجازت نہیں دیتی۔ گلشن خطائی کاشمیری کی تحریر پڑھ کر مجھے تعجب ہوا کہ کس طرح زلیخا حسین کے بھائی نے ان کی ملاقات کو ٹال دیا۔ زلیخا حسین کا خاندان سیاسی اعتبار سے بھی بہت مضبوط تھا۔ ان کے خاندان کے افراد بھی اگر ان کی تحریروں کی قدر کرتے تو وہ زندگی بھر ان محرومیوں سے نہ گزرتیں۔ حالانکہ ان کا ایک ناول ''تاریکیوں کے بعد'' ملیالم زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے لیکن اس کی کاپیاں بہت کم دستیاب ہیں۔ لہٰذا کیرلا کی اس واحد ناول نگار کی تخلیقات کو ازسرِ نو تلاش کرنا انھیں یکجا کرنا اور انھیں شائع کرنا محبانِ اردو کا فریضہ ہے، تاکہ اردو ادب میں نئے باب وا ہو سکیں۔

حوالہ جات

1 زلیخا حسین، روح کے بندھن، اہلووالیہ بک ڈپو، دہلی، 1969، ص 75

2 ایضاً، ص 10

3 ایضاً، ص 66

4 ایضاً، ص 71

5 ایضاً، ص 139

6 کیرلا کی واحد ناول نگار: زلیخا حسین، گلشن خطائی کاشمیری، مشمولہ، اردو دنیا، اپریل 2012، ص 41

7 زلیخا حسین، روح کے بندھن، اہلووالیہ بک ڈپو، دہلی، 1969، ص 26

■

Muhammed Aman AK
Asst. Professor, Department of Urdu
University of Calicut,
Kerala- 673635 (Kerala)
Mob.: 8897246842

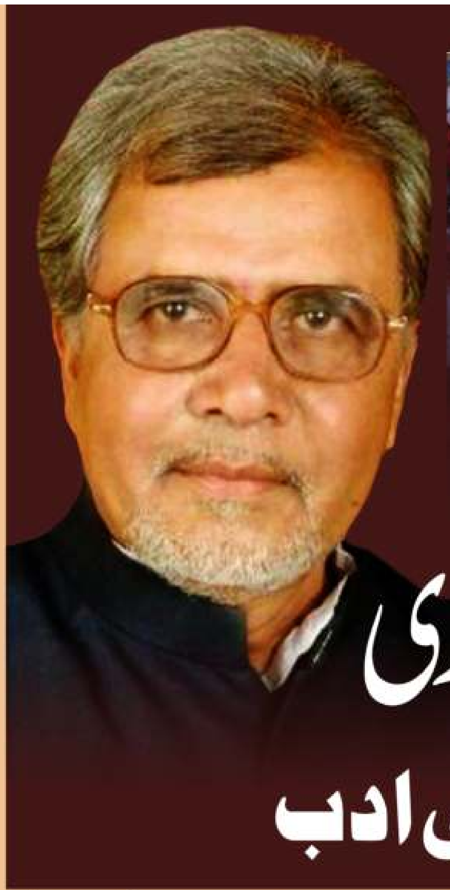

امیر حمزہ

متین اچل پوری اور ماحولیاتی ادب

ادب اطفال ادب کا ایک ایسا گوشہ ہے جس کے خدمتگار بہت ہی خاموشی سے نئی نسل کے لیے بہترین اور عمدہ ادب تخلیق کرتے ہیں اور اکثر گوشہ نشیں بھی رہتے ہیں انھیں میں سے ایک متین اچل پوری تھے جنھوں نے بچوں کے لیے عمدہ ادب یادگار چھوڑا ہے۔ گزشتہ چار دہائیوں میں انھوں نے ایک متوازن رفتار میں بچوں کے لیے کئی کتابیں تحریر کیں اور سنجیدہ مصنفین میں اپنا نام شمار کروایا۔ آپ کا نام محمد متین تھا 18 جنوری 1950 کو اچل پور ضلع امراوتی مہاراشٹر میں پیدا ہوئے۔ وہیں ایم اے اور بی ایڈ تک کی تعلیم سنت گاڈگے بابا یونیورسٹی سے حاصل کی۔ شروع میں پرائیویٹ اسکولوں میں پڑھایا پھر 1990 میں سرکاری اسکول سے وابستہ ہوئے اور 2007 میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ گزشتہ دو برسوں سے طبیعت میں نشیب و فراز جاری تھا کہ 17 اکتوبر 2022 کو داعی اجل کو لبیک کہا۔

زمانہ طالب علمی (1970) سے ہی ادب کی جانب مائل ہوگئے تھے شروع میں شاعری میں قلم آزمایا پھر جلد ہی ادب اطفال کی جانب مائل ہوگئے اور تاعمر اسی میں جیتے رہے۔ متین اچل پوری چونکہ ایک مدرس تھے اور ادیب اطفال بھی تھے اس لیے انھوں نے بچوں کی نفسیات کو بخوبی سمجھا اور اپنی تحریروں میں برتا بھی۔ انھوں نے بچوں کے لیے جدید موضوعات پر مبنی نظمیں تحریر کیں ساتھ ہی نثر میں کہانیاں اور ڈرامے بھی لکھے۔ وہ اپنی عمدہ خدمات کے لیے کئی مرتبہ اعزازات سے نوازے بھی گئے۔ صدر جمہوریہ ہند کی جانب سے بہترین استاد ایوارڈ 1990 میں ہی حاصل کیا اس کے علاوہ ملکی وصوبائی سطح پر دیگر 17 اعزازات وانعامات سے بھی نوازے گئے۔ ان کی تصانیف کی تعداد 16 ہے۔ جبکہ زیر طبع کتب کی تعداد 10 ہے۔ ان کی یہ قیمتی کتابیں اردو ادب میں انھیں زندہ رکھنے کے لیے کافی ہیں لیکن اس سے بھی بڑا ثمرہ انھیں یہ ملا کہ مہاراشٹرا و تلنگانہ کی درسی کتب میں ان کی نظمیں شامل ہیں۔ ادب میں ان کی خدمات شش جہات ہیں لیکن یہاں صرف ماحول کے موضوع پر لکھی گئی نظموں سے گفتگو ہے۔

ہماری نظر میں ماحول اور ماحولیات دو شاخ نہیں بلکہ باضابطہ الگ الگ چیزیں ہیں جس کو ہم منطق کی اصطلاح میں کہہ سکتے ہیں کہ دونوں میں تباین کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ ہم نے دو شاخ صرف ڈاکٹر مولا بخش کی موافقت میں لکھ دی ہے بلکہ ان کے یہاں اس لفظ ماحولیات میں اتنی وسعت ہے کہ اس کے دائرے میں ماحول، فضا، منظر، فطرت، ثقافت، رہن سہن کے طور طریقے، مقامیت اور دیہی جمالیات بھی آجاتے ہیں۔ پروفیسر عتیق اللہ صاحب نے اس کو بہت ہی جامع و مانع انداز میں پیش کیا ہے وہ لکھتے ہیں ''حیاتیات کی وہ شاخ جس کے تحت اجسام نامیہ کے ایک دوسرے سے تعلق کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔'' اس کی تعریف ہم اپنے الفاظ میں کچھ اس انداز میں کر سکتے ہیں کہ ماحولیات وہ نامیاتی عناصر ہیں جن کا تعلق ہمارے حواسِ خمسۂ ظاہرہ سے ہے۔ جس میں ماحول ومناظر سے نہیں بلکہ ان میں کثافت کی وجوہات، اس کے نقصانات اور اس کے بچاؤ کی تدابیر پر بات کرتے ہیں۔ ماحولیات پر تنقید کے نام سے چند مضامین لکھے جا چکے ہیں لیکن ماحولیاتی ادب کا اردو میں ابھی تک کوئی خاص ذکر نہیں ملتا۔ پوری دنیا جن وجوہات سے تباہی کے دہانے پر کھڑی ہے، ہزاروں بیداری ریلیاں نکالی جاتی ہیں، لاکھوں کی تعداد میں پمفلیٹ چھپتے ہیں، اربوں روپے اشتہارات میں خرچ ہوتے ہیں لیکن ان موضوعات کو لے کر ادب کا دامن خالی نظر آتا ہے چہ جائیکہ ادب اطفال کی بات کی جائے۔

ادب اطفال میں ابتدا ہی سے منظر نگاری اور فطری چیزوں کو پیش کرنے کا رجحان زیادہ رہا ہے۔ اس میں وہاں سورج کی بات کی جاتی ہے تو چندا ماما بھی دلچسپی کا باعث بنتے ہیں۔ سردی، گرمی، برسات جیسے مضامین سے بچے لطف اندوز ہوتے ہیں تو وہیں پرندے اور جانور بھی ان کی دلچسپی کے سامان ہوتے ہیں۔ سائنس کی دنیا سے دلچسپی پیدا کرنے کے لیے سائنسی مضامین دلچسپ انداز میں پیش کیے جانے لگے ہیں جس کے تحت جنرل نالج بھی اس میں شامل ہے۔ ان سب میں ماحول کا عنصر تو نمایاں نظر آتا ہے لیکن اب لامتناہی وسائل نے جس طرح سے فطرت اور حیوانی زندگی کو متاثر کیا ہے اس پر لکھنے والے کم ملتے ہیں۔ صرف اتنا لکھ دیا جاتا ہے کہ ہزاروں سال پہلے سب سے بڑا جانور ڈائناسور پایا جاتا تھا جس کی مختلف خصوصیات کے بارے میں بتا دیا جاتا ہے۔ یا یوں کہ کسی زمانے میں ہمارے شہر کے چاروں طرف خوبصورت باغات اور جنگلات ہوا کرتے تھے جہاں ہمارے راجہ یا بادشاہ آرام کیا کرتے تھے اور شکار بھی کھیلتے تھے۔ اٹھلاتی ہوئی اور بل کھاتی ہوئی ندیاں بھی بہتی تھیں، جن میں مچھلیاں مچلتی رہتی تھی، شہر کے لوگ مچھلیوں کا شکار کیا کرتے تھے وغیرہ۔ ایسی کہانیاں تو خوب پڑھنے کو ملیں گی لیکن ان کے ختم ہونے سے ہماری زندگی میں کیا اثر ہوا ایسی کہانیاں آپ کو پڑھنے کو نہیں ملیں گی۔ اس کمی کو محسوس کرتے ہوئے متین اچل پوری ایک رہنما کے طور پر سامنے آتے ہیں جنھوں نے بچوں کے لیے ماحولیات پر 'ہم ماحول کے رکھوالے' اور 'ماحول نامہ' جیسی کتابیں لکھیں جن میں انھوں نے بچوں کی قدرت سے محبت اور کثافت و آلودگی سے دور رہنے کے لیے کئی نظمیں لکھیں ہیں۔ درخت کی کہانی، جنگل کی کہانی، باغ کی کہانی جیسے عنوانات بہت ملیں گے لیکن شجرکاری جیسے موضوعات پر نظمیں لکھنے کو ایوینٹ کی شاعری کہہ دیا جاتا ہے جو وقتی تناظر میں آتا ہے اور پھر منظر سے غائب ہو جاتا ہے۔ ایسے میں میر تقی میر کی 'مرغوں کی لڑائی' اور نظیر اکبرآبادی کی 'پودنے گڑھ پنکھ کی لڑائی' کو کیا کہیں گے جو موضوعاتی طور پر وقت کے

ساتھ متروک، جس کی کنٹری اور اصطلاحات بھی اب ہندوستان سے معدوم ہو چکے ہیں۔ الغرض نئے نئے موضوعات سامنے آتے رہتے ہیں اور فن کار اپنی فن کاری سے ان موضوعات کو بچوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ 'درخت راہوں کے' نظم کا ایک شعر آپ کو بھی سوچنے پر مجبور کردے گا کہ اس میں کہیں بھی وقتی تناظر نہیں ہے بلکہ ایک ابدی وازلی پیغام نظر آتا ہے۔

یہ سیکھو سائے میں ان کے رہ کر
کہ چھاؤں دینا ہے دھوپ سہہ کر

لفظ 'سہ کر' سے یہاں بہت سی مشکلات کی جانب اشارہ ہوسکتا ہے، مثلاً ہمیں مشکلات کو سہہ کر اس عالمی گاؤں کو چھاؤں دینا ہے جہاں ہوا بھی اچھی اور فضا بھی بہتر ہو، جس کے سائے سے شہر کو گرم بھٹی ہونے سے بچایا جائے یعنی مستقبل کی چھاؤں کے لیے ابھی ہمیں بہت کچھ سہنا ہوگا۔

بچوں کے نصابات میں جب سے سائنس آئی ہے تب سے سائنسی ادب کی اہمیت بھی بڑھ گئی ہے جس کی وقت حاضر میں کئی حضرات نمائندگی بھی کررہے ہیں جن میں اہم نام محمد خلیل کا ہے۔ ماہنامہ سائنس بچوں میں سائنسی شعور و دلچسپی پیدا کرنے کے لیے امیرانہ کردار ادا کررہا ہے۔ اس میگزین میں شمسی، آبی اور فضائی توانائی سے متعلق لکھا جاتا ہے اور اس کے فوائد بھی بچوں کے لیے دلچسپی کے باعث بنتے ہیں لیکن متین اچل پوری نے اس کو اپنی کئی نظموں میں پیش کیا ہے جیسے 'سورج کی توانائی'، 'آگ کا سفر'، 'انمول آبی گھر' اور 'پھرکی اور پون چکی' وغیرہ۔ سورج کی توانائی میں انھوں نے سولر جہاز کا خصوصی طور سے ذکر کیا ہے۔ اس سے بچوں کے ذہن میں کئی معلوماتی سوال ابھرتے ہیں مثلاً سولر اسے کیوں کہتے ہیں؟ کون سا جہاز اس سے چلتا ہے؟ اس کے بعد بچوں کے اندر معصومانہ سوال ابھرتا ہے کہ جہاز تو اڑتا ہے تو یہ دوسرا جہاز ہوگا، پھر بلا واسطہ سورج سے کیسے چلے گا وغیرہ۔ ان ابھرتے سوالات سے بچوں کے تخیل کو مضبوطی حاصل ہوتی ہے۔ اسی طریقے سے 'آگ کا سفر' ہے جس میں چنگاری، آگ، لکڑی، کوئلہ، مٹی کا تیل اور اب رسوئی گیس لیکن ان سب کے لیے ہمیں کہیں نہ کہیں معدنیات کا سہارا لینا پڑ رہا تھا تو مصنف مکمل طور پر معدنیات اور ماحولیاتی تحفظ کے لیے 'شمسی چولہا' کو بچوں سے متعارف کرواتے ہیں۔ اس نظم سے دو شعر ملاحظہ ہو۔

جب بڑھی آبادی یہ عالم ہوا
ہر توانائی کا ذریعہ کم ہوا
بنتے بنتے بن گیا ہے آج کل
شمسی چولھا آگ کا نعم البدل

اس کے بعد فضائی توانائی پر 'پھرکی اور پون چکی' بھی ہے جس میں بچوں کو یہ بتایا گیا ہے کہ بجلی جیسی توانائی کو ہم جس طرح سورج اور پانی سے حاصل کرتے ہیں اسی طرح بجلی کو ہم ہوا سے بھی حاصل کرسکتے ہیں جس کا استعمال بہت ہی مفید ہے اور صاف ستھری فضا کی تشکیل میں ہمارے لیے بہت ہی معاون ہے، کیونکہ ہم جب ماحولیات کی بات کرتے ہیں تو سب سے پہلے ایندھن کی بات ہوتی ہے جس پر متین اچل پوری نے بچوں کے لیے خوبصورت نظمیں لکھیں۔ اس نظم سے تین شعر۔

کھیل تھا صبح و شام کاغذ کا
لے کے لوہا مقام کاغذ کا
خوب اونچا اٹھا ہے شان کے ساتھ
باتیں کرتا ہے آسمان کے ساتھ
کیا ہوا کے تھپیڑے سہتی ہے
بجلی تیار کرتی رہتی ہے

ہم جب ادب اطفال میں موضوعات کی بات کرتے ہیں تو اس میں دنیا کے تمام موضوعات نہیں سما سکتے، بچوں کا ذہن کلچر، زبان، تہذیب اور معاشرتی گفتگو کا متمنی نہیں ہوتا، وہ خانگی رشتے پر کہانیاں سننا نہیں چاہتے اور نہ ہی وہ مسائل پر توجہ دیتے ہیں بلکہ ظرافت و مسکراہٹ ان کی فطرت میں ہے جس سے وہ مرحلہ وار کسی بھی چیز میں دلچسپی لیتے ہیں۔ وہ ہمارے ماحولیاتی مسائل پر کچھ بھی نہیں پڑھنا چاہیں گے۔ البتہ ان کو معلوماتی اور ماحولیاتی مسائل کی خوبیوں اور خامیوں سے آگاہی پسند ہے ان کو یہ پسند ہے کہ جنگل کے فوائد کیا ہیں یہ نہیں پسند کہ جنگلوں کو برباد کرنے میں ہماری پالیسی کا کتنا دخل ہے۔ انھیں بہتی، جھومتی اور اٹھلاتی ندیوں پر نظمیں اور کہانیاں پسند ہیں نا کہ ان کے سوکھنے کی وجوہات پر۔ پانی پر ہمارے یہاں بہت ہی زیادہ سلوگن بنائے گئے ہیں۔ بڑے بڑے سائن بورڈ جو شہر کی شان ہوتے ہیں اس میں آبی تحفظ پر شہر اپنی باطنی کہانی کو پیش کررہا ہوتا ہے۔ ان بورڈ پر بچوں کی نظر پڑتی ہے اور بڑوں کی بھی، سب کو سلوگن بھی یاد ہوجاتے ہیں لیکن ذہن میں اتارنے کا کام تو ادب کرتا ہے جس پر متین اچل پوری کی نظر پڑی اور انھوں نے آبی تحفظ کو خصوصی طور پر اپنی نظموں میں پیش کیا۔ اس سلسلے میں ان کی ایک انمول نظم 'انمول آبی گھر' گلیشیئر سے متعلق بچوں کو سوچنے پر مجبور کرنے والی خوبصورت نظم ہے جس میں بچوں کو بنیادی طور پر تین باتیں بتائی گئی ہیں کہ یہ گلیشیئر (آبی ذخائر) کیا ہوتے ہیں، اس کے فوائد انسانی زندگی کے لیے کیا ہیں اور اب ایندھن کے بے جا استعمال سے ان گلیشیئر کے پگھلنے سے نقصانات ہیں۔ وہ نظم میں پیش کرتے ہیں۔

دنیا کی تپش کے بڑھنے سے تیزی سے یہ پارہ چڑھنے سے
یہ برف کی ویرانے پگھلیں بڑھتی ہے سمندر کی سطحیں
پربت یہ رواں ہوجانے سے پانی کا زیاں ہوجانے سے
سیلاب نرالے آتے ہیں خوشیوں کو بہالے جاتے ہیں
پانی کو سنبھالے رکھنا ہے راہوں میں اجالے رکھنا ہے

اس کے بعد 'پانی کی فریاد' ایک اثر انداز اور پرسوز نظم ہے جس میں پانی کو ہی ایک کردار کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اس میں پانی بچوں سے ہی اپنے تحفظ کے لیے سوال کرتا ہے، اپنے اوپر بیت رہی مصیبتوں کو بتاتا ہے، جابر و ظالم کی نشاندہی کرتا ہے، اپنی پرانی خصوصیات و کیفیات کو بتاتا ہے اور آخر میں التجا بھی کرتا ہے کہ خدا کی مخلوق پر رحم کرو ورنہ آسمان والا خفا ہوجائے گا۔ اس نظم کا پہلا بند ملاحظہ فرمائیں۔

اب اپنے ماحول کو بچانے، قدم اٹھاؤ قلم اٹھاؤ
یہ ہم سے گھبرا کے بولا پانی، مجھے بچاؤ، مجھے بچاؤ
دھواں اگلتے یہ کارخانے کثافتوں کی یہ حکمرانی
میں دق زدہ اک مریض جیسا ہوئی ہے دشوار زندگانی

اس طریقے سے 'ساگر کی حیرانی' نظم بھی ہے جس میں سمندر کی کثافت کو پیش کیا گیا ہے۔ جس میں سمندر میں بسنے والی پوری دنیا کو خطرہ لاحق ہے۔ ہم انسانوں نے سمندر کو تو مسخر کرلیا لیکن اس سے اس پوری آبی کائنات کو خطرہ لاحق ہوگیا ہے جس کو خدا نے ہمارے لیے بنایا ہے۔ ہم اس شہر میں جتنے بڑے بڑے جہاز اتار دیتے ہیں جس سے آبی دنیا میں ہلچل مچ جاتی ہے۔ اگر اس میں کچھ ناگہانی حادثہ ہوجائے تو جو کاربن ڈائی اکسائڈ ہمارے لیے زہر ہوتا ہے وہی تیل کی شکل میں اس دنیا کو تباہ کردیتا ہے چنانچہ متین اچل پوری لکھتے ہیں۔

پانی پر ہے تیل یہ کیسا انسانوں کا کھیل یہ کیسا
ساحل کی سب گہما گہمی کچھ دن سے ہے سہمی سہمی
خطرہ لاحق انسانوں کو سارے آبی حیوانوں کو
خطرے میں ساحل کی زمین ہے چڑیوں کو بھی چین نہیں ہے

آبی تحفظ کی جانب راغب کرنے والی ان کی ایک نظم 'پانی بچاؤ' ہے۔ اس میں وہ بہت ہی فن کاری سے ہر طبقے کے بچوں کو شامل کرلیتے ہیں کیونکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ رئیس بچوں کے ذہن میں مالی فراوانی کی وجہ کسی چیز کی کمی نہ ہونا ان کے لیے آسان ہوتا ہے لیکن یہ نہیں بتایا جاتا ہے کہ یہ خدا کی جانب سے انمول نعمت ہے اور اس نعمت کی کوئی قیمت ادا نہیں کی جاسکتی ہے۔ جس طرح سے صاف ہوا سب کے لیے برابر ہے اسی طریقے سے پانی بھی سب کے لیے یکساں ہے۔ بچوں کی ہی زبانی وہ کہتے ہیں۔

چاہے کچن ہو یا کارخانہ
ہوٹل ہو چاہے بھٹیار خانہ

نیچا ہو چاہے اونچا گھرانہ
کپڑے ہو دھونا چاہے نہاؤ
پانی بچاؤ، پانی بچاؤ

یہ وہ موضوعات تھے جن کے لیے دنیا پریشان ہے۔ متین اچل پوری نے ان موضوعات کے علاوہ ماحولیات سے متعلق کئی اہم مضمون بچوں کے لیے بچوں کی سہل زبان میں بغیر کسی فکر و فلسفے کے پیش کیے ہیں۔ جیسے جب سرمایہ داری ختم ہوئی اور زمیندار طبقہ زمینداری کی فضا سے نکل کر شہروں میں قدم رکھنے لگا، گاؤں اور قصبات کی کوٹھیاں شہر کے فلیٹوں میں تبدیل ہوگئیں، آنگن سے دور دور تک کا نظارہ صرف بالکنی کے نظاروں میں محصور ہوکر رہ گیا اور اجناس دینے والا ہاتھ لینے والا بن گیا۔ اس قسم کی بات 'نیا ماحول نامہ' میں متین اچل پوری کرتے ہیں جس کا پہلا بند کچھ اس طرح ہے۔

گملوں سے اب کام چلانا ہے یارو
آنگن کو گلزار بنانا ہے یارو
آنگن کا بٹوارہ ہوا تو کیا غم ہے
دوبارہ، سہ بارہ ہوا تو کیا غم ہے
اب رشتوں کا مول بڑھانا ہے یارو
آنگن کو گلزار بنانا ہے یارو

الغرض اس طرح کی کئی نظمیں ہیں جن میں وہ بچوں کو نئے درپیش ماحول میں ماحول ساز بچہ بننے کا سبق دیتے ہیں۔ ایسی نظمیں ضرور لکھی جاتی ہوں گی، ہر زبان میں ہوتی ہوں گی لیکن اردو جس نے قدم سے قدم ملا کر چلنا سیکھا ہے جہاں اس نے ادب عالیہ میں عالمی زبانوں میں اپنی اعلیٰ شناخت میر، غالب، اقبال، پریم چند، منٹو، عصمت اور قرۃ العین حیدر سے بنائی وہیں ہمارے ادب اطفال کے ادیبوں کے لیے لازمی ہوتا ہے کہ وہ گاہے بگاہے عالمی مسائل سے بچوں کو آگاہ کراتے رہیں، جہاں ہم اخلاقیات میں ان سے ہر ہئیت و لہجے میں مخاطب ہوتے ہیں وہیں زندگی کے بنیادی وسائل میں صرف سائنس تک ہی محدود ہونا کافی نہیں ہے بلکہ متین اچل پوری نے جس جانب قدم اٹھایا ہے اس جانب نثری تحریروں میں بھی ادیبوں کو آگے آنا ہوگا تاکہ جس تبدیلی کے ہم خواہشمند ہیں وہ تبدیلی جلد از جلد آسکے۔

اس کے علاوہ ان کی دو کتابیں اور ہیں جن کا تعلق ماحول سے ہے۔ ایک 'ماحول کی خوشبو' اور دوسری 'ماحول نامہ' لیکن یہ دونوں کتابیں 'ہم ماحول کے رکھوالے' سے مختلف ہیں۔ 'ماحول نامہ' بیاسی صفحات پر مشتمل ہے جس میں اڑتیس نظمیں ہیں۔ ان نظموں میں رنگینی اور بوقلمونی نظر آتی ہے۔ جہاں فطرت کی عکاسی ہے وہیں دیگر اخلاقی باتیں بھی ہیں۔ ساتھ ہی کچھ ایسی نظمیں ہیں جن سے ماحول کو خوشگوار رکھنے کی دعوت ملتی ہے اور انسانوں کو سبق عبرت بھی دیتی ہے کہ گئے دنوں کو یاد کریں جب ہم ماحول کے لیے ظالم و جابر نہیں بنے تھے۔ اس کتاب میں ان کی ایک نظم 'اپنا ماحول اپنی جنت' میں صاف لفظوں میں یہی پیغام ہے کہ ہماری جنت ہمارا ماحول ہے۔ ہم ماحول کے تحفظ کی بات کریں گے تو اپنی جنت ارضی کے تحفظ کی بات کریں گے۔ اس نظم کا ایک شعر بہت ہی معنی خیز ہے۔

کریں ہم بے زبانوں سے محبت
پرندوں کے ٹھکانوں سے محبت

اس شعر کا آخری مصرع تحفظِ ماحولیات کے ایک بڑے حصے کو اپنے دائرے میں لے رہا ہے۔ پرندوں کی کئی نسلیں اگرچہ جنگلوں میں رہتی ہیں تاہم آبادی میں رہنے والے پرندے بہت ہی کم ہوتے جارہے ہیں۔ جو پرندے ہمارے گھر کے آنگن کے پیڑ میں گھونسلے بنا کر رہتے تھے انھیں اب پنجروں میں رہنے پر مجبور کردیا گیا ہے جس سے سائنسی طور بہت ہی نقصان ہوا کہ وہ پرندے جو حشرات الارض کو ہماری فضا سے دور کرتے تھے اب ہم نے ان ہی پرندوں کو خود سے دور کردیا ہے جس کا سبق متین اچل پوری بچوں کو ادب کے ذریعے پیش کررہے ہیں۔

بچوں کے لیے نئے موضوعات کی کمی بالکل بھی نہیں ہے کیونکہ دنیا میں جتنی بھی چیزیں وقوع پذیر ہورہی ہیں خواہ وہ فطری ہوں یا غیر فطری، ایجادات ہوں یا نئے مقامات کی سیر۔ یہ وہ سارے موضوعات ہیں جن سے بچے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ انھیں میں سے سائنس سے تعلق رکھنے والے بچوں کے لیے ایک اہم موضوع 'اوزون' ہے جس پر مصنف کی ایک نظم 'ہوا، اوزون اور زمین' ہے۔ کسی بھی ایک نظم سے بچے مکمل طور پر اوزون سے واقف نہیں ہوسکتے لیکن تین اشیا (تعریف اچھائی اور برائی) کا اظہار شاعر ضرور کردیتا ہے جن کو بچوں کی نظموں میں محسوس کیا جاسکتا ہے۔ اس نظم میں بھی تعریف اور اچھائیوں کا ذکر ہے ساتھ ہی بیداری بھی ہے جنھیں ان تین اشعار میں محسوس کرسکتے ہیں۔

تہوں سے لگا قوس اوزون ہے
بڑے کام کا بھائی وہ زون ہے
بنفشی شعاعوں سے ہم کو بچائے
یہ سمجھو بلاؤں سے ہم کو بچائے
مگر آج اوزون خطرے میں ہے
محافظ ہے جو زون خطرے میں ہے

ہمارے یہاں اردو میں سائنسی موضوعات پر بہت سی تحریریں لکھی گئی ہیں۔ ہیئت کے اعتبار سے ان کا زیادہ تعلق نثری تحریروں سے رہا ہے لیکن نظم کے پیرائے میں بچوں کے لیے بہت کم تحریریں ملتی ہیں جن کی خلا یہاں پُر ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اگر صرف اردو دنیا کی بات کی جائے تو ابھی سائنس فکشن ہمارے یہاں اپنی جگہ نہیں بنا سکا ہے۔ بچوں میں صرف معلومات عامہ تک ہی اس کی رسائی اچھی ہے لیکن سائنس کو ادب کے قالب میں ڈھال کر پیش کرنے والے بہت ہی کم ہیں۔

گلوبل وارمنگ پر ان کی ایک کہانی 'جنگل کی پگڈنڈی' ہے۔ یہ ایک مکالماتی کہانی ہے جو سڑک اور پگڈنڈی کے بیچ چلتی ہے۔ اس کہانی میں سڑک کے دکھ درد میں پگڈنڈی مکمل شامل ہوتی ہے لیکن سڑک کے مقدر میں جو ہونا ہے وہ تو مزید سے مزید تر ہوتا جارہا ہے۔ دو مکالمے ملاحظہ فرمائیں:

"پگڈنڈی: گرمی کی شدت سے یوں جو تمہارا بدن جل رہا ہے۔ چھوٹا منہ بڑی بات، میرا بس چلے تو جنگل کی صاف، ٹھنڈی تازہ ہوا تمھارے نام لکھ دوں۔ گاؤں کا تالاب لاکر تمھارے لبوں سے لگادوں۔

سڑک: آہ ٹھنڈے، میٹھے پانی کے ایسے کٹورے اور جنگل کی وہ انمول ہوا میرے نصیب میں کہاں۔ (پگڈنڈی کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے)

بہن! تم بڑی خوش نصیب ہو۔ دھنک تمھاری اوڑھنی...، شفق تمہارا گھونگھٹ... اور بادل تمھارا کاجل۔۔۔ میرے نصیب میں تو یہی سیاہ ماتمی لباس ہے جس میں سورج کی تیز کرنیں آگ لگادیتی ہیں۔"

نثری کہانی اور شاعری میں تاثراتی اعتبار سے دو الگ الگ چیزیں پائی جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ شاعری پڑھنے کے بعد ذہن میں فرحت و انبساط کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور جب شاعری اعلیٰ درجے کی ہو اور اس کے معانی بڑے وسیع پیمانے پر کھل کر سامنے آتے ہوں تو قاری کا ذہن بہتر معنوی غذا کے ساتھ خوش ہوجاتا ہے۔ لیکن کہانی کا معاملہ کچھ الگ ہوتا ہے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کہانی ختم ہونے کے بعد انسان کا ذہن فکر و سوچ میں مبتلا ہوجاتا ہے اور کہانی کے کسی نہ کسی کردار کے ساتھ اپنی ہمدردی کا اظہار کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ جس کو اس کہانی میں محسوس کیا جاسکتا ہے جو بچوں کو سڑک کی ہمدردی کے ساتھ جوڑے رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی کئی کہانیاں اور نظمیں ہیں جو اس موضوع پر سنجیدگی سے بچوں کو غور و فکر کی دعوت دیتی ہیں۔

■

Dr. Amir Hamzah
Madarsa Mohalla: Nawada
Bishungarh,
Hazaribagh- 8253123 (Jharkhand)
Mob.:8877550086

لداخ میں اردو فکشن

محمد شریف

اردو میں افسانوی ادب کے قدیم ترین نمونے داستان کی شکل میں ملتے ہیں۔ قدیم زمانے میں انسان کے پاس کافی وقت ہوا کرتا تھا ایسے میں وہ قصے سنتا اور سناتا تھا، جو بہت طویل ہوتے تھے۔ یہ داستانیں زیادہ تر جن، پری، طلسم، سحر، عجیب وغریب واقعات سے بھری پڑی ہوتی تھیں۔ طلسم ہوش ربا، الف لیلہٰ، فسانہ عجائب، بوستان خیال کے علاوہ اور بھی بہت سی داستانیں ہیں جن میں مافوق الفطرت عناصر کی بھر مار ہے جن کے مطالعے سے قاری کو راحت میسر ہوتی تھی، لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا داستانوں کا رواج کم ہوتا گیا۔ قاری کے پاس اتنا وقت نہ رہا کہ وہ طویل داستانوں کو پڑھ سکے۔ جلد ہی انگریزی کے توسط سے لوگوں کی نگاہیں جدید طرز کے ناولوں پر پڑنے لگیں، جس میں زندگی کے حقیقی واقعات کو قصوں کا موضوع بنایا گیا اور غیر ضروری طوالت سے دامن کو بچایا بھی گیا۔ انسان کی مصروفیت اور بڑھی تو افسانہ وجود میں آیا۔ افسانہ چھوٹا سا ہوتا ہے جس میں زندگی کے کسی ایسے گوشے یا واقعے یا زندگی کے کسی ایک پہلو کو کم سے کم الفاظ میں موثر طریقے سے بیان کیا جاتا ہے۔ داستان، ناول اور افسانہ در اصل ایک ہی نثری صنف کے مختلف روپ ہیں۔ یہ اصناف افسانوی ادب یا فکشن کے ذیل میں آتی ہیں۔ ان تینوں کی بنیادی خصوصیت ایک ہے اور وہ ہے قصہ پن، یعنی ہر قدم پر یہ جاننے کی خواہش کہ آگے کیا ہوگا اور اس کے بعد کیا ہونے والا ہے۔ یہ کہانی پن یا قصہ پن ہی فکشن کی جان ہوتی ہے۔

لداخ میں بھی ابتدا سے داستانوں کا رواج رہا ہے پھر ناول اور اس کے بعد افسانہ وجود میں آیا۔ اس لیے سب سے پہلے لداخ میں اردو داستان کی روایت پر تفصیل سے گفتگو کی جائے گی۔

لداخ میں اردو داستان

لداخ کے لوگ اردو ناول سے پہلے داستانیں سنایا کرتے تھے۔ چونکہ لداخ میں موسم سرما کی راتیں بہت طویل ہوتی ہیں۔ اس لیے راتیں گزارنے کے لیے داستان گو حضرات محلے میں رات کا کھانا کھا کر اس مقام پر پہنچ کر داستانیں سنایا کرتے تھے جہاں مرد اور عورتیں جمع ہوا کرتے تھے۔ فارسی کی بہت سی داستانوں کو جس طرح برصغیر کے اردو داں طبقے نے اردو کا جامہ پہنایا اسی طرح لداخی قلمکاروں نے انھیں فارسی داستانوں کو لداخی زبان کے قلب میں ڈھالا ہے۔ عبدالغنی شیخ لداخ میں داستان کے بارے میں یوں تحریر کرتے ہیں:

''لداخ میں داستان گوئی بڑی مقبول تھی۔ دادی ماں اپنی بیٹیوں اور بیٹوں کو داستان سناتی تھی۔ ماں اپنے بچوں کو داستانیں سناتی تھی بچے ایک دوسرے کو سناتے تھے۔ اس طرح داستانیں اور حکایتیں نسل در نسل چلتی تھیں۔''

(عبدالغنی شیخ: لداخ کی تاریخ کے اہم گوشے، اپلائڈ بکس، نئی دہلی 2017، ص 86-385)

داستان کیسر بلتستان، تبت، سکم، بھوٹان، نیپال، گلگت اور وسطی ایشیا کے بعض ممالک میں مشہور ہے۔ اس طرح داستان کیسر کو خطہ لداخ میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ عبدالغنی شیخ داستان کیسر کے متعلق لکھتے ہیں:

''گیالم کیسر کی داستان بڑی مقبول تھی۔ داستان گو اپنے ہاتھوں میں دو چھوٹے ڈنڈے اٹھاتا تھا۔ اور اپنی حرکات وسکنات زور بیان اور آواز کے زیر وبم سے ڈرامائی کیفیت پیدا کرتا تھا۔ کئی داستانیں منظوم ہوتی تھیں اور داستان گو اپنی خوش گلوئی سے سامعین کو مسحور کرتا تھا اور سامعین بیچ بیچ میں داستان گو کو داد دیتے تھے۔''

(ایضاً، ص 86-385)

موسم سرما میں لداخ کے کئی گھرانوں میں داستان گو کو مدعو کیا جاتا تھا اور داستان سننے کے لیے دوست احباب مدعو کیے جاتے تھے۔ گیالم کیسر کی داستان بڑی مقبول تھی۔ اس کے علاوہ لداخ میں آپی ڑھاؤ (دادی اماں کا پوتا) اور نگ موروپ پسندیدہ داستانیں کافی مقبول تھیں۔ مسلمانوں میں جنگ نامہ حضرت علی، داستان امیر حمزہ، قصہ الف لیلیٰ اور رستم وسہراب جیسی داستانوں کو سننا پسند کیا جاتا تھا۔

لداخ کے تاریخ داں اور ادیب کاچو سکندر خان کو داستانوں سے نہایت دلچسپی تھی۔ وہ داستانوں کو محض مسرت کے لیے نہیں سنتے تھے بلکہ داستانوں کے اندر جھانک کر دلچسپ معلومات حاصل کر کے لداخی مقبول داستان' نور بوز انگپور اور ات ٹھوق لھامو' (Nurboo Zangpo and Thoq Lhamo) کو اردو کا جامہ پہنایا۔ یہ داستان سنسکرت سے کلاسیکل تبتی اور لداخی زبان میں ترجمہ ہوئی ہے۔ کاچو سکندر خان نے اس کو بڑی خوبصورتی سے اردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔ کاچو سکندر خان اپنی سوانح عمری میں داستان سننے کا شوق اور داستانوں سے دلچسپی کا ذکر کرتے ہوئے کیسر ساگا سے متعلق یوں رقمطراز ہیں:

''کیسر ساگا کو میں بچوں کی کہانی سمجھتا تھا۔ مجھے اس کہانی سے بے حد دلچسپی تھی جو عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتی اور گہری ہوتی گئی۔ لیکن جب میں لداخ کی تاریخ، لداخی ادب اور لداخی دیو مالاؤں کا مطالعہ وسیع تر پیمانے پر کرنے لگا تو اسے اتھاہ سمندر پایا اور اس کے گونا گوں تابناک پہلوؤں کے دلفریب بھول بھلیاں اور جواہر پاروں میں کھو گیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ داستان کیسر بہ لحاظ مواد، بہ لحاظ حسن بیان و لطافت شعری وادبی، ہومر رزمیہ داستان الیاڈ و اوڈیسی کی طرح دنیا کی عظیم ترین رزمیہ داستانوں میں سے ہے اور نہ صرف تبت بلکہ دنیائے ادب و تحقیق کے لیے پراسرار قدیمیات کی وجد انگیز داستان اور گرانقد معلوماتی خزانہ ہے ہومر کی الیاڈ و اوڈیسی میں اور کیسر ساگا میں میں نے گہری مشابہت دیکھی اگرچہ دونوں داستانوں کے زمانہ تخلیق موضوع اور زمینی و واقعاتی ماحول میں بعد المشرقین ہے۔''

(کاچو اسکندر خان: افکار پریشان (یادوں کے دوش پر)، ناشر کاچو پبلشرز کرگل لداخ، 2001، ص 36-35)

لداخ کی ساری جگہوں پر داستاں گوئی بہت مقبول

تھی۔ لداخ کے ضلع کرگل کے چکتن گاؤں اپنی داستان گوئی کی وجہ سے مشہور ہے۔ وہاں کے مشہور داستان گویوں میں عبدالرحیم اور رحمت جو اس دنیا سے رخصت ہو گئے ہیں وہ اپنی داستان گوئی کے سبب سے آج بھی یاد کیے جاتے ہیں۔ تاریخ داں صنم پنچگ لکھتے ہیں:

''کہ آج بھی علاقہ چیکتن میں متعدد داستان گو ہیں، خاص کر گیالم کیسر کی داستان سنانے میں یہ یکتا ہیں۔ ان میں چیکتن ہانیس کا جعفر تونچے، کوکشو کا موسیٰ ینگبور اور اچینا تھنگ کا شی ربگیس قابل ذکر ہیں۔ ان کی عمر ستر برس اور اس سے زیادہ ہیں۔ لداخ میں فن داستان گوئی کی آخری یادگار شخصیتیں ہیں۔ آج کے نوجوان کو داستان گوئی کا شوق نہیں ہے اور نہ داستان سننے کا ذوق ہے۔''

(لداخ کی تاریخ کے اہم گوشے، ص 389)

جس طرح داستان گوئی ساری دنیا میں ختم ہو رہی ہے یا ہو چکی ہے۔ اسی طرح لداخ میں بھی داستان گوئی کی روایت کو خیر باد کہا جا چکا ہے۔ داستان کی جگہ ناول، افسانہ، اور دیگر اصناف نے لے لی ہے۔

لداخ میں اردو ناول

جہاں تک لداخ میں اردو ناول کا تعلق ہے۔ تو یہاں بتا دیا جائے کہ لداخ میں اردو ناول نگاری کا آغاز عبدالغنی شیخ کے ناول (وہ زمانہ) سے ہوا۔ انھوں نے اردو ناول کے ذریعے لداخ کے اردو ادب میں گراں قدر اضافہ کیا۔

عبدالغنی شیخ لداخ کے پہلے اردو ناول نگار ہیں جنھوں نے اپنے ناولوں میں لداخ کے اطراف میں بکھری ہوئی زندگیوں سے اپنے ناولوں کا تانا بانا تیار کیا ہے۔ وہ نہ صرف یہاں کے باشندوں سے متعلق واقعات کو ایک نئے انداز سے پیش کرتے ہیں بلکہ لداخ جیسے علاقے کی تہذیب و ثقافت اور یہاں کی زندگیوں کے مختلف رنگوں سے اردو دنیا کو روشناس بھی کراتے ہیں۔

عبدالغنی شیخ نے گزشتہ آدھی صدی سے زیادہ مدت سے لداخ میں اردو ناول کی شمع روشن رکھی ہے۔ عبدالغنی شیخ کے دو ناول ہیں۔ پہلا ناول 'وہ زمانہ' 1977 میں اور دوسرا ناول 'دل ہی تو ہے' 1978 میں کشمیر مرکنٹائلز پریس، سے شائع ہوئے۔ پہلا ناول 'وہ زمانہ' لداخ کے ماحول اور اس کی تہذب پر ایک تاریخی ناول ہے۔ اس ناول میں 1947 سے پہلے کے لداخ کی معاشرتی اور ثقافتی زندگی اور اس کے بعد رونما ہونے والی تبدیلیوں کو پیش کیا گیا ہے۔ یہ ایک ناول سے زیادہ تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں 1947 سے لے کر 1977 تک کے لداخ کے حالات و کوائف، تہذیب و تمدن، لباس، رسم و رواج غرض ہر ایک پہلو پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس ناول میں پلاٹ نہیں ہے بلکہ لداخ کے مختلف حالات و کوائف کو یکجا کر کے 120 ابواب پر مشتمل ناول کی شکل دی گئی ہے۔ اس لیے کہا سکتا ہے کہ 'وہ زمانہ' نہ صرف لداخ میں اردو کا پہلا ناول ہے بلکہ یہ ناول وہاں کی زندگی، رہن سہن، رسم و رواج اور تہذیب و ثقافت کی ایک مکمل تاریخ بھی ہے۔ مصنف خود اس ناول کے آغاز میں لکھتے ہیں:

''وہ زمانہ جو ایک ناول بھی ہے اور ایک تاریخ بھی، جس کی تخلیق میں ذاتی مشاہدات، یادداشتوں اور متعدد لوگوں اور بزرگوں کے احوال بیان کرنے کے علاوہ لداخ پر لکھی گئی 64 سے زائد کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔''

(عبدالغنی شیخ: وہ زمانہ، کشمیر مرکنٹائلز پریس، کشمیر، 1977، ص 3)

عبدالغنی شیخ کا دوسرا ناول 'دل ہی تو ہے' کے عنوان سے 1978 میں شائع ہوا۔ یہ ناول فنی نقطہ نظر سے لداخ میں اردو کا پہلا مکمل ناول ہے۔ جس میں پلاٹ، کردار نگاری، منظر نگاری، مکالمہ نگاری اور زبان و بیان کی عمدہ مثالیں موجود ہیں۔ یہ ایک رومانی ناول ہے۔ پلاٹ مربوط ہے۔ کہانی تین مرکزی کرداروں، سونم، پدما اور نیماں کے گرد گھومتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ناول میں لداخ کی تہذیب و تمدن میں یورپ کے اثرات کو واضح کیا گیا ہے جان محمد آزاد اس ناول کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

''یہ لیہہ کے پس منظر میں لکھا جانے والا اردو کا پہلا ناول ہے۔ لداخ کے ننگے پہاڑ اور ریتیلے میدان جو صدیوں سے خاموش اور گم صم تھے اچانک سیاحوں کی آمد سے جاگ اٹھتے ہیں۔ سیاحوں کی آمد سے جہاں متعدد لوگوں کی اقتصادی خوشحالی یقینی بن جاتی ہے وہاں اس سرزمیں کے لوگوں کا ذہنی سکون، ان کی انفرادیت اور معصومیت مجروح ہونے لگتی ہے۔''

(جان محمد آزاد: جموں و کشمیر کے اردو مصنفین، جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگوئجز، سری نگر، 2004، ص 204)

عبدالغنی شیخ کے ناولوں میں خیالی واقعات کے بجائے حقیقت نگاری جھلکتی ہے۔ مکالمے ادا کرنے میں موصوف نے ندرت اور جدت سے کام لیا ہے۔ ہر کردار اپنے مکالموں کی بدولت قاری کو ایک مقام دیتا ہے۔ کرداروں کے مکالمے لداخ کی تہذیب، کلچر، ماحول، حالات اور واقعات کو حقیقی انداز میں پیش کرتے ہیں۔

عبدالغنی شیخ کے بعد خطہ لداخ میں ناول نگاری کو فروغ دینے میں عبدالرشید راہگیر کا نام سرفہرست ہے۔ عبدالغنی شیخ نے لداخ میں اردو ناول کی بنیاد ڈال کر لداخ میں ادب برائے زندگی کی جو تصویر پیش کی۔ اسے عبدالرشید راہگیر نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں برقرار رکھتے ہوئے موجودہ عہد کے سماجی ماحول کی بخوبی ترجمانی کی ہے۔ انھوں نے ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا پھر وہ نثر نگاری کی طرف متوجہ ہوئے اور کئی خوبصورت افسانے، مضامین اور ناول لکھ کر ریاست کے ادیبوں میں اپنی منفرد شناخت قائم کی۔

عبدالرشید راہگیر کا پہلا ناول بعنوان 'احساس' 2011 ہے۔ اپنے اس تخلیقی کارنامے کی وجہ سے نہ صرف ان کا نام لداخ کے مصنفین میں درج ہے بلکہ وہ لداخ اور ریاست جموں و کشمیر کے نمائندہ ناول نگاروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ناول 'احساس' کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے دو اہم مقاصد کے تحت اسے لکھا ہے۔ پہلا جیسا کہ اس ناول کے سرورق پر ہی تحریر ہے کہ یہ ناول لداخ کے پس منظر میں لکھا ہے اور اسی مقصد کے تحت عبدالرشید راہگیر نے لداخی سماج و معاشرت، رسم و رواج اور تہذیب و تمدن کے تحفظ اور اسے نئی نسل میں منتقل کرنے کی کوشش کی ہے۔ دوسرا مقصد لداخ میں اردو زبان و ادب کو فروغ دینا اور نوجوانوں کو اس کی طرف مبذول کرنا ہے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے انھوں نے لداخ میں ادب تخلیق کرنے کی اس روایت کو تقویت بخشی ہے۔

وقت کے ساتھ ساتھ سماج میں بھی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں اور ان سماجی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ انسانی ضروریات اور سماجی تقاضوں میں بھی ردوبدل ہوتا ہے۔ عبدالرشید راہگیر نے انہی بدلتے حالات کو پیش کرتے ہوئے بچوں کی تعلیم و تربیت اور عوامی افکار و مسائل کو بحسن و خوبی پیش کیا ہے۔ یہ ناول لداخ کی عام زندگی کے کئی پہلوؤں کو اندر سمیٹے ہوئے ہے اور ناول نگار نے ہر پہلو کو مکمل طور پر پیش کرتے ہوئے زندگی کی تلخ حقیقتوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ نور شاہ عبدالرشید کی کہانیوں سے متعلق 'احساس' کے دیباچے میں یوں رقمطراز ہیں:

''عبدالرشید راہگیر کی کہانیوں کی بڑی خوبصورتی یہ ہے کہ ان میں مقامی رنگ ملتا ہے۔ مقامی حالات، واقعات ملتے ہیں اور مقامی کردار، مقامی زندگی کے ان گنت پہلوؤں میں مقامی رنگ ابھرتے ہیں۔ یہی بات ان کے ناول احساس کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔ راہگیر صاحب لداخ سے تعلق رکھتے ہیں اور احساس میں بھی انھوں نے لداخی ماحول کلچر معاشرت رہن سہن، تعلیم و تربیت رسم و رواج اور تہذیب و تمدن کی عکاسی قدم قدم اور لفظ لفظ میں اپنے انداز اور اپنے واشگاف لہجے میں کی ہے۔''

(عبدالرشید راہگیر: احساس، حرف آغاز، جے کے آفسیٹ پرنٹرس جامع مسجد دہلی، 2011، ص 5)

ناول کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ محسوس کیا جا سکتا ہے کہ یہ ان کا مشہور اور کامیاب ناول ہے جس سے نہ صرف لداخ

میں اردو زبان کی ترقی ہوئی بلکہ وہ لداخی معاشرے کی موجودہ صورت حال کا ایک مکمل منظرنامہ بھی پیش کرتے ہے انھوں نے ناول کی ابتدا میں 'حرف آغاز' کے زیر عنوان تحریر کیا ہے:

''لداخ کے بودھ اور مسلم روایتی بھائی چارے کی ساری دنیا میں نہ صرف دھوم ہے بلکہ مہذبانہ مہمان نوازی کی تو بڑھ چڑھ کر مثالیں دی جاتی ہیں جو لداخ قوم کے لیے باعث افتخار ہے۔ ہمیں اپنے آباواجداد سے یہی تو ورثے میں ملا ہے۔ اس ورثے کو قدر و منزلت اور بہترین حکمت عملی کے ساتھ نئی نسلوں میں جوں کا توں منتقل کرتے رہنا نہ صرف لداخی قوم کی ذمہ داری ہے بلکہ فرض اولین بھی۔'' (ایضاً، ص 8)

رشید راہگیر کا دوسرا ناولٹ 'مہربان' ہے جو زیر طبع ہے۔ ناول کے علاوہ انھوں نے اپنے افسانوں میں بھی لداخ کے ساتھ ساتھ کشمیر کے ناسازگار حالات پر گہری نگاہ ڈال کر اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا ہے۔

لداخ کے ناول نگاروں نے اپنے عہد کے مسائل کو اپنے ناولوں میں پیش کر کے لداخ جیسے برفیلے علاقے میں اردو ناول کی شمع روشن رکھی ہے۔ وہ نہ صرف یہاں کے باشندوں سے متعلق واقعات کو ایک نئے انداز سے پیش کرتے ہیں بلکہ لداخ جیسے علاقے کی تہذیب و ثقافت اور یہاں کی زندگیوں کے مختلف رنگوں سے اردو دنیا کو روشناس بھی کراتے ہیں۔ یہاں کے ناول نگار محض روایت پرست نہیں ہیں بلکہ ان کے یہاں موضوعات اور اسالیب کے کئی رنگ ملتے ہیں۔ مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اگر چہ لداخ میں اردو ناول کا آغاز 1947 کے بعد سے ہوا لیکن تقسیم ہند کے بعد اس میدان میں عبدالغنی شیخ اور عبدالرشید راہگیر نے لداخ جیسے برفیلے علاقے میں اردو فکشن کو زندہ رکھنے کے لیے جو کارنامے انجام دیے ہیں اور دے رہے ہیں۔ وہ قابل ستائش اور خوش آئندہ مستقبل کے ضامن ہیں۔

لداخ میں اردو افسانہ:

لداخ میں اردو افسانہ نگاری کا آغاز اکبر لداخی کے افسانہ (داغ) سے ہوا۔ انھوں نے لداخ کی تہذیب و ثقافت کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ ان کے افسانے ترقی پسند رجحان کے ترجمان رسالے 'آزاد' میں باقاعدگی سے شائع ہوتے رہے۔ اکبر لداخی نے افسانے کے علاوہ مختلف عنوانات پر مضامین بھی لکھے ہیں جو تعمیر، شیرازہ وغیرہ میں چھپ کر منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ترقی پسند تحریک سے ان کا گہرا لگاؤ رہا اور وہ اس تحریک کے لیے ریاست میں سرگرم بھی رہے۔ لداخ کے اردو لکھنے والوں میں اپنے ذوق اور رجحانات کی بدولت اکبر لداخی کافی مشہور ہیں۔ انھوں نے لداخ میں پہلا افسانہ لکھا جس کا نام 'داغ' ہے۔ یہ لداخ کا پہلا افسانہ ہے۔ جس میں لداخ کی تہذیب و ثقافت کے بارے میں قیمتی معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ ان کے بارے میں جان محمد آزاد اپنی کتاب 'جموں کشمیر کے اردو مصنفین' میں یوں رقم کرتے ہیں:

''لداخ کے بیش بہا لوک گیتوں کے علاوہ آپ کے مضامین ہمیں لداخ کی تہذیب کی بعض بوالعجبیوں سے بھی آگاہ کراتے ہیں۔ وہ ہمیں ایسے دیہات کی سیر کراتے ہیں جہاں اگر بچے کا باپ مسلمان ہے تو ماں بودھ ہے۔ ماں مسلم ہے تو باپ بودھ ہے ان علاقوں میں وہ ہمیں ایسے کرداروں سے ملاتے ہیں جن کا نام 'علی تشی وانگل' ہے۔ دو بھائی جن میں سے ایک مسلمان ہو گا تو ایک بودھ۔ بودھ گنپہ مرمت طلب ہو تو مسلم بودھ مل کر اور اگر مسجد کی مرمت مطلوب ہو تو بودھ مسلم مل کر اس کی تجدید کریں گے۔ ان ہی خوبیوں کا حامل آپ کا افسانہ 'داغ' بے حد مقبول ہوا۔''

(جان محمد آزاد: جموں کشمیر کے اردو مصنفین، میکاف پرنٹرس، دہلی 2004، ص 181)

اکبر لداخی نے افسانے کے علاوہ بہت سے مضامین بھی لکھے ہیں۔ آپ کا ایک مضمون 'لداخ کے گیت' ماہنامہ 'آزاد' میں 1952 میں شائع ہوا۔ اس طویل مضمون میں آپ کے طرز بیان کی شگفتگی آپ کی تخلیقی معنویت اور جاذبیت کا واضح اظہار ملتا ہے۔ اردو کے مشہور محقق اور ادیب عبدالقادر سروری اکبر لداخی کے افسانے اور مضامین کے بارے میں یوں تحریر کرتے ہیں:

''اکبر ادب کا ستھرا ذوق رکھتے ہیں افسانے اور مضامین بھی انھوں نے لکھے ہیں۔ ان کا افسانہ 'داغ' بہت مقبول ہوا اور اس افسانے کی وجہ سے ان کی شہرت بھی ہوئی 'گونگ پوش' کے لیے بھی وہ لکھتے تھے۔ چنانچہ اس کے پہلے شمارہ 'جون 1952' کے لیے انھوں نے لداخی گیت کا تعارف مرتب کیا۔ یہ اس دور دراز سرزمین کے بارے میں قیمتی معلومات آفرین مضمون ہے جس سے لداخ کے سرزمین، موسم، مزاج اور لداخی کے ادبی انداز اظہار کے بارے میں قیمتی معلومات فراہم ہوتی ہیں۔''

(کشمیر میں اردو، مرتب: محمد یوسف ٹینگ (جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز، سری نگر 1984، تیسرا حصہ ص 195، بحوالہ لداخ میں اردو زبان و ادب، رقیہ بانو، ص 16-215، شاہد پبلی کیشنز، نئی دہلی 2014)

ان باتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اکبر لداخی نے سب سے پہلے اردو افسانہ اور مضامین میں لداخ کی تہذیب و ثقافت، رسم و رواج اور یہاں کے موسم کے مزاج کے بارے میں اپنی تخلیقی صلاحیت سے پوری دنیا کو متعارف کرایا۔ انھوں نے اپنے افسانے میں لداخی کلچر کو نمایاں طور پر پیش کیا ہے۔ لداخ میں اردو افسانے کا آغاز انھیں کے ہاتھوں سے ہوا لیکن اب تک ان کا کوئی افسانوی مجموعہ یا ان کے افسانوں پر لکھی ہوئی کتاب منظر عام پر نہیں آئی۔

اکبر لداخی کے بعد جس معتبر اور مشہور افسانہ نگار سے لداخ میں اردو افسانے کا باقاعدہ طور پر آغاز ہوا وہ عبدالغنی شیخ ہیں۔ جنھوں نے لداخ جیسے برفیلے علاقے میں اردو فکشن کو زندہ رکھا ہے انھوں نے اپنے افسانوں میں لداخ کے اطراف سے کرداروں کو اٹھایا اور انھیں اپنے افسانوں کے ذریعے زندہ کر دیا۔ وہ یہاں کے باشندوں سے متعلق واقعات کو ایک نئے انداز سے پیش کر کے لداخ جیسے علاقے کی تہذیب و ثقافت اور یہاں کی زندگیوں کے نہ صرف مختلف رنگوں سے اردو دنیا کو روشناس کراتے ہیں بلکہ خود لداخ جیسی برفیلی زمین پر اردو کی آبیاری بھی کر رہے ہیں۔ نور شاہ لکھتے ہیں:

''عبدالغنی شیخ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے لداخ جیسے برفیلے علاقے میں اردو افسانوی ادب کو زندہ رکھا اور اپنے افسانوں میں لداخ کے اطراف میں بکھری ہوئی زندگی اور زندگی سے وابستہ ان گنت واقعات اور حالات کو ایک منفرد انداز سے سمیٹا اور پیش کیا۔''

(نور شاہ: جموں و کشمیر کے اردو افسانہ نگار، میزان پبلشرز، سری نگر، کشمیر، 2011، ص 87)

عبدالغنی شیخ سے لداخ میں با قاعدہ طور پر اردو افسانہ نگاری کا آغاز ہوا۔ انھوں نے گزشتہ آدھی صدی سے زیادہ مدت سے لداخ میں اردو افسانے کی شمع روشن رکھی ہے۔ اُن کے چار افسانوی مجموعے چھپ کر منظر عام پر آ چکے ہیں۔ پہلا افسانوی مجموعہ 'زوجیلا کے آر پار' 1970 میں شائع ہوا۔ اس مجموعے میں کل دس افسانے ہیں۔ جیسا کہ مجموعے کے نام سے یہ ظاہر ہے 'زوجیلا کے آر پار' زوجیلا کی حد بندی کشمیر کے آخری ضلع گاندر بل کے ساتھ ختم ہوئی ہے۔ یہاں سے ہی ضلع کرگل (لداخ) کی ابتدا ہوتی ہے۔ زوجیلا مشکل ترین درہ ہے اس کی بل کھاتی ہوئی سڑک سے گزر کر انسان ایک دوسری ہی دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ جہاں سے فلک بوس اور نہ ختم ہونے والے ننگے پہاڑوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس مجموعے کی پانچ کہانیاں انھیں ننگے پہاڑوں کے بیچ بسے انسانوں کی ہیں۔ جبکہ باقی پانچ کہانیاں زوجیلا کے اس پار کشمیر اور ملک کے بعض دیگر حصوں کے پس منظر میں لکھی گئی ہیں۔ اس مجموعے کے ذریعے انھوں نے پہلی مرتبہ لداخ کے اردو ادب میں ادب برائے زندگی کے اہم تصور کو شامل کیا۔ ان کا یہ مجموعہ اس لیے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ ان کی ادبی زندگی کا آغاز بھی اسی سے ہوا۔ اس میں 'دوسرا اور آنسو'، 'گنجا' اور 'دادی اماں' جیسی مشہور کہانیاں شامل ہیں۔

'دوراہا' عبدالغنی شیخ کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ 1993 میں شائع ہوا۔ اس افسانوی مجموعے میں کل 23 افسانے شامل ہیں۔ یہ سارے افسانے ملک کے اہم رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس میں انھوں نے رومانیت پسندی اور حقیقت نگاری کا ایک حسین امتزاج قائم کیا ہے۔

عبدالغنی شیخ کا تیسرا افسانوی مجموعہ Forsaking Paradise (اردو افسانوں کا انگریزی ترجمہ) ہے جو 2001 میں شائع ہوا۔ اس میں کل 12 کہانیاں ہیں۔ یہ عبدالغنی شیخ کی اردو اور لداخی کہانیوں کا انگریزی ترجمہ ہے یہ ترجمہ امریکہ میں مقیم ایک خاتون ڈاکٹر اگروال نے کیا۔

'دو ملک، ایک کہانی' عبدالغنی شیخ کا چوتھا افسانوی مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ 2015 میں شائع ہوا۔ اس میں کل 45 افسانے شامل ہیں جو ہندوستان کے مختلف اردو رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس مجموعے میں شامل زیادہ تر افسانوں میں انھوں نے لداخ اور وادی کشمیر کے مسائل کو موضوع بنایا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اس میں مزاحیہ اور طنزیہ افسانے بھی تحریر کیے ہیں۔ جیسے کھودا پہاڑ نکلا چوہا، ایک انار سو بیمار اور اکبر بادشاہ کی دوبارہ آمد شامل ہے ان کی ہر کہانی انسانی نفسیات، زندگی کی تلخ سچائیوں اور سماج کی حقیقی صورت حال کو بڑی خوبصورتی سے پیش کرتی ہے۔

عبدالغنی شیخ نے اپنے افسانوی مجموعے میں طبقاتی کشمکش، سماجی نابرابری، رشوت خوری اور ظلم و تشدد کو موضوع بنایا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ پیار و محبت کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔ شیخ کی تحریروں میں لداخی ماحول ان کا رہن سہن، لباس کلچر، بودھی اور اسلامی تہذیب کی جھلک ملتی ہے۔ اس کے علاوہ یہاں کے سیدھے سادے لوگوں کی زندگی کے مسائل اور نفسیاتی الجھنوں کے ساتھ ساتھ منظر نگاری، پلاٹ سازی، کردار نگاری، واقعہ نگاری کے جوہر دکھائے ہیں۔ ان کے افسانوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انھیں اپنے مادر وطن لداخ سے بے پناہ محبت ہے۔ جس کا جابجا اظہار ان کی کہانیوں میں ملتا ہے۔ انھیں اپنا کلچر اور تہذیب و تمدن بڑا عزیز ہے۔ ایک جگہ برج پریمی کو اپنے خط میں لکھتے ہیں:

''لداخ میرا وطن ہے۔ یہاں کے تمدن و معاشرے کی نیرنگیاں میرے ذہن میں آج بس گئی ہیں۔ ہر گھر کے کنج اور ہر کوچے کی نکڑ پر مجھے یہاں کے معاشرے سے متعلق کہانیاں بکھری ملتی ہیں اور میں ان کی عکاسی کرنا اپنا پہلا فرض جانتا ہوں آپ مجھ سے اور کہانیاں ڈرامے وغیرہ طلب کر سکتے ہیں جو یہاں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے نقاب اٹھاتی ہیں۔''

(ماہنامہ دیش، سری نگر، 1978، ص 40)

عبدالغنی شیخ کے بعد جس افسانہ نگار نے لداخ جیسے بر فیلے علاقے میں اردو افسانے کو کافی بلندی تک پہنچایا وہ عبدالرشید راہگیر ہیں انھوں نے ادبی زندگی کا آغاز شعر و شاعری سے کیا پھر وہ نثر کی طرف متوجہ ہو گئے اور کئی خوبصورت افسانے، مضامین اور ناول لکھ کر ریاست کے ادیبوں میں اپنا مقام بنایا ہے۔ ان کا تعلق لداخ کے ضلع کرگل سے ہے کچھ عرصے سے سری نگر میں سکونت پذیر ہیں، لیکن ان کے افسانوں اور ناولوں سے پتہ چلتا ہے کہ انھیں لداخ کی تہذیب و ثقافت سے والہانہ محبت ہے، کیونکہ ان کے افسانوں اور ناولوں میں لداخ کی تہذیب و ثقافت کی عکاسی ملتی ہے۔ راہگیر کے افسانے، ناول، غزل اور مختلف موضوعات پر مضامین کشمیر عظمیٰ، شیرازہ، کرگل نمبر اور لداخ سپیشل میں چھپتے رہتے ہیں۔

اردو افسانہ نگاری کے حوالے سے ان کا پہلا افسانوی مجموعہ 'اندھیرا سویرا' کے عنوان سے 2014 میں شائع ہو چکا ہے اس مجموعے میں کل تیرہ افسانے شامل ہیں جن میں افسانہ نگار کے مشہور افسانے کفارہ، اندھیرا سویرا، پتھر دل، بے یار مسافر، مطلبی وغیرہ شامل ہیں جو ریاست کے نمائندہ اخبارات اور رسائل میں بھی اشاعت پذیر ہوئے۔

اس مجموعے میں انھوں نے وادی کشمیر اور لداخ کی مختلف رسومات و ثقافت کے ساتھ ساتھ یہاں کے سماجی مسائل کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ جس طرح ہر افسانہ نگار اپنے افسانوں میں زندگی کے کسی ایک پہلو کو اجاگر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی طرح عبدالرشید راہگیر نے بھی اپنی کہانی میں زندگی اور سماج کے مختلف پہلوؤں کو موضوع بنا کر اپنے افسانوں کی تخلیق کی۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ اپنے افسانوں میں مختلف سماجی پہلوؤں کو اس طرح ضم کر دیتے ہیں کہ اس میں فن افسانہ نگاری کا معیار بھی قائم رہتا ہے اور قاری بیک وقت کئی سماجی مسائل سے باخبر بھی ہو جاتا ہے۔ یہی مصنف کا کمال فن ہے کہ وہ جب ہمارے معاشرے کا کوئی ایک پہلو پیش کرتا ہے تو اسی میں ہمیں پورا معاشرہ نظر آتا ہے۔

ان کے فن افسانہ نگاری کے حوالے سے نور شاہ لکھتے ہیں:

''ان کی کہانیوں میں کوئی الجھاؤ نہیں، بے جا فلسفہ نہیں۔ وہ اپنے انداز سے کہانی لکھتے ہیں اور پیش کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی کہانیاں پڑھ کر زندگی کے اکثر پہلو کی تصویریں سامنے آتی ہیں اور کچھ سوچنے پر مجبور کرتی ہیں۔''

(عبدالرشید راہگیر: اندھیرا سویرا، جے کے آفسیٹ پرنٹرس جامع دہلی، 2014، ص 7)

انھوں نے اپنے افسانوں میں سیاسی، سماجی، تہذیبی، ثقافتی، انسانیت اور اعلیٰ اخلاق جیسے موضوعات کو پیش کر کے یہاں کے عصری ماحول کی مکمل ترجمانی کی ہے۔ عبدالرشید راہگیر نے اپنے افسانوں کا مرکز خطہ لداخ کو بنایا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ان کا تعلق لداخ سے ہے اور دوسرے یہ کہ لداخ کے سماجی مسائل کو اب تک وہاں کے چند مقامی ادیبوں کے علاوہ ریاست کے کسی ادیب نے اپنی تخلیقات میں شامل نہیں کیا تھا۔ عبدالغنی شیخ نے پہلی مرتبہ ان پر قلم اٹھایا اور عبدالرشید راہگیر ان کی پیروی کرتے ہوئے خطہ لداخ کے سماجی۔ سیاسی۔ تعلیمی، تہذیبی اور ثقافتی پہلوؤں کو اپنی کہانیوں میں شامل کیا ہے۔

انھوں نے اپنے افسانوں میں سیاسی و سماجی انتشار، تہذیبی و ثقافتی اقدار اور اخلاقیات سے متعلق موضوعات کو پیش کر کے ریاست جموں و کشمیر اور خصوصا لداخ کے عصری حالات کی مکمل ترجمانی کی ہے۔

ان کے ساتھ ساتھ لداخ میں کچھ نئے چہرے ابھرے جنھوں نے اردو افسانے کو نئی جہت سے روشناس کرایا ہے۔ ان میں محمد شفیع ساگر، رضا امجد بڈگامی، جواد جالب امینی، شبیر مصباحی اور احمد الیاس لون وغیرہ کے نام خاص طور پر لیے جا سکتے ہیں۔ جواد جالب امینی اور رضا امجد بڈگامی کے افسانے کرگل نمبر اور لداخ سپیشل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ رضا امجد بڈگامی کا افسانہ یہ کیسا رشتہ، حواس اور وفا، فراق اور جواد جالب امینی کا تقدیر ذرا دیکھو، چائے پانی وغیرہ لداخ سپیشل اور کرگل نمبر میں چھپ کر ریاست کے اردو داں طبقوں میں اپنی پہچان بنا چکے ہیں۔ ان کے علاوہ شبیر مصباحی اور احمد الیاس لون وغیرہ لداخ میں افسانے کی آبیاری کر رہے ہیں۔

مختصر طور پر کہا جا سکتا ہے کہ لداخ میں ان فکشن نگار کے علاوہ اور بھی کئی فکشن نگار ہیں جنھوں نے اردو زبان کے علاوہ اپنی مادری زبان جیسے لداخی، بلتی، پرگی اور شیناہ زبان میں بھی داستان، ناول اور افسانے لکھے ہیں۔ لیکن ان کی تحریریں اب تک کسی رسالے کی زینت نہیں بن سکیں۔ امید کی جاتی ہے کہ جلد ان کی تخلیقات بھی اردو کے معتبر رسالوں اور جریدوں میں شائع ہوں گی۔ عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ ادبی رسالے غیر معروف لکھنے والوں کی تحریروں پر کم توجہ دیتے ہیں، جس کے سبب ان نئے قلم کاروں کی تخلیقات زیور طباعت سے آراستہ ہونے کی بجائے خانہ فراموشی میں گم ہو جاتی ہیں۔

■

Mohd Shareef
Research Scholar, Dept of Urdu
Punjab University
Chandigarh- 160014 (Punjab)
Mob.: 8899238784

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کی لسانی خدمات: ایک جائزہ

سوشیل کمار

ڈاکٹر زور حیدرآباد کے ایک محلے شاہ گنج میں 1905 عیسوی میں پیدا ہوئے تھے۔ ایم،اے تک ان کی تعلیم حیدرآباد سے ہوئی،اعلی تعلیم یعنی پی ایچ ڈی کی ڈگری انھوں نے لندن یونیورسٹی سے حاصل کی تھی۔ڈاکٹر زور کو طالب علمی کے زمانے سے ہی ادبی وعلمی کاموں میں غیر معمولی دلچسپی تھی۔ اس کا ثبوت ان کی وہ تصنیفات وتخلیقات ہیں جوانھوں نے طالب علمی کے زمانے میں لکھی تھیں۔'طلسم تقدیر'اور'فسانہ تازیانہ' دونوں ہی طویل اور نیم تاریخی افسانے ہیں جو 1925 میں شائع ہوئے جب وہ بی اے کے طالب علم تھے۔'روح تنقید' کی دوسری جلد(روح تنقید،جلد دوم) شائع کی۔ 1930 میں ہندوستانی فونیٹکس (Hindustani Phonetics)، 1932 میں 'ہندوستانی لسانیات' اردو زبان میں حیدرآباد سے شائع ہوئی۔ 1934 میں اردو اکیڈمی کی فرمائش پر'تذکرہ گلزار ابراہیم' مع تذکرہ گلشن ہند کی تنقیدی تدوین کی،اس طرح ڈاکٹر زور کی تصنیفات وتخلیقات اور دیگر ادبی خدمات کا سلسلہ جاری رہا۔ادارہ ادبیات اردو قائم کیا، جس کے قائم کرنے کے کئی مقاصد تھے،لیکن خاص اور مرکزی مقصد اردو زبان کی ترقی وترویج تھا۔ رسالہ'سب رس' کا اجرا کیا، جو 1938 سے لے کر آج تک مسلسل جاری ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بھی قائم کیا۔ ڈاکٹر زور نے طالب علمی کے دوران تصنیفات وتخلیقات کا کام شروع کیا جو بعد میں دوران ملازمت اور پھر ریٹائر ہونے کے بعد آخری عمر تک جاری رہا۔

ڈاکٹر زور نے افسانہ نگاری، تنقید، تحقیق، تذکرہ نگاری، مخطوطات۔تنقیدی تدوین،سوانح نگاری،لسانیات وصوتیات اور ادبی تاریخ نگاری وسوانح نگاری وغیرہ مختلف ادبی وعلمی میدانوں میں خدمات انجام دی ہیں،جس کے نتیجے میں آج ہمارے سامنے 57 سے زیادہ کتابیں اور 300 سے زیادہ مضامین موجود ہیں۔ڈاکٹر زور کے فرزند رفیع الدین قادری نے ان تمام مضامین کو موضوعات کی نوعیت کے مطابق پانچ جلدوں میں مرتب کر کے ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی سے شائع کرایا ہے۔

ڈاکٹر زور کی خدمات کے پیش نظر قومی وبین الاقوامی سطح پر ماہرین ادبیات نے ڈاکٹر زور کی خدمات کے مختلف پہلوؤں پر مختلف زاویوں سے نظر ثانی کرتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور ڈاکٹر زور کی خدمات کو سراہا ہے۔ڈاکٹر زور کی مجموعی خدمات کی ایک طویل فہرست ہے۔ ہمارا موضوع ''ڈاکٹر زور کی لسانی خدمات کے تعلق سے ہے۔ڈاکٹر زور کی لسانیات کے حوالے سے دو تصانیف ہیں:

1 'ہندوستانی فونیٹکس' یعنی ہندوستانی صوتیات۔ یہ کتاب انگریزی زبان میں ہے۔

2 'ہندوستانی لسانیات، یہ کتاب اردو زبان میں ہے۔

ان کے علاوہ ڈاکٹر زور نے لسانیات پر مبنی مضامین بھی لکھے ہیں جنھیں بعد میں رفیع الدین قادری (فرزند ڈاکٹر زور) نے مرتب کر کے 'افادات زور'۔جلد نمبر پنجم (لسانیات) کے نام سے شائع کرایا ہے۔ اس میں ڈاکٹر زور کی لسانیات کے تعلق سے 18 مضامین شامل ہیں۔

ہندوستانی فونیٹکس 1930 میں (Imprimerie L Union Typographique, Villeneuve Saint Georges Paris)۔ فرانس سے شائع ہوئی تھی۔ یہ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے،جس میں کل 116 صفحات ہیں۔ اس کتاب کا مقدمہ ڈاکٹر جولیس بلوک (Dr. Jules Bloch) نے لکھا ہے۔ مقدمہ میں ڈاکٹر جولیس بلوک نے ہندوستانی فونیٹکس پر مفصل روشنی ڈالتے ہوئے زور کی لسانی خدمات کو سراہا ہے۔ اگرچہ ہندوستانی زبانوں کی صوتیاتی وضاحت کے تعلق سے رسالوں کی تعداد ابھی تک بہت کم ہے۔

ڈاکٹر قادری نے ہندوستانی زبانوں کے متعلق کیے گئے جن کاموں کا حوالہ دیا ہے ان میں وہ منفرد کام جو پلیٹوگرام اور تحریری ریکارڈ کی تصویروں کو ظاہر کرتا ہے جسے پیرس میں تیار کیا گیا ان مفید ایکس رے کی تصویروں کا ذکر بھی ضروری ہے جن کا اضافہ ڈاکٹر بوڈ نگ نے اپنی سنتالی گرامر میں کیا ہے۔ ڈاکٹر قادری زور نے لندن اور پیرس میں اپنے مختصر قیام سے فائدہ اٹھایا ہے۔

ڈاکٹر جولیس بلوک نے کچھ صوتی مسائل کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جیسے اردو اور دوسری زبانوں میں حرف علت کی لمبائی پر نئے سرے سے ضرورت کے علاوہ صوتی دباؤ کے پریشان کن مسئلے کا ذکر بھی کیا ہے۔موجودہ وقت میں آلات کے ذریعے جس کی پیمائش بہترین طریقے سے ہوسکتی ہے۔ اگرچہ ڈاکٹر زور نے اپنی زبان کی ایک شکل یعنی دکنی اردو کو اپنے مطالعے کا پہلا مقصد بنا کر بہترین طریقہ اپنایا ہے

صوتیات میں ڈاکٹر قادری زور کی یہ خدمت نہایت ہی دلچسپ اور اصلی ہے۔

ڈاکٹر زور لکھتے ہیں کہ ہندوستانی یا اردو بولنے والوں کی تعداد ایک سوملین سے زیادہ ہے اور یہ ہندوستان کے ہر بڑے شہر میں سمجھی جاتی ہے اگرچہ ہر صوبے یا علاقے میں صوتی اختلاف ملتا ہے۔ تاہم یہ اختلاف اتنا بڑا نہیں جس کی وجہ سے ملک کے مختلف حصوں میں ہندوستانی بولنے والوں کے درمیان عدم تفہیم کی صورت پیدا ہو۔

اس کتاب کے پہلے باب میں ڈاکٹر زور نے ہندوستانی یعنی اردو زبان کی تاریخی ترقی اور اس میں واقع ہونے والی بعد کی تبدیلیوں اور اردو کی دو اہم شکلوں (شمالی، دکنی) کے درمیان بنیادی لسانی اختلافات کے بارے میں جائزہ لیا گیا ہے۔ عام درجہ بندی سے قطع نظر تقریباً تمام اہم اختلافات اور تفصیلات پر تبادلہ خیال کرتے ہوئے تین ابواب میں ہر آواز کا علیحدہ ذکر کیا ہے۔ اختلافات کو ظاہر کرنے کے لیے ڈاکٹر زور نے معیاری دکنی کا حوالہ دیا اور ان لہجوں کو شکلوں کے طور پر پیش کیا ہے۔ ان میں بہت سی شکلیں دوسرے ہندوستانی لہجوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔

اس کتاب میں کہیں بھی ڈاکٹر زور نے عام صوتیات کے عام اصول، طریقوں اور اصطلاحات پر بحث نہیں کی ہے اگرچہ اس موضوع پر انگریزی زبان میں کئی کتابیں دستیاب ہیں۔ جدید صوتی طریقوں کو کچھ ہندوستانی زبانوں یعنی پنجابی، سنہلی، بنگالی اور اودھی وغیرہ پر پہلے لاگو کیا جاچکا ہے۔

اس کتاب کے پہلے باب میں ڈاکٹر زور نے تمہید دو ذیلی عنوانات کے تحت یعنی تاریخی ارتقا اور شمالی ہند اور جنوبی ہند کی اردو میں تلفظ کے اختلافات کا جائزہ لیتے ہوئے مفصل بحث کی ہے۔

ڈاکٹر زور لکھتے ہیں کہ اردو زبان کا آغاز ابتدائی مسلم فتوحات کے عہد میں فارسی اور شمالی ہند میں بولی جانے والی زبان کے میل جول کے اثر سے ہوا۔ اس زبان نے کب اور کس زمانے میں ایک آزاد اور منفرد روپ اختیار کیا، اس کے بارے میں سائنٹفک تحقیق کرنے کی بہت کم عالموں نے کوشش کی ہے، اور اس کے لیے جو مواد دستیاب ہے وہ ناکافی ہے۔

ڈاکٹر زور جس زمانے میں یہ کتاب لکھ رہے تھے اس وقت حافظ محمود شیرانی کی 'پنجاب میں اردو' کے علاوہ کوئی باقاعدہ کتاب دستیاب نہیں تھی۔ اگرچہ اس کے بعد ڈاکٹر زور، شوکت سبزواری وغیرہ کے علاوہ مسعود حسین خان نے باقاعدہ اردو زبان پر تحقیق کر کے مناسب مواد و تاریخی اور لسانی شواہد کے ساتھ اردو زبان کے آغاز وارتقا، ماخذ اور مقام کو ثابت کیا۔

ڈاکٹر زور نے اردو زبان کے لیے اکثر ہندوستانی لفظ کا استعمال کیا ہے اردو کے آغاز کے بارے میں مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد اور حملوں اور ان کی وجہ سے جو لسانی اثرات پڑے ہیں ان کا بخوبی جائزہ لیا ہے۔

ڈاکٹر زور نے مالابار اور سندھ سے اردو زبان کے آغاز کو لسانی بنیادوں پر رد کیا ہے۔ ڈاکٹر زور نے محمود شیرانی کے نظریے کا اعتراف بھی کیا ہے اور احتراز بھی، پنجابی اور اردو دونوں ایک ہی اصول کے تحت لسانی اور نحوی ارتقا پاتے رہے۔ مصنف نے اس سلسلے میں کئی حوالے اور مثالیں پیش کی ہیں۔ ان کی دوسری دلیل سے واضح ہوتا ہے کہ اردو میں چند اجزا ایسے ہیں جن کی توضیح صرف عہد حاضر کی پنجابی ہی کے مطالعے اور اس پر غور و خوض کرنے سے ہو سکتی ہے۔ چند عناصر ایسے ہیں جن کا حوالہ سوائے پنجابی کے کسی اور زبان میں نہیں۔ مگر یہ خصوصیتیں زیادہ تر لفظی حیثیتوں اور صوتی تغیرات کے متعلق ہیں جو خصوصیتیں براہ راست تغیر زبان سے تعلق رکھتی ہیں۔ موجودہ اردو میں ان کا کوئی وجود نہیں۔ وہ صرف قدیم دکنی کارناموں میں نظر آتی ہیں۔ پروفیسر شیرانی نے جو مواد پیش کیا ہے وہ نہایت ہی مفید اور اردو کے آغاز کے متعلق مفید نتیجوں پر پہنچنے کے لیے کافی ممد و معاون ثابت ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر زور لکھتے ہیں کہ اردو زبان کا آغاز عام مستند رائے کے مطابق اس وقت سے ہوتا ہے جب محمد غوری نے دہلی کی سلطنت فتح کی اور اس کے بعد اس حصۂ ملک میں ایک طویل عرصے تک مسلمان حکمراں رہے۔ متعدد مصنفوں کی رائے ہے کہ اردو دہلی میں فارسی اور ہندی کے میل جول کا فطری نتیجہ ہے۔ محمد تغلق کی فوجیں اس زبان کو دکن لے گئیں۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ اس کا تعلق ان زبانوں سے ہے جو دہلی کے گرد و نواح میں بولی جاتی تھیں۔ یہ رائے بھی کلیتاً صحیح نہیں۔ اس میں بھی بہت کچھ ترمیم کی گنجائش ہے۔

اردو کا سنگ بنیاد دراصل مسلمانوں کی فتح دہلی سے بہت پہلے ہی رکھا جاچکا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اس نے اس وقت تک ایک مستقل زبان کی حیثیت نہیں حاصل کی، جب تک کہ مسلمانوں نے اس شہر کو اپنا پایہ تخت نہ بنالیا۔ اردو اس زبان سے مشتق ہے جو بالعموم جدید ہند آریائی دور کے آغاز کے وقت میں اس حصۂ ملک میں بولی جاتی تھی جس کے ایک طرف عہد حاضر کا شمال مغربی سرحدی صوبہ اور دوسری طرف الہ آباد۔ اگر یہ کہا جائے تو صحیح ہے کہ اردو اس زبان پر مبنی ہے جو پنجاب میں بارہویں صدی عیسوی میں بولی جاتی تھی مگر اس سے تو یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اس زبان پر مبنی نہیں ہے جو اس وقت دہلی کے اطراف اور دوآبہ گنگ وجمن میں بولی جاتی تھی۔ کیونکہ ہند آریائی دور کے آغاز کے وقت پنجاب کی اور نواح دہلی کی زبانوں میں بہت کم فرق تھا۔

ڈاکٹر زور نے اردو زبان کے لسانی اور تاریخی پہلوؤں اور وجوہات کی مدلل بحث کرتے ہوئے پنجابی اور کھڑی بولی کے مشترک سرچشمے کو اردو کا ماخذ قرار دیا ہے۔

ڈاکٹر زور لکھتے ہیں کہ اردو نہ تو پنجابی سے مشتق ہے اور نہ کھڑی بولی سے بلکہ اس زبان سے جو ان دونوں کی مشترک سرچشمہ تھی اور یہی وجہ ہے کہ وہ بعض باتوں میں پنجابی سے مشابہ ہے اور بعض میں کھڑی سے لیکن بعد میں اردو زیادہ تر کھڑی بولی سے ہی متاثر ہوتی گئی۔ اس کی وجہ ڈاکٹر زور نے مسلمانوں کے صدر مقام دہلی اور آگرہ بتائے ہیں۔

دوسرے ذیلی عنوان میں ڈاکٹر زور نے شمالی ہند اور جنوبی ہند کی اردو کے اختلافات کا جائزہ لیا ہے۔ بہمنی سلطنت کے قیام کے بعد دکن اور شمالی ہند سیاسی اعتبار سے ایک دوسرے سے جدا ہوئے تو ان دونوں مقامات کے لسانی اتحاد کا شیرازہ بکھر گیا۔ ڈاکٹر زور نے شمالی ہند اور جنوبی ہند کی اردو کی پانچ وجوہات کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ ان دونوں جگہوں پر غیر مسلم ہمسایوں کا اثر تھا۔ شمال میں ہندو اگرچہ ایک ہی زبان بولتے تھے لیکن دکن میں ان کی بہت سی زبانیں تھیں، جو مختلف خاندان السنہ سے تعلق رکھتی تھیں اور جن میں کوئی آریائی اور کوئی دراوڑی تھی۔ اس کے علاوہ فارسی ترکی کے اثرات کا جہاں تک تعلق تھا شمال میں فارسی کا اثر سیاسی دائرے تک ہی محدود نہیں تھا، بلکہ فارسی ادب پر بھی حاوی تھا۔ دکن کے مسلمانوں نے چار یا پانچ زبانوں کے عناصر اپنی زبان میں شامل کیے تھے لیکن فارسی کے کم الفاظ استعمال کیے تھے۔

اسی طرح کی دیگر تمام وجوہات سے شمالی ہند اور جنوبی ہند کی اردو میں دو طرح کے اختلافات پیدا ہوئے۔ شمالی ہند کی زبان کھڑی بولی سے اس طرح متاثر ہوئی کہ اس نے اپنی بہت سی قدیم خصوصیات کھودیں۔ برخلاف اس کے دکنی نے انھیں قائم رکھا۔

شمالی ہند کی اردو بڑی حد تک فارسی سے متاثر ہوئی جبکہ دکنی میں چند دراوڑی عناصر کا اضافہ ہوا۔ یہ عمل کافی عرصے تک جاری رہا جس کی وجہ سے شمالی ہند اور جنوبی ہند کی اردو میں اتنے اختلافات بن گئے کہ ان میں ہر ایک علاحدہ بولی بن گئی۔

ڈاکٹر زور نے شمالی ہند اور جنوبی ہند کی اردو میں تلفظ کے اختلافات کا بھی نہایت ہی باریک بینی، وضاحت اور مثالوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر زور لکھتے ہیں کہ بہت سے مصوتے جواب شمالی ہند کی اردو میں مفرد (Single) پائے جاتے ہیں وہ دکن میں مشدد (Double) ہیں۔

کئی الفاظ ایسے ہیں جو دکنی میں مصوتوں کے مابین مشدد بولے جاتے ہیں جبکہ شمالی ہند کی اردو میں ان لفظوں میں مفرد مصمتے ہوتے ہیں۔ دونوں بولیوں کے ہائیہ مصمتوں (Aspirated Consonants) میں قابل لحاظ فرق پایا جاتا ہے۔ دکن میں ہائیت (Aspiration) کے حذف ہوجانے کی وجہ سے اکثر جملوں کے آخری اجزا مختصر کر دیے جاتے ہیں۔ امدادی فعل کا تلفظ خاطر خواہ تشدید کے ساتھ نہیں ہوتا۔

ساخت کے اختلافات اور اہمیت میں ڈاکٹر زور نے شمالی اور جنوبی ہند کی اردو کے سرمایہ الفاظ کے اختلافات کو واضح کیا ہے کہ بہت سے دکنی الفاظ اور فقرے ایسے ہیں جو شمالی ہند میں استعمال ہی نہیں ہوتے بلکہ سمجھے بھی نہیں جاتے ہیں، جبکہ شمالی ہند کے بہت سے ایسے لفظ ہیں جو اہل دکن کے لیے غیر مانوس یا اجنبی ہیں یا بالکل الگ معنی رکھتے ہیں۔

قواعد زبان کے نقطہ نظر سے بھی ان دونوں بولیوں میں بہت اختلاف ہے۔ ڈاکٹر زور نے دکنی نظم ونثر کی زبان جو اب مخطوطات میں محفوظ ہے اس کا شمالی ہند کی نمائندہ زبان سے مقابلہ کرنے کی سعی کی ہے۔ اسما کی جمع بنانے میں بھی دکنی اور شمالی ہند کی زبان میں قابل توجہ اختلاف ہے۔

دونوں بولیوں میں ایک اور قابل غور فرق، مرکب الفاظ اور فقرے بنانے کے سلسلے میں پایا جاتا ہے۔ شمالی ہند کی اردو اس بارے میں قاعدوں کی سخت پابند ہے، اس کی ایک وجہ شمال میں مکمل فارسیت ہے۔

کوئی بھی مرکب لفظ جس میں ایک ہندوستانی اور دوسرا فارسی یا عربی کا ہو ملانا نہیں چاہیے، لیکن قدیم دکنی مصنفین نے مختلف زبانوں کے لفظ ملاکر بہت سے مفید اور دلکش مرکب الفاظ وضع کیے ہیں۔ یہ میلان اردو کے لفظی سرمایے کو وسعت دینے میں بڑا گراں قدر تھا۔

جیسے نقش چرن (عربی + ہندی)، صورت پانی (عربی+ہندی)، مانند بجلی (فارسی+ہندی)

دوسرا باب 'اصوات' (Sounds) پر مبنی ہے، یعنی آوازیں، جس کے دو ذیلی عنوان ہیں:

1 مصوتے اور مخلوط مصوتے (Vowels and Dipthongs)

2 انفیت (Nasalisation)

ڈاکٹر زور لکھتے ہیں کہ اردو میں کم سے کم 9 مصوتے اور 6 مخلوط مصوتے ہیں۔ اردو کا رسم الخط عربی ہے جس میں ان مصوتوں کو ظاہر کرنے کے لیے تین سے زیادہ حروف نہیں ہیں، یعنی ا، و، ے۔

یہ پندرہ آوازیں کوئی املائی قدر نہیں رکھتی، اسی وجہ سے خاص طور پر ایک مبتدی کو اردو لفظوں کو صحیح تلفظ کے ساتھ ادا کرنے میں بڑی مشکل پیش آتی ہے۔ ڈاکٹر زور نے ہر مصوتے کے لیے مخصوص اردو علامت استعمال کی ہے جس کی وضاحت نمبر شمار، اردو علامتیں، رومن رسم الخط کی علامتیں اور اردو الفاظ کے ساتھ درج کیے ہیں۔

اردو مصوتوں کی شکل کو بنیادی مصوتوں سے موازنہ کرکے بتایا گیا ہے۔ پلیٹوگراموں کے ذریعے بتایا گیا ہے جو ٹھیک ٹھیک جگہ جہاں زبان کے پہلو ان کا تلفظ کرتے وقت تالو سے لگتے ہیں۔ اردو میں مخلوط مصوتے زیادہ نہیں ہیں، یعنی 'ؤ' اور 'ئ' صرف دو مخلوط مصوتے ہیں، جو عربی فارسی کے بے شمار لفظوں میں پائے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر زور نے نقشوں اور تصاویر کے ذریعے بنیادی مصوتوں کے حوالے سے ہندوستانی زبان یعنی حیدرآبادی بولی کے مصوتوں کی ادائیگی میں زبان کی مختلف حالتوں کو ظاہر کیا ہے۔

ڈاکٹر زور نے مصوتے (Vowels) ی(i)، ے(e) ے(ae)(ʌ) آ(a)و(o)U (و) کی صوتی تشریح کی وضاحت اور پیلٹوگرام کی مدد سے زبان کی مختلف حالتوں کو پیش کیا ہے۔

صوتی تشریح

1 بند، اگلا غیر مدور (Close front Unrounded)

2 بند اگلا، غیر مدور مصوتہ (Closed front unrounded)

3 ادھ کھلا اگلا غیر مدور (Half opened front Unrounded)

4 کھلا اگلا مصوتہ، زبان، پیچھے کی طرف اٹھی ہوئی (Opened front tongue raised towords back)

5 ادھ کھلا مرکزی، غیر مدور مصوتہ (Half opened Centra round)

6 کھلا مصوتہ زبان پیچھے کی طرف اٹھی ہوئی (Opened tongue raised towards back)

7 نیم بند پچھلا مدور مصوتہ (Half closed back lips rounded)

8 پچھلا مدور بند مصوتہ زبان تھوڑی نچلی اور مزید پیچھے (Closed back rounded tongue little lower and further back)

9 پچھلا مدور بند مصوتہ (Closed back rounded)

10 مخلوط مصوتے (Diphthongs) و(ʌo) یہ ادھ کھلے مرکزی مصوتے کی طرح شروع ہوتا ہے مگر ادھ کھلے مدور پچھلے مصوتے کی ختم ہوتا ہے۔

11 آو (ao) یہ پچھلے کھلے مصوتے کی طرح شروع ہوتا ہے مگر اگلے نیم کھلے غیر مدور مصوتے کی طرح ختم ہوتا ہے۔ یہ کسی بھی مصمتے سے پہلے نہیں آتا ہے۔

12 ے (81)۔ یہ پچھلے کھلے مصوتے کی طرح ہوتا ہے مگر اگلے نیم کھلے غیر مدور مصوتے کی طرح ختم ہوتا ہے۔

13 ے (81)۔ یہ ادھ کھلے مرکزی مصوتے کی طرح شروع ہوتا ہے مگر اگلے بند غیر مدور مصوتے کی طرح ختم ہوتا ہے۔

14 ی (iu) یہ اگلے بند غیر مدور مصوتے کی طرح شروع ہوتا ہے مگر پچھلے بند مدور مصوتے کی طرح ختم ہوتا ہے۔

15 ے (eo)۔ یہ اگلے ادھ کھلے غیر مدور مصوتے کی طرح شروع ہوتا ہے مگر نیم بند مدور پچھلے مصوتے کی طرح ختم ہوتا ہے۔

انفیت (Nasalization): ڈاکٹر قادری زور لکھتے ہیں کہ لفظ میں ہر جگہ نہ سہی پھر بھی اردو کے تمام مصوتے انفیائے جاسکتے ہیں۔

ڈاکٹر زور لکھتے ہیں ''اردو زبان مختلف زبانوں کا ایک حیرت انگیز مجموعہ رکھتی ہے جو متعدد لسانی شاخوں (زبانوں) سے ماخوذ ہے، اس میں عربی زبان کے پورے 29 حروف موجود ہیں۔ مگر ان میں سے چند آوازیں (غ، ط، ث، ص، ض، ظ (g,t,s,z,z) عربی کی اصلی آوازوں کی طرح ادا نہیں ہوتیں بلکہ یہ آوازیں (t,s and z) سے بدل دی جاتی ہیں۔ تحریری اردو میں زZ کے لیے چار حروف ہیں۔ اس (S) کے لیے تین اور ت (t) کے لیے دو حروف ہیں۔

عربی کی آوازوں کے علاوہ دوسری آوازوں کے لیے مخصوص ہیجائی علامتیں نہیں ہیں۔ اٹھارہ پراکرت آوازوں کی نمائندگی اردو ہیجا میں عربی کے اصل حروف پر یا ان کے بعد کچھ بڑھا کر کی جاتی ہے۔ ان اٹھارہ آوازوں میں سے چار (p,g,c and n) پ، گ، چ اور ن ایسی ہیں جو اردو کے فارسی الاصل لفظوں میں بھی آتی ہیں۔ اردو کے جملہ مصمتوں کی تعداد 45 ہے۔

ڈاکٹر زور نے اردو مصمتے کو... لب دندانی، دندانی، مسوڑھوں والی، بندشی بند صفیری، انفی، پہلوی، تکریری، صفیری، نیم مصوتہ میں پیش تالوی، تالوی، کوز، غشائی، لہاتی، حلقی یعنی Prepalatal، Palatal، Retroflex، Velar، Glottal کو ترتیب دے کر بیان کیا ہے۔

ڈاکٹر زور نے اس میں وضاحت اور طوالت کے ساتھ الفاظ اور زبان کی ادائیگی کا جائزہ لیا ہے جس میں زبان کی تصاویر کو پلیٹوگرام کے ذریعے وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ یعنی مختلف آوازوں کی ادائیگی کرتے وقت زبان کا کون سا حصہ کہاں اور کتنا استعمال میں آتا ہے ڈاکٹر زور نے ان تمام صوتی نقطوں کا باریک بینی سے جائزہ لیا ہے۔

ہائیہ، مسموع، دولبی بندشی، غیر ہائیہ، غیر مسموع،

دندانی بندشی، ہائیہ مسموع دندانی بندشی، ہائیہ غیر مسموع کوز بندشی یعنی کہ ڈاکٹر زور نے اردو مصمتوں کے 42 الفاظ کی مختلف انداز میں ادائیگی کا بیان اور وضاحت مثالوں کے ذریعے پیش کی ہے۔

اس کے بعد ڈاکٹر زور نے ادغام (Assimilation) کو واضح کیا ہے یعنی ادغام کی وجہ سے ہونے والی زبان اور اردو کے ہجا کے درمیان کافی فرق ملحوظ کیا جاسکتا ہے۔ اس کو تین قسموں میں تقسیم کیا ہے یعنی صوتی تار، نرم تالو، زبان کا عمل اور پھر ان کی وضاحت مثالوں کے ساتھ پیش کی ہے۔

باب چہارم آواز کی خصوصیات (Sound Attributes) پر مبنی ہے جسے دو ذیلی عنوانات میں تقسیم کیا ہے:

1 (Stress) زور ڈالنا (بل زور)

2 (Intonation) لہجہ، سرلہر

ڈاکٹر زور لکھتے ہیں کہ بل یا زور کی موجودگی یا عدم موجودگی سے اردو لفظ کا مفہوم تبدیل نہیں ہوتا۔ کسی علیحدہ لفظ کی تاکید اکثر اس وقت تبدیل ہوجاتی ہے جب وہ کسی معنی خیز گروپ کا حصہ بنتا ہے۔ لفظ کی تاکید اکثر جملوں کی تاکید کے تابع ہوتی ہے اور عام بلا تاکید والے جملوں میں اہم الفاظ کے ابتدائی اور لمبے ہجائی اجزا پر اکثر تاکید کی جاتی ہے جبکہ حرف عطف، حرف جار امدادی افعال اور دوسرے تابع الفاظ پر تاکید نہیں کی جاتی ہے۔ اردو الفاظ کی تین زمروں میں درجہ بندی کرکے ان کی تاکید پر تبادلہ خیال کیا جاسکتا ہے۔ یعنی دو ہجائی اجزا والے الفاظ، تین ہجائی اجزا والے الفاظ، تین سے زیادہ ہجائی اجزا والے الفاظ۔ ڈاکٹر زور نے وضاحت اور مثالوں کے ساتھ بیان کیا ہے کہ پہلے ہجائی جزو پر کب اور کس وقت تاکید کی جاتی ہے۔ دو ہجائی اجزا والے الفاظ، تین ہجائی اجزا والے الفاظ، تین سے زیادہ ہجائی اجزا والے الفاظ پر کب، کیسے کہاں اور کس حالت میں تاکید کی جائے۔ ڈاکٹر زور نے اس پر تفصیل اور وضاحت کے ساتھ مثالیں دے کر مفصل بحث کی ہے۔

Intonation

ڈاکٹر زور لکھتے ہیں کہ اردو کا لہجہ صوبہ در صوبہ اور فرد فرد اس حد تک مختلف ہوتا ہے کہ کسی بھی شخص کے لیے اس کا مکمل طور پر مطالعہ کر پانا ممکن نہیں ہے تاہم ڈاکٹر زور نے موجودہ روزمرہ کی زندگی میں استعمال ہونے والے عام لہجے کی کچھ منفرد شکلوں کی وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے لیے اردو کے لہجے کو دو بنیادی سروں میں تقسیم کیا ہے۔ نزولی سُر اور صعودی سُر نزولی سُر میں تاکید والے ہجائی اجزا نزولی سطح کے ہوتے ہیں، تاکید والا ہجائی جزو گرتا ہے جبکہ بغیر تاکید والے اجزا کی تین حالتیں ہوتی ہیں۔

اس سُر کا استعمال اکثر عام واضح، بیانوں احکامات اور ہاں یا نہیں میں جواب کا تقاضہ کرنے والے سوالوں کے علاوہ سوالات میں ہوتا ہے جیسے آج ہم جائیں گے، وہ کھارہا تھا، ہم امتحان دے چکے۔ صعودی سُر کی خصوصیات نزولی سُر جیسی ہیں جب تک آخری ہجائی جزو تک یہ گرتا نہیں ہے بلکہ ہلکے سُر پر رہتا ہے۔ اس سُر کا استعمال ایسے بیانات میں ہوتا ہے جو بہت واضح نہ ہوں۔ اسی طرح درخواستوں اور ہاں اور نہیں میں جواب کا تقاضا کرنے والے سوالات میں اس کا استعمال ہوتا ہے۔ جیسے، ابھی دس دن ہیں۔ کھانا کھا چکے؟ میں یہ نہیں سمجھتا، بھاگ جاؤ گے وغیرہ۔

ڈاکٹر زور کا بنیادی مقصد نہ صرف اردو زبان کی آوازوں کی ممکنہ شفافیت ریکارڈ کرنا اور اردو سیکھنے کا ارادہ رکھنے والوں کی صحیح تلفظ میں مدد کرنا ہے بلکہ سائنٹفک طریقے سے اردو زبان کی تحقیق کی اہمیت اور عام صوتیات کی تحقیق کے لیے اضافی مواد فراہم کرنے کی جانب اردو اسکالرز کی توجہ بھی مبذول کرانا ہے۔

ڈاکٹر زور کی دوسری تصنیف 'ہندوستانی لسانیات' ہے۔ یہ کتاب 1932 میں پہلی بار شائع ہوئی۔ اس کتاب کو ڈاکٹر زور نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ حصہ اول اور حصہ دوم۔

حصہ اول آٹھ ابواب پر مشتمل ہے اور حصہ دوم میں پانچ باب قائم کیے گئے ہیں۔ حصہ اول میں لسانیات، مقاصد فوائد اور تاریخ زبان ماہیت آغاز اور تشکیل، فطری ارتقا صوتی تغیر و تبدل، ادغامی اثرات، وضع اصطلاحات، دنیا کی زبانیں، طریقۂ تقسیم، مختلف خاندان ہندیوروپی، ہند ایرانی، ہند آریائی، ارتقاء ہند آریائی ادوار، آریوں کا دور، گریسن کا نظریہ، جدید ہند آریائی زبانیں شمالی مغربی جنوب مغربی وسطی مشرقی جنوبی کے علاوہ ہند کی غیر آریائی زبانیں، دوستانی، اوستانی، ہندی چینی کول دراوڑی وغیرہ موضوعات پر مدلل و مفصل بحث کی ہے۔

حصہ دوم جسے ڈاکٹر زور خود بھی دلچسپ مانتے ہیں۔ اس میں ہندوستانی کا آغاز، مواد مختلف نظریے، جدید تحقیقات، ہندوستانی کا ارتقا، سہ مرکزی تفریق، اختلاف کے اسباب، ادبی بولیاں، گجراتی، دکنی، شمالی، ہندوستانی کی ہمہ گیری، فتح دکن، تحریک مظہر لکھنؤ کی خدمات کے علاوہ عہد حاضر میں اردو ہندی کا جھگڑا، اسباب تاریخ، اردو کی ضرورتیں وغیرہ انتہائی اہم اور دلچسپ موضوعات پر ڈاکٹر زور نے جائزہ لیا ہے۔ ڈاکٹر زور نے مضامین کی نوعیت کے لحاظ سے اس کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

اس کتاب کا دیباچہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب نے لکھا ہے۔ اس میں انھوں نے علم لسان کے بارے میں اپنے خیالات کا مختصر اظہار کرتے ہوئے اس علم کی اہمیت کو بیان کیا ہے۔ انھوں نے ڈاکٹر زور کی اس لسانی خدمت کو سراہتے ہوئے کتاب کی اہمیت اور افادیت کو بھی بیان کیا ہے۔

ڈاکٹر زور نے تمہید میں اس کتاب کی ضرورت کو واضح کیا ہے چونکہ اردو زبان میں اس وقت حافظ محمود شیرانی کی کتاب 'پنجاب میں اردو' کے علاوہ کوئی باقاعدہ کتاب نہیں تھی۔ ڈاکٹر زور نے اس علم کے بارے میں جو ارباب اردو کی رائے تھی یا جو غلط فہمیاں تھیں ان کو اجاگر کرتے ہوئے اردو انشا پردازوں کو ان کے فرائض کی طرف اشارہ کرتے ہوئے احساس دلایا ہے۔ ڈاکٹر زور لکھتے ہیں کہ ہمارے اکثر بڑے بڑے عالم اور انشا پرداز اپنی زبان کے آغاز، ارتقا اور ساخت سے یا تو قطعاً نا آشنا ہوتے ہیں یا پھر ان کی نسبت غلط خیالات اور نظریے قائم کر لیتے ہیں۔ اور یہی غیر ذمے دارانہ باتیں نئی پود کے تعلیمی نصابوں میں شامل رہتی ہیں اور اس طرح غلطیاں اور غلط فہمیاں ابتدا سے دلوں میں جاگزیں ہوجاتی ہیں۔

مجموعی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ ڈاکٹر زور کی لسانی خدمات اردو میں اہمیت کی حامل ہیں۔ اگرچہ ان میں ترمیم واضافہ اور کچھ لفظوں میں اختلاف کی بھی گنجائش ہے، لیکن اگر ہم دیکھیں کہ ڈاکٹر زور نے جس زمانے میں یہ کتابیں لکھی تھیں اس وقت ہماری زبان میں لسانیات کے تعلق سے محمود شیرانی کی ؛ پنجاب میں اردو، کے علاوہ کوئی خاص باقاعدہ کتاب نہیں تھی۔ ماہرین لسانیات نے ڈاکٹر زور کی تصانیف پر کچھ اعتراضات بھی کیے ہیں لیکن ڈاکٹر زور کی لسانی خدمات کی اولیت اور اہمیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا، بلکہ اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ کوئی بھی طالب علم جو لسانیات کے تعلق سے کام کرنا چاہتا ہے اس کو ڈاکٹر زور کی لسانی خدمات کا مطالعہ کرنا ہی پڑے گا۔ اردو لسانیات میں ڈاکٹر زور کی لسانی خدمات (ہندوستانی لسانیات اور ہندوستانی فونیٹکس اور دیگر لسانی مضامین) کی اہمیت اور اولیت مسلم ہے۔

■

Sushil Kumar
Room No: 351 Sutlej Hostel, JNU New Campus
New Delhi-110067
Mob: 6006920406

قلمکاروں سے چند معروضات

ماہنامہ 'اردو دنیا' علمی اور ادبی مجلہ ہے جس میں ادبیات، سماجیات، اقتصادیات، تہذیب و ثقافت، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس و ٹکنالوجی، طب و فلسفہ، فنونِ لطیفہ، نفسیات، زبان کی زمینی صورت حال، عالمی ادبیات اور دیگر موضوعات پر مضامین شائع کیے جاتے ہیں۔ یہ خالص علمی اور ادبی نوعیت کا رسالہ ہے۔ اس میں مذہبی مباحث اور متنازعہ فیہ مسائل پر مضامین کی اشاعت کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ رسالہ صرف 100 صفحات پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس رسالے میں پوری اردو دنیا کے دانشوروں، ادیبوں اور قلمکاروں کی تحریریں اشاعت کے لیے موصول ہوتی ہیں۔ بہت سے مضامین اشاعت کے لیے منظور کر لیے جاتے ہیں لیکن بہت سی تحریریں اشاعت سے محروم رہ جاتی ہیں۔ بہ کثرت مضامین موصول ہونے کی وجہ سے ادارے کو بہت سی دقتوں کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے قلمکاروں سے گذارش ہے کہ اپنی تحریریں بھیجتے وقت مندرجہ ذیل امور کا بطورِ خاص لحاظ رکھیں۔

- مضمون غیر مطبوعہ ہو۔ کسی اخبار/ مجلے میں ارسال نہ کیا گیا ہو اور نہ ہی اپنی یا کسی مرتب کردہ کتاب میں شامل ہو۔
- مضمون ادارے کے مزاج، معیار اور پالیسی کے منافی نہ ہو۔
- مضمون ان پیج پروگرام میں ہو اور 2500 (پچیس سو) الفاظ سے کم اور 4000 الفاظ سے زیادہ نہ ہو۔
- مضمون میں اعداد و شمار رومن میں لکھیں اور مضمون کے آخر میں حوالے/ حواشی (کتب اور مضامین) کا اندراج ضرور کریں۔
- اچھوتے، نئے اور اہم موضوعات پر بھیجے ہوئے مضامین ترجیحی طور پر شائع کیے جائیں گے اور عمومی نوعیت کے مضامین کی اشاعت موصول ہونے کی ترتیب کے لحاظ سے کی جائے گی۔
- ایسے موضوعات یا شخصیات پر مضامین کی اشاعت ممکن نہیں جن پر بہ کثرت کتابیں یا مقالے شائع ہو چکے ہوں۔ ایسے موضوعات/شخصیات پر مضامین بھیجتے وقت چند سطروں میں نئے نکات اور نئے زاویے کی نشاندہی لازمی ہوگی۔
- جن مضامین میں زبان و بیان کی خامیاں اور حقائق، حوالے املا جملہ کی غلطیاں ہوں گی انھیں کسی بھی صورت میں اشاعت کے لیے منظور نہیں کیا جائے گا۔
- مضمون میں اشعار اور اقتباس کی صحت کا التزام اور ضرورت سے زیادہ اشعار اور اقتباسات سے پرہیز لازمی ہے۔
- شخصیات پر مضمون بھیجتے وقت متعلقہ فنکار کی تصویریں، کتابوں کا عکس اور دیگر ضروری معلومات ضرور ارسال کریں۔
- شہر یا ادارے پر لکھتے ہوئے اس سے متعلق تصاویر اور دیگر اہم معلومات لازمی بھیجیں۔
- درج ذیل تصدیق نامہ موصول ہوئے بغیر مضمون کی اشاعت پر غور نہیں کیا جائے گا:

''میرا مضمون غیر مطبوعہ ہے۔ کسی اخبار/ مجلہ/ اپنی یا مرتب کردہ کتاب میں شامل نہیں ہے۔ یہ کسی کتاب/ مضمون کا سرقہ یا چربہ نہیں ہے۔ اگر کچھ نقص پایا گیا تو اس کے لیے میں خود ذمہ دار ہوں گا/ ہوں گی۔''

- کسی دوسری زبان کا ترجمہ اصل متن کے ساتھ ارسال کریں اور مصنف کا اجازت نامہ بھی منسلک کریں۔
- مضمون میں پہلے یا آخری صفحے پر مضمون نگار کا نام، مکمل پتہ مع پن کوڈ (انگلش میں) اور موبائل نمبر ضروری ہے۔

مضمون کی حتمی منظوری ایڈیٹوریل ریویو کے بعد ہی دی جائے گی۔

قلمکار حضرات اخلاقی ضوابط Ethical guidelines کا پورا خیال رکھیں۔

—ادارہ

تبصرہ و تعارف

تبصرہ نگاری ادبی تنقید ہی کی ایک شکل ہے جس میں کتاب کے مواد، اسلوب اور معیار کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ کتاب کے مالہ وما علیہ اور دیگر جزئیات کے حوالے سے قارئین کو بہت قیمتی معلومات عطا کی جاتی ہیں۔ اردو میں تبصرہ نگاری کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت رہی ہے، خاص طور پر قدیم مجلّات نے مطبوعات جدیدہ کے تعارف کا جو سلسلہ قائم کیا تھا وہ بہت ہی مفید تھا۔ تبصرہ بہت ذمے داری کا کام ہے اس لیے مبصرین کو چاہیے کہ وہ کتابوں کے انتخاب میں بھی اپنے اعلیٰ ذوق کا ثبوت دیں اور تبصرہ کرتے وقت غیر ضروری تمہید، افراط وتفریط، بے معنی تحسین اور بے جا تنقید سے گریز کرکے کتاب کے اہم اور افادی نکات کی نشاندہی کریں۔ اردو کے علاوہ انگریزی، ہندی یا دیگر زبانوں میں اردو زبان وادب سے متعلق جو کتابیں شائع ہوتی ہیں ان پر بھی آپ تبصرے بھیجیں تو بہتر ہوگا۔

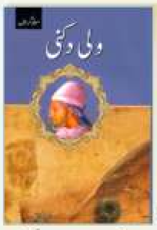

ولی دکنی (مونوگراف)

مصنف: پروفیسر عبدالحق

صفحات: 148، قیمت: 90 روپے، سنہ اشاعت: 2022

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: عمیر منظر، شعبۂ اردو، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، لکھنؤ کیمپس، یوپی

پروفیسر عبدالحق ماہر اقبالیات، محقق ونقاد اور استاد کے طور پر اپنی شناخت رکھتے ہیں۔ کلاسیکی ادبیات خصوصاً ولی اور حاتم سے انھیں خاص شغف ہے۔ حاتم اور ولی کے کلیات کی ترتیب کے علاوہ دیوان زادہ کو بھی مرتب کیا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب 'ولی دکنی' (مونوگراف) پروفیسر عبدالحق کی تازہ تصنیف ہے۔ اس کتاب میں شخصیت وسوانح، ادبی وتخلیقی سفر، تنقیدی محاکمہ، انتخاب کلام، مصادر کی فہرست اور انتخاب کلام کی فرہنگ بھی شامل ہے۔ کلام ولی کے انتخاب میں غزلوں کے علاوہ درنعت خیر البشرؐ، ثلاثی، رباعیات، مخمسات، مثنویات (درتعریف شہر صورت، دروصف سورت) قطعہ (درفراق گجرات) شامل ہیں۔ مونوگراف میں 97 تا 140 صفحات انتخاب کلام کے ہیں۔

ولی کی شخصیت اور سوانح سے متعلق اختلافات تاریخ ادب کا حصہ ہیں۔ ان کے نام، ولادت اور مقام پیدائش ہی مختلف فیہ نہیں ہیں بلکہ ان کا دلی آنا بھی مشتبہ ہے۔ سوانحی حصے میں ولی کے مخطوطوں کا تعارف مونوگراف کا خاصا اہم ہے۔ پروفیسر عبدالحق نے یہ صراحت کی ہے کہ کلام ولی کے خطی نسخوں کی تعداد 60 سے زائد ہے۔ (ص 9) ولی کے کلام کا سب سے قدیم خطی نسخہ اورنگ آباد میں 1120ھ میں لکھا گیا۔ دوسرا قدیم نسخہ 1125ھ کا ہے جو حیدرآباد کے سالار جنگ میوزیم میں ہے۔ کتب خانہ آصفیہ کا خطی نسخہ 1159ھ کا ہے۔ ہندستان کے علاوہ پاکستان میں بھی ان کے متعدد قلمی نسخے موجود ہیں۔ انجمن ترقی اردو کراچی کی ملکیت میں کلام ولی کا جو نسخہ ہے وہ 1135ھ کا ہے۔ کتب خانہ آصفیہ میں کلام ولی کے متعدد قلمی نسخے ہیں۔ ان میں کئی نامکمل انتخاب ہیں، جبکہ ایک نسخہ 1159ھ کا ہے۔ 112 ورق پر مشتمل اس نسخے میں 410 غزلیں ہیں (ص 10) اس میں ولی کا تقریباً مکمل کلام موجود ہے۔ اس کتب خانے کا ایک دوسرا قلمی نسخہ 116 اوراق پر مشتمل ہے۔ اس میں سنہ کتابت اور ترقیمہ درج نہیں ہے۔ اسی طرح ایک دوسرا نسخہ 122 اوراق پر مشتمل ہے اس میں بھی ترقیمہ نہیں ہے۔ ترقیمے میں دیگر تفصیلات درج ہیں اس میں 436 غزلیں، 3 قصائد، 10 مخمس 4 مستزاد مثنوی سورت موجود ہے (ص 11)۔ پروفیسر عبدالحق کا خیال ہے کہ کلام ولی کے 60 قلمی نسخوں کو یکجا کرنا آسان نہیں ہے۔ ان میں مکمل اور نامکمل کے علاوہ انتخاب سب شامل ہیں۔ انھوں نے یہ بھی اطلاع دی ہے کہ ولی کے متعدد قلمی نسخوں پر ادبی رسالوں میں مضامین قلم بند کیے گئے۔ لکھنے والوں میں اکبر حیدری، مختار الدین آرزو، ڈاکٹر عالی جعفری، قاضی احمد میاں اختر، محمد اختر چغتائی، ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی اور پروفیسر عبدالحق جیسے نامور اور بڑے لوگ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ پروفیسر نورالحسن ہاشمی اور مولانا احسن مارہروی نے متعدد قلمی نسخوں کا ذکر کیا ہے۔

پروفیسر عبدالحق کے مطابق قلمی نسخوں کی کتابت سے لے کر اشاعت تک کا جو سلسلہ ہے اس میں دوسرے شعرا کے مقابلے ولی کو سبقت حاصل ہے۔ ان خطی نسخوں سے کلام ولی کی تحقیق، ولادت اور اختلاف نسخ جیسے بعض مسائل پروفیسر عبدالحق نے اٹھائے ہیں۔ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ ولی کی پیدائش اور وفات کا سنہ آج تک طے نہیں ہوسکا۔ بعض مورخوں کے حوالے سے 1650 کو ان کی ولادت کا سنہ قرین قیاس قرار دیا ہے (ص 3) جبکہ شمس الرحمٰن فاروقی نے 1667/68 قرار دیا ہے۔

پروفیسر عبدالحق نے ولی کے ایک شاگرد مدار بخش مدن کے ایک مقطع سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ولی حافظ قرآن تھے (ص 19)۔

فضل حافظ ولی کے سیتی یارو مدن کا شعراب اتمام ہے گا

پروفیسر عبدالحق نے ولی کے ایسے بے شمار اشعار (ص 42 تا 45) نقل کیے ہیں جن کا بنیادی حوالہ قرآن پاک، قرآنی آیات کے اشارے اور حوالے ہیں۔

پروفیسر عبدالحق نے خطی نسخوں کو ولی شناسی کی خشت اول قرار دیا ہے۔ جبکہ کلام ولی کے مجموعوں کی اشاعت کا آغاز 1927 سے ہوا۔ سب سے پہلے مولانا احسن مارہروی نے 1927 میں اور اس کے بعد پروفیسر نورالحسن ہاشمی نے 1945 میں کلیات ولی کو مرتب کیا۔ تقریباً پون صدی سے کلام ولی پر تنقید وتحقیق کا سلسلہ جاری ہے۔

پروفیسر عبدالحق نے اُن شعرا کا بھی ذکر کیا ہے جنھوں نے ایک دوسرے سے اخذ واستفادہ کیا یہاں تک کہ غزلوں کے بہت سے مصرعوں میں توارد کی کیفیت نمایاں ہوگئی۔ ان میں اشرف، حاتم، فائز، آبرو، شاکر ناجی، یکرو اور ولی کے اشعار سے مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ پروفیسر عبدالحق نے کلام ولی کو اردو کی نشاۃ ثانیہ قرار دیا ہے نیز یہ بھی لکھا ہے کہ ان کی شاعری صور اسرافیل کی طرح جاں بخش ثابت ہوئی۔ انھوں نے دہلی اور

دکن کی شعری دہلیز کا سب سے درخشاں ستارہ ولی کو قرار دیا ہے۔

بعض مقامات پر تصحیح کی ضرورت ہے۔ص 14 پر ایوان اردو جون 1916 تحریر ہے جو کہ غلط ہے اسے 2016 ہونا چاہیے۔ص 49 پر نیچے سے تیسری سطر میں ولی کا جو شعر درج ہے اس میں آئے کی جگہ 'آوے' ہونا چاہیے۔انتخاب کلام (ص 97) میں دوسری غزل کے پہلے شعر کا پہلا لفظ دونہیں بلکہ 'دو' ہونا چاہیے۔ پہلے ہی مصرعے کا آخری لفظ 'آ' لکھنے سے رہ گیا ہے۔اسی غزل کے آٹھویں شعر کا دوسرا مصرعہ ہے ''چھپ رہا آئے ترے لب کے نمکدان میں آ''۔متداول کلیات میں یہ مصرعہ اس طرح ملتا ہے ''چھپ رہا آکے ترے لب کے نمکدان میں آ''۔ پروفیسر ظفر احمد صدیقی کہتے تھے کہ لفظ آکے/ آئے کے بجائے 'آگے' ہونا چاہیے مقابلے کے معنی میں۔ امید ہے کہ یہ مونوگراف مطالعات ولی میں خاص اہمیت کا حامل قرار پائے گا۔

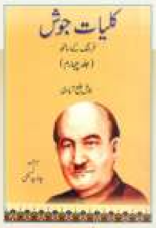

کلیات جوش (جلد چہارم)

مرتب: جاوید نسیمی

صفحات: 704، قیمت: 325 روپے، سنہ اشاعت: 2022

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: عبدالرشید اعظمی، M-109، گلمرگ اپارٹمنٹس، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی

قومی اردو کونسل، نئی دہلی کا منشائے اشاعت کتب اور فروغ اردو کے ساتھ ساتھ تحفظ تہذیب وثقافت بھی ہے، علمی وراثت وادبی سرمایہ آنے والی نسلوں تک منتقل کرنا بھی قومی اردو کونسل کے اہم مقاصد میں شامل ہے، تاہم کونسل اس ادائیگی فرض کے لیے ہر سال تھوک خریداری کے علاوہ معیاری مسودات حاصل کر کے ماہرین علم وادب کی نظروں سے گزارتی ہے جس کے کئی مراحل ہیں، پھر وہ کتابیں کم قیمت پر قارئین تک پہنچاتی ہے تاکہ صاحب ذوق افراد کو بہتر سے بہتر تخلیقات دستیاب ہو جائیں اور وہ اپنے ذوق سلیم کی آبیاری کر سکیں۔

زیر تبصرہ کتاب 'کلیات جوش' اسی سلسلے کی ایک نہایت اہم کتاب ہے جس کے مرتب جاوید نسیمی ہیں۔اس سے قبل مرتب کی تین جلدیں قارئین سے داد تحسین وآفریں حاصل کر چکی ہیں۔کلیات جوش کی چوتھی جلد بھی معیاری ہے۔مرتب نے اس کی ترتیب وتدوین میں الفاظ واسما کی فرہنگ بھی دی ہے جس سے معانی ومقام اسما کی صراحت ہو جاتی ہے تاکہ قارئین کی معلومات میں خاطر خواہ اضافہ ہو سکے حالانکہ کچھ مقامات پر الفاظ ومعانی کی صراحت اور املے میں غلطیاں در آئی ہیں۔

قومی اردو کونسل کا بنیادی مقصد فروغ اردو ہے، لہٰذا اردو کے فروغ میں کلام جوش سے زیادہ کوئی بھی تصنیف اس حد تک ممد ومعاون نہیں ہے جس حد تک جوش کی تخلیقات ہیں کیونکہ جوش کے پاس لفظوں کا جو وافر ذخیرہ ملتا ہے وہ کسی اور کے یہاں میسر نہیں، لفظوں کی کثرت وبہتات جوش کے کلام میں سیل رواں کے مانند ہے۔اس کے برتنے کا اسلوب وسلیقہ نہایت ہی پر زور و بہتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ جہاں جوش کی شاعری میں گھن گرج ہے، احتجاج ہے، وہیں شگفتگی ورعنائی اور دلنشینی بھی ہے جو قاری کی توجہ کا مرکز ہے۔ جوش کی شاعری پڑھنے والوں کو لفظوں کا سمندر ملتا ہے۔ وہ اپنے ذوق کے مطابق اس کا انتخاب کر سکتے ہیں نیز اپنے ذخیرۂ الفاظ میں توسیع کر سکتے ہیں۔ مرتب نے اپنے دیباچے میں کلام جوش سے منتخب حوالے بھی دیے ہیں نیز ان اشعار کی تفہیم کے ساتھ ساتھ جوش کے شاعرانہ اسلوب ومزاج پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ مزید لفظوں کے معانی ومحل استعمال کی وضاحت بھی کر دی ہے۔ جاوید نسیمی نے اپنے دیباچے میں جوش کے اکھڑ مزاج اور ہم عصر اور بعد کے ناقدین ادب کے رویے پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ ''ان کی شخصیت سے جڑے تنازعات وتضادات نے انھیں بہت نقصان پہنچایا، اور ان کی قدر کا صحیح تعین نہیں کیا جا سکا۔ جوش کی زندگی میں اور موت کے بعد بھی سرحد کے دونوں طرف کے دانشوروں اور ناقدین نے جو مصلحت آمیز خاموشی اختیار کی وہ غیر جانبدار تنقید پر ایک سوالیہ نشان ہے، ہر چند کہ ناقدین کے ذریعے نظر انداز کیے جانے کی بہت بڑی وجہ خود جوش تھے۔ ان کے مزاج کا اکھڑ پن، پٹھنولی، کسی تحریک سے عدم کمٹمنٹ اور ارباب اقتدار کے سامنے سر تسلیم خم نہ کرنے کے جرم نے ہی انھیں یہ دن دکھایا۔ جوش سے دانستہ چشم پوشی کے باوجود اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ جوش ہمارے نہایت اہم اور بااثر شاعر ہیں۔'' جوش کے جنازے میں عدم شمولیت پر فیض نے اس وقت کے پاکستان کے صدر ضیاء الحق سے کہا تھا ''ضیا صاحب! اب اس سے بڑا آدمی اس سرزمین میں دفن نہیں ہوگا۔'' اس جملے سے فیض کی نگاہوں میں جوش کی وقدر وقیمت کا اندازہ ہوتا ہے۔

یہی سبب ہے کہ جاوید نسیمی نے جوش کا کلیات ترتیب دیا تاکہ دنیائے ادب ایک بڑے شاعر سے واقف ہو سکے، اس کی خودسری کے ساتھ اس کی اہمیت وقدر نیز اس کی ہنرمندی سے باور ہو۔قومی اردو کونسل عوام تک یہ تصنیف پہنچا کر ایک بڑی ذمے داری کا حق ادا کر رہی ہے جو اب تک نہیں ہو سکا تھا۔ گویا کونسل نے ایک حقدار کو دیر سے ہی اس کا حق دیا ہے۔ اس سلسلۂ کلیات جوش کے اشاعت کی ضرورت یوں بھی ہوئی ہے کہ جوش کے تعلق سے بہت سے متون میں بہت ساری اغلاط تھیں حتی کہ جو مقالے لکھے گئے ہیں ان میں بھی بہت ساری غلطیاں در آئی ہیں۔قومی اردو کونسل نے اس کمی کو محسوس کرنے کے بعد ہی جوش کی کلیات کی اشاعت کا ارادہ کیا۔اس کلیات کی ایک افادیت یہ ہے کہ اس میں جوش ملیح آبادی کے ذریعے استعمال کیے گئے بہت سے غیر مانوس الفاظ بھی ہیں جن کے معانی کی تلاش عام قاری کے لیے بہت مشکل ہے۔اسی لیے اس میں ایک فرہنگ بھی شامل کیا گیا ہے۔انھوں نے بڑی اہم بات لکھی ہے کہ ''جوش نے کچھ تراکیب وضع بھی کی ہیں جن کی وضاحت ان کے علاوہ اور کسی بھی لغت میں نہیں مل سکتی۔ مثال کے طور پر مجموعہ الہام وافکار میں نظم 'شیب وشباب' کا یہ شعر دیکھیے۔

گہوارہ سخن، قوس جبیں، زمزمہ رفتار ✽ کج فیصلہ و راست قد و آسیا پیماں''

ہم سب لفظ گہوارہ سے بھی واقف ہیں اور سخن سے بھی، لیکن گہوارہ سخن کی ترکیب کسی کتاب میں نہیں ملے گی۔ جوش نے اپنی نظم میں خود ہی اپنی وضع کردہ اس ترکیب کے معنی بتائے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں ''وہ جس کی آواز میں مرکی، اور لہجہ ایسا ہو گویا آواز جھولا جھول رہی ہے۔'' 'قوس جبیں' کے متعلق رقمطراز ہیں ''وہ جس کا ماتھا دھنک کی طرح رنگین ہو۔'' یہ ترکیب تو پھر بھی قرین قیاس ہے لیکن اگلی ترکیب 'زمزمہ رفتار' کی وضاحت شاید جوش کے علاوہ اور کوئی نہ کر سکتا۔ فرماتے ہیں ''وہ جس کی رفتار سے تانوں کا ساز یر و بم پیدا ہو۔'' اس شعر کی آخری ترکیب یعنی 'آسیا پیماں' تو غضب کی ہے۔لفظ 'آسیا' کے معنی 'چکی' تو ہر لغات میں مل جائیں گے 'پیماں' بمعنی 'وعدہ' بھی سمجھ میں آتا ہے لیکن 'چکی' اور 'پیمان' کا رشتہ فہم سے بالاتر ہے۔ خود جوش نے ہی یہ مشکل حل کی ہے اور اپنے قاری کے چکی کی طرح گھومتے ذہن کو قرار دیتے ہوئے وضاحت فرمائی ہے کہ ''وہ جس کے وعدے چکی کی مانند گھومتے اور ہر روز آج سے کل پر ٹلتے رہیں۔'' صرف ایک شعر میں اتنی نئی تراکیب وضع کرنا جوش کی قدرت فن کا غماز ہے۔ جوش کو اندازہ تھا کہ وہ یہ تراکیب نئی وضع کر رہے ہیں۔ان سے پہلے شاید یہ تراکیب استعمال نہیں ہوئی ہیں اسی لیے انھوں نے اس کی وضاحت کی ضرورت محسوس کی ورنہ انھوں نے بے شمار تراکیب استعمال کی ہیں لیکن ان کی وضاحت کہیں نہیں فرمائی''

تحقیق و تنقید

آزادی کے بعد بہار کے اردو ادبی رسائل

مصنف/ ناشر: عطا عابدی
ضخامت: 320، قیمت: 500 روپے، سنہ اشاعت: 2022
پبلشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
مبصر: رضوان اللہ آروی
گلشن کالونی، شاہ گنج، پوسٹ مہندرو، پٹنہ 80006 (بہار)

برسوں پہلے عطا عابدی صاحب نے 'بہار کے اردو ادبی رسائل کی خدمات: (1947 سے 2000 تک) ایک جائزہ' کے موضوع پر ایک تحقیقی مقالہ لکھا تھا جس پر ایل۔این متھلا یونیورسٹی دربھنگہ نے انھیں پی ایچ ڈی کی سند سے نوازا تھا۔لیکن ڈگری تفویض ہونے کے بعد بھی وہ اس موضوع پر مسلسل کام کرتے رہے اور نئے نئے رسائل کی بازیافت کے ساتھ وہ ادبی صحافت کے نئے جہانوں کی دریافت بھی کرتے رہے اور بالآخر اپنی اسی مخلصانہ کاوش کے سبب وہ اس موضوع کو وسعت دے کر اسے عصر حاضر تک کی ادبی صحافت کا آئینہ بنانے میں کامیاب رہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ موضوع کی یکسانیت کے باوجود ان کی یہ کتاب ان کے تحقیقی مقالے سے بالکل الگ ایک نئی شکل اور جامع تر صورت میں سامنے آئی ہے جس کا دورانیہ اب 1947 سے دور حاضر تک پر محیط ہو گیا ہے۔اور آزادی کے بعد سے اب تک کی ادبی صحافت کے اس تجزیہ میں کہیں پر بھی تشنگی یا کسی خلا کا احساس نہیں ہوتا۔اتنی جامع اور معیاری تحقیقی کتاب کو دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ اس میں نہ صرف غیر منقسم بہار بلکہ غیر منقسم ہندوستان کی بھی ادبی وصحافتی تاریخ کا احاطہ کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔کتاب کے مرکزی موضوع 'آزادی کے بعد، بہار کے اردو ادبی رسائل' سے پہلے تقریباً ستر صفحات پر مشتمل اپنے مفصل جائزے میں عطا عابدی صاحب نے ادبی رسائل کی اہمیت و افادیت، ادب وصحافت کی تعریف، اس کے آغاز و ارتقا، رسائل کے مزاج ورجحان، سماجی وثقافتی پس منظر، اغراض ومقاصد اور مسائل وکیفیات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔کتاب کے پیش لفظ (عنوان: یہ کتاب) میں انھوں نے کتاب کی ترتیب اور اپنے طریقہ تحقیق کی صراحت کرتے ہوئے اپنے تحقیقی سفر کی روداد تفصیل سے بیان کی ہے، جس سے ان کا انہماک، جانفشانی، اس موضوع سے قلبی وابستگی اور مستند و اصل مآخذ تک پہنچنے کی ان کی مسلسل کوشش کا اندازہ ہوتا ہے۔

اردو کی ادبی صحافت کا مکمل منظر نامہ پیش کرنے کے بعد مصنف نے اصل موضوع یعنی آزادی کے بعد بہار کے اردو ادبی رسائل پر گفتگو کرتے ہوئے بہار کے مختلف شہروں سے شائع ہونے والے تقریباً سوا دو سو رسائل وجرائد اور مجلّات کے موضوعات و مشتملات کا تعارف اس انداز سے پیش کیا ہے کہ رسائل کے مزاج ومنہاج کے ساتھ ان کے مدیروں کی ترجیحات بھی نمایاں ہو کر سامنے آگئی ہیں۔مصنف کا یہ رویہ ادبی صحافت کی تاریخ پر ان کی ژرف نگاہی کا پتہ دیتا ہے۔خاص طور پر اس لیے بھی کہ ان رسائل کا مزاج اور ان کی نوعیت یکساں نہیں ہے۔اگرچہ غالب حصہ ادبی مجلّات پر مشتمل ہے، تاہم ان میں مذہبی، تہذیبی و ثقافتی اور خالص تحقیقی نوعیت کے رسائل کے ساتھ بچوں کے رسائل بھی شامل ہیں۔ان سب کے جائزے میں مصنف نے ان کے افادی اور فکری پہلو کو سامنے رکھا ہے اور یہ بھی کہ اپنے مشتملات کی پیشکش میں کون رسالہ کس نوعیت سے انفرادی حیثیت کا حامل ہے۔اسی ذیل میں رسائل کے خصوصی گوشے/نمبر بھی زیر بحث آئے ہیں۔مصنف نے مشمولات کا تعارف پیش کرتے ہوئے مضامین و مقالات کے عناوین درج کرنے کا بھی خاصا التزام رکھا ہے جس سے تنوع کے ساتھ مختلف عہد کے ادبی رجحان سے بھی آشنائی ہوتی ہے اور ادب میں نظریاتی تصادم کے نمونے بھی سامنے آتے ہیں۔مصنف نے ان کا محاکمہ تو کیا ہے لیکن کوئی فیصلہ دینے سے گریز کرتے ہوئے مدیروں کے اُن افکار ونظریات کی ترجمانی کی ہے جس کا عکس ان کے رسالے میں جھلملاتا نظر آتا ہے۔آزادی کے بعد بہار کے اردو ادبی رسائل کے مشمولات کی صرف فہرست سازی ہی اپنے آپ میں ایک بڑی آزمائش ہے۔لیکن مصنف نے مختصراً ان مشمولات کا تجزیہ کر کے اور ان کی خصوصیات پر روشنی ڈال کے اس کتاب کو مزید بامعنی اور مفید بنانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔اور یہ ممکن ہو سکا ہے اس لیے کہ مصنف نے مضامین سے قطع نظر رسائل کے اداریوں اور مکتوبات کے کالم کے حوالے سے بھی رسائل کی منفرد شناخت کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔

یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ ان رسائل میں ماہانہ، سہ ماہی، ششماہی اور سالانہ ہر قسم کے رسائل شامل ہیں اور بڑی بات یہ ہے کہ وہ معروف اور مرکزی دھارے (Mainstream) کے رسائل کے ساتھ دور دراز کے مقامات سے شائع ہونے والے کم معروف بلکہ گمنام رسائل تک بھی پہنچے ہیں جن کے مزاج ومنہاج سے تو کیا، لوگ ان کے نام سے بھی واقف نہیں ہیں۔ یہاں تک کہ انھوں نے ایسے رسائل کو بھی سمیٹنے اور اپنے جائزے کا حصہ بنانے کی کوشش کی ہے جن کی زندگی بے حد مختصر رہی لیکن جو بہار کی ادبی صحافت پر اپنے منفرد نقوش مرتسم کرنے میں کامیاب رہے۔مصنف کی اسی ایماندارانہ اور مخلصانہ کاوش کے سبب اس کتاب کو ایک مکمل اور مستند دستاویز کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ بہار کی ادبی صحافت کے حوالے سے یہ کتاب ایک اہم ماخذ ثابت ہوگی۔اس موضوع پر کام کرنے والے لوگوں کے لیے کہ اس کتاب سے ایک مکمل عہد کی ادبی وصحافتی تاریخ اور اس کی متنوع سرگرمیوں کے کئی مخفی گوشے پہلی بار قارئین کے سامنے آئیں گے۔

مرزا غالب اور جان کیٹس (فکروفن کا تقابلی مطالعہ)

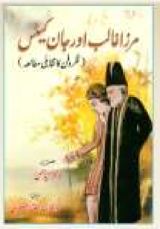

مصنف: ڈاکٹر زیڈ حسن، مرتب: ڈاکٹر سید اختیار جعفری
صفحات: 490، قیمت: 400 روپے، سنہ اشاعت: 2021
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
مبصر: حقانی القاسمی، نئی دہلی

مرزا غالب (27 دسمبر 1797-15 فروری 1869) اور جان کیٹس (31 اکتوبر 1795 - 23 فروری 1821) دونوں ایسے شاعر ہیں جن کے یہاں بہت سی سطحوں پر مماثلت ہے۔مرزا غالب سے انگریزی زبان وادب کا ایک بڑا حلقہ واقف ہے کہ غالب کی شاعری کے ترجمے انگریزی میں ہو چکے ہیں اور کیٹس سے بھی اردو دنیا واقف ہے کہ کیٹس کے کلام کے ترجمے اردو میں شائع ہوتے رہے ہیں۔دونوں ہی عظیم شاعر ہیں اور دونوں کو بے پناہ مقبولیت بھی حاصل ہے۔انگریزی ادبیات میں جس طرح جان کیٹس کے مطالعات کا سلسلہ ہنوز قائم ہے اسی طرح ہمارے یہاں مطالعاتِ غالب کا تسلسل قائم ہے۔دراصل ان دونوں شاعروں کے یہاں ایسے زاویے اور جہتیں ہیں کہ تلاش وتفحص سے کوئی نہ کوئی نیا زاویہ متجسس ذہنوں کو مل ہی جاتا ہے۔

دیوبند کے متوطن، متھرا میں مقیم انگریزی کے سند یافتہ اور استاد ڈاکٹر زیڈ حسن نے دو زبانوں کے شاعروں کو اپنا محور ومرکز بنا کر تقابلی مطالعہ کیا ہے۔جب کہ ہمارے یہاں تقابلی مطالعات کی روش پہلے پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھی جاتی تھی کہ الگ الگ زبانوں کے شاعروں کے ماحول، فضا، زبان، ذوق میں فرق ہوتا ہے۔اس کے باوجود تقابلی مطالعات کی روایت ہمارے یہاں موجود ہے اور کچھ شعبے بھی اس تعلق سے

قائم کیے گئے ہیں۔ اسی کی پاسداری کرتے ہوئے زیڈ حسن نے مرزا غالب اور جان کیٹس کا تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے۔ یہ دراصل ان کے انگریزی مقالہ 'مرزا غالب اینڈ جان کیٹس: اے کمپیر یٹو اسٹڈی' کا اردو روپ ہے۔ اس میں انھوں نے یہ واضح کیا ہے کہ کیٹس اور غالب کے مابین شخصی، فکریاتی اور موضوعاتی سطح پر بہت قربت ہے۔ دونوں کی پیدائش کے درمیان دو برس کا فاصلہ ہے۔ کیٹس غالب سے دو برس بڑے ہیں ماہ پیدائش میں فرق ضرور ہے مگر انتقال کا مہینہ ایک ہی ہے، یعنی فروری۔ کیٹس کو عمر تو بہت مختصر ملی، صرف 26 سال۔ جب کہ غالب کو 72 سال ملے۔ مگر دونوں نے اپنی مختصر یا طویل زندگی میں ادبی معاشرے پر گہرے نقوش مرتب کیے ہیں۔ یہ دونوں ہی فطری شاعر ہیں۔ دونوں کے یہاں رومانیت ہے۔ دونوں کے کائناتی تصور اور مذہبی افکار و اقدار میں بھی تھوڑی بہت مماثلت بھی ہے۔ زیڈ حسن نے دونوں عظیم شاعروں کی سماجی، شخصی، معاشی اور تخلیقی زندگی کا موازنہ کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ زبان، ملک، قوم، جغرافیہ کے اختلاف کے باوجود دونوں کے نظریات بہت حد تک ملتے جلتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''ان دونوں کے فکر و فن کو قریب سے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ دونوں عظیم شعرا انسانیت کے دائمی جذبات کی کھوج کرتے ہیں اور اکثر ایک ہی راہ پر گامزن نظر آتے ہیں۔ ایک ہی جیسے خیالات ان کے دماغ میں پیدا ہوتے ہیں، ایک ہی جیسے دکھوں سے وہ دکھی ہیں اور سکون و اطمینان بھی ایک ہی جہان رنگ و بو میں تلاش کرتے ہیں۔ شاعری دونوں کے ہی خون میں تھی، یہ دونوں ناکامیوں، مایوسیوں اور مالی دشواریوں کے باوجود اپنے اس خداداد فریضے سے پیچھے نہیں ہٹے۔'' یہ بھی تحریر کیا ہے کہ ''دونوں کے خطوط ادب کی تاریخ کا بیش بہا خزانہ ہیں اور دونوں ہی شعرا فلسفیانہ خیالات سے لبریز تھے۔''

زیڈ حسن نے شخصی سوانح کا بھی تقابلی مطالعہ کیا ہے اور یہ عجب سی مماثلت بھی تلاش کی ہے کہ غالب دلی میں برسوں رہے، لیکن بے گھر رہے اور کیٹس بھی ایسا ہی تھا جس کا اپنا کوئی مکان نہیں تھا۔ غالب کی زندگی بھی کرائے کے مکان میں گزری اور کیٹس بھی بطور کرایہ دار ہی رہتا تھا اور اتنا 'فاقہ مست' اور مفلوک الحال تھا کہ مکان کا کرایہ تک دینے کی استطاعت نہیں تھی۔

ڈاکٹر زیڈ حسن نے غالب اور کیٹس کی شخصیت کی تشکیل کے مشترکہ عناصر پر بھی گفتگو کی ہے۔ انھوں نے جہاں غالب کی دہلی کے بارے میں لکھا ہے وہیں کیٹس کے لندن پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ ایک اور عنوان 'کیٹس: کلام اور کمالات' ہے جس میں انھوں نے کیٹس کے شعری موضوعات اور محاسن کے حوالے سے بحث کی ہے اور اس کے نظریہ شاعری کو بھی پیش کیا ہے۔ 'غالب کے شعری کارنامے' کے عنوان سے یہ واضح کیا ہے کہ کیٹس کی شاعرانہ کاوش صرف ایک کلیات تک ہی محدود ہے جب کہ غالب کا تصنیفی کینوس وسیع ہے۔ غالب کے خطوط میں جیسے ایک خاص عہد کا معاشرتی، سیاسی و ثقافتی رنگ و روپ ہے، اسی طرح کیٹس کے خطوط میں ان کی زندگی اور عہد سے جڑی ہوئی بہت سے واقعات و واردات ہیں۔ ابتدا میں جس طرح کلام غالب کا مذاق اڑایا گیا، اسی طرح کیٹس کے بارے میں کہا گیا کہ پگلے کو شاعری کا بھوت سوار ہو گیا ہے۔ اس طرح کے تضحیک آمیز رویے سے جیسے غالب کو تکلیف پہنچی ویسے ہی کیٹس کو بھی بہت دکھ ہوا۔

زیڈ حسن نے غالب اور کیٹس کے ماضی کو بھی موضوع بنایا ہے اور بہت سی اہم باتیں اس حوالے سے تحریر کی ہیں۔ 'غالب اور کیٹس کے موضوعات' کے تحت موضوعی مماثلت تلاش کی ہے۔ جس طرح غالب کے یہاں حسن و عشق اور اس کے تلازمات پر شعر ملتے ہیں اسی طرح کیٹس کا بھی ایک الگ جہانِ حسن و عشق ہے، کیٹس بقول زیڈ حسن ''نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کے لیے مقبول ترین شاعر تھا اور رہے گا کہ اس نے بھی محبت کے حوالے سے بہت سے شعر کہے ہیں...'' اور کیٹس حسن پرست بھی تھا جیسا کہ ان کی نظموں سے متبادر ہوتا ہے۔ اسی طرح غالب بھی عشق اور حسن کے پرستار تھے۔ زیڈ حسن نے ان دونوں کے حکیمانہ نظریات میں بھی یکسانیت تلاش کی ہے۔ غالب کے نزدیک خدا اور مذہب کا جو تصور تھا شاید اسی نوع کا تصور کیٹس کے یہاں بھی ملتا ہے۔ زندگی کے بارے میں بھی اسی نوع کے تصورات ہیں، شاعرانہ اندازِ بیان کے حوالے سے بھی انھوں نے گفتگو کی ہے اور آخری باب 'مقبولیت کے راز' کے عنوان سے ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ کیٹس کا مغربی دنیا سے تعلق ہے تو غالب کا مشرق سے مگر دونوں ہی نصابوں میں شامل ہیں۔ زیڈ حسن لکھتے ہیں کہ ''دونوں نے غربت کی زندگی گزاری، مشروب زیست کے دکھ سکھ، امید و بیم کے تلچھٹ تک پی گئے، اپنے خواب بنتے رہے، حقیقت اور تصورات کی چلمن بناتے رہے۔'' انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ ''غالب نے اپنی جائے پیدائش آگرہ کو خیرباد کہا اور دارالحکومت دہلی میں سکونت اختیار کی وہاں اس کا اپنا کوئی مکان نہیں تھا، اسی طرح کیٹس والد کی وفات کے بعد لندن آکر بس گیا جہاں اس کا اپنا کوئی مکان نہیں تھا۔'' خلاصۂ کلام یہ کہ کیٹس اور غالب دونوں بے گھر تھے، لیکن دلوں میں اپنا گھر بنانے میں کامیاب رہے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ڈاکٹر زیڈ حسن کی یہ کتاب دو زبانوں کے ادبیات کے رویے، رجحانات، افکار و اقدار اور ان زبانوں سے متعلق شعرا کی ذہنی، نفسی، داخلی اور خارجی کیفیات کی تفہیم میں بہت معاون ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مشرق و مغرب کی تفریق و تقسیم بے معنی ہے کہ تصورات، خیالات، جذبات، احساسات کی سطح پر یکسانیت بھی ملتی ہے۔ دراصل شاعر یا ادیب آفاقی ذہن کا حامل ہوتا ہے، اس کا تصور کسی قوم، ملک، زبان میں محدود نہیں ہوتا اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ مغربی اور مشرقی شعرا کے مابین بہت سی سطحوں پر مماثلتوں کے ثبوت موجود ہیں۔ کتاب کے آخر میں پانچ ضمیمہ جات شامل ہیں۔ غالب اور کیٹس کی توقیت کے علاوہ منظومات کیٹس کی فہرست بھی ہے۔ یونانی ادب و تہذیب کا مطالعہ کے ساتھ کتاب میں مذکورہ شخصیات کا ایک اشاریہ 'فرہنگ بزمیہ' کے نام سے ہے جو بہت وقیع ہے اور اس فرہنگ کی تحریر و ترتیب میں ڈاکٹر سید اختیار جعفری کی معاونت شامل رہی ہے۔ غالب، غالبیات، کیٹس اور کیٹسیات کے عنوان سے کتابیات کی فہرست بھی ہے۔

ڈاکٹر زیڈ حسن نے مطالعات غالب کے ضمن میں ایک نیا زاویہ تلاش کیا ہے، یقیناً یہ تلاش و جستجو، عرق ریزی، ژرف نگاہی اور تحقیق و تجسس قابل قدر ہی نہیں بلکہ قابل رشک بھی ہے۔

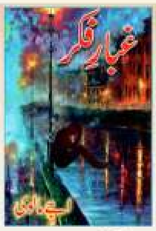

غبار فکر

مصنف: اسے مالوی

صفحات: 520 قیمت: 600، سنہ اشاعت: 2022

پبلشر: جے بھارتی پرکاشن، پریاگ راج، یوپی

مبصر: پروفیسر رئیس انور، مہیش پٹی، راج ٹولی لین، دربھنگہ (بہار)

ڈاکٹر اسے مالوی موجودہ دور کے جانے پہچانے قلمکار اور دیدہ ور محقق ہیں۔ ان کا خاص میدان ویدوں اور ہندو دھرم کی دوسری کتابوں کے ترجمے، تحقیق اور تنقید ہے۔ ان موضوعات پر انھوں نے بڑی تندہی اور سنجیدگی سے توجہ دی ہے جس کی بنا پر ہندو دھرم کی کتابوں کے اردو ترجمے اور قدیم ہندوستانی تہذیب و تمدن سے متعلق معلومات فراہم کرنے میں انھیں مہارت حاصل ہوگئی ہے۔ اس طرز کی ان کی درج ذیل کتابیں منظر عام پر آچکی

ہیں: ویدک ادب اور اردو، اردو میں ہندو دھرم، شری مدبھگوت گیتا، (نغمہ یزدانی) کی تفسیر وتعبیر، ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز، اردو میں رام کتھا، سیتا رام، اکشوگندھا

ڈاکٹر اجے مالوی نے ان کتابوں کے علاوہ اپنے مضامین کے مجموعے بھی ترتیب دیئے ہیں اور نند کشور وکرم اور شمس الرحمٰن فاروقی جیسے جید قلمکاروں کی حیات اور ادبی اختصاصات پر مضامین کے مجموعے بھی مرتب کیے ہیں۔

زیر نظر کتاب 'غبار فکر' پانچ سو بیس صفحوں پر مشتمل ہے اور حال ہی میں چھپی ہے۔ یہ ڈاکٹر اجے مالوی کے اکیس تنقیدی اور سات تحقیقی مقالات کا مجموعہ ہے۔ اس کے پہلے دو صفحے پر نامور شاعر چندر بھان خیال اور اصغر شمیم کے منظوم تاثرات ہیں۔ اس کے بعد معروف نقاد حقانی القاسمی اور پروفیسر آفتاب احمد آفاقی کی عمدہ تجزیاتی تحریریں بعنوان 'منثور تاثرات' درج ہیں۔ سرورق کے اندرونی فلیپ کی ایک جانب ثقہ نقاد پروفیسر گوپی چند نارنگ اور نظام صدیقی اور دوسری جانب سر برآوردہ ناول نگار، شاعر اور تخلیقی ترجمہ نگار پروفیسر یعقوب یاور اور مشہور فکشن نگار شموئل احمد کی مختصر رائیں ہیں۔

اصل کتاب دو شقوں میں منقسم ہے۔ صفحہ 27 سے 334 تک کی پہلی شق میں متنوع موضوعات پر اکیس تنقیدی مقالات شامل ہیں۔ ان میں پروفیسر گوپی چند نارنگ اور نظام صدیقی کے تنقیدی اختصاصات، اردو صحافت، کلاسیکی و جدید شاعروں اور افسانہ نگاروں کی تخلیقات پر نگاہ ڈالی گئی ہے۔ مقالات سے عیاں ہے کہ اردو ادب کے مختلف گوشوں پر ڈاکٹر اجے مالوی کی گہری نظر ہے نیز ان کا اپنا ایک کشادہ زاویہ نظر ہے۔ وہ ادب کا مطالعہ کسی 'ازم' کے بجائے آزادانہ اور غیر جانبدارانہ انداز سے کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس قسم کی تحریروں میں ان کے ہاں موضوعات کی کوئی حد بندی نہیں ہے۔

کتاب کی دوسری شق صفحہ 337 سے 520 تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس میں درج ذیل تحقیقی مقالات سمائے ہوئے ہیں: رگ ویدی تہذیبی تناظر میں لفظ اردو کی اصطلاحی معنویت و اہمیت، اردو میں رامائن، اردو میں مہابھارت، اردو میں شری مدگیتا، اردو میں پران، اردو میں منوسمرتی، اردو میں یوگ واششٹھ

اردو میں ایسے گمبھیر موضوعات پر برائے نام لکھا گیا ہے۔ اس لیے اردو کے قارئین کے لیے اس نوع کی تحریریں بالکل نئی اور اچھوتی مگر معلومات افزا ہیں۔

ڈاکٹر اجے مالوی نے مذکورہ موضوعات پر اہم مآخذ و مواد کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ فہرست سازی بھی کی ہے۔ ان کے حوالے سے مدلل گفتگو کی ہے۔ درمیان میں لسانی مباحث بھی پیش کیے ہیں اور ضمنی طور پر اردو زبان کی ابتدا و ارتقا کا بھی احاطہ کیا ہے جو قابل ستائش ہے۔ یہ مقالات نہ صرف کتاب کے وزن و وقار میں اضافے کا باعث ہیں بلکہ کتاب کی جان ہیں۔ ان سے علم وآگہی کی ایسی شعاع ریزی ہوتی ہے کہ ہمارا تہذیبی و ثقافتی تناظر زیادہ عمیق اور روشن ہو جاتا ہے۔ تاریخ ادب اردو میں بھی خوشگوار توسیع ہوتی ہے۔

مجھے یقین ہے کہ علمی و ادبی حلقوں میں اس تحقیقی کاوش کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

بنگال میں اردو ناولٹ نگاری (آغاز تا حال 2022)

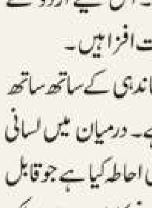

مصنف: ایم نصر اللہ نصر

صفحات: 192، قیمت: 300 روپے

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: عظیم انصاری، رحمت منزل '20/2'، بی پی روڈ، گلی نمبر 5

پوسٹ: جگتدل، ضلع: 24 پرگنہ شمال، مغربی بنگال- 743125

'بنگال میں اردو ناولٹ نگاری' ایم نصر اللہ نصر کی آٹھویں تصنیف ہے۔ اس سے قبل ان کے تین شعری مجموعے 'امکان سے آگے' 'ثنائے رب' اور 'احساس نگر' منصۂ شہود پر آکر داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے تنقید اور تحقیق پر چار کتابیں 'افہامِ ادب'، 'انتقاد و استبصار'، 'اذکارِ ادب' اور 'بنگال میں اردو نظم نگاری لکھ کر اپنی تنقیدی و تحقیقی کاوشوں کا عمدہ نمونہ پیش کیا ہے۔

زیرِ تبصرہ کتاب 'بنگال میں اردو ناولٹ نگاری' ایک تحقیقی کاوش ہے جس میں مصنف نے پہلے ناولٹ نگاری کا جائزہ لیا ہے اور پھر اس کے بعد اس کی تعریف ''توصیف اور خصوصیات کو سمجھانے کے ساتھ اس روایت اور تاریخی حیثیت کو بھی اجاگر کیا ہے۔ کتابوں کا تجزیہ ان کی تنقیدی بصیرت کا عمدہ نمونہ ہے۔ ایم نصر اللہ نصر ایک سنجیدہ ادیب ہیں اور جس موضوع کو ضبطِ تحریر میں لاتے ہیں'' اس کے ساتھ مکمل انصاف کرتے ہیں۔

مذکورہ کتاب میں ایم نصر اللہ نصر نے سب سے پہلے ہندوستان میں لکھے گئے ڈھیر سارے ناولٹس کا تعارف و تجزیہ پیش کیا ہے اور اس کے بعد اپنے خاص موضوع 'بنگال میں اردو ناولٹ نگاری' کا جائزہ پیش کرتے ہوئے یہ باور کرانے میں بہت حد تک کامیاب نظر آتے ہیں کہ بنگال بھی ہندوستان کے دوسرے صوبوں کی طرح اس معاملے میں بہت پیچھے نہیں ہے اور یہاں بھی اردو ناولٹ کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے جس پر اہلِ بنگالہ بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب میں انھوں نے ناولٹ نگاری کے سلسلے میں جو اپنی آرا پیش کی ہیں وہ یقیناً لائقِ تحسین ہیں۔ ناولٹ کی ابتدا اور ارتقا کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ:

''ناولٹ نگاری کی باضابطہ ابتدا اور ارتقا کی نہ کوئی تاریخ ہے نہ کوئی عہد' نہ متعین اصول۔ کوئی متفق اور منتخب رائے بھی نہیں ہے۔ اردو ناولٹ کے موضوع پر کوئی اہم تحقیقی کام بھی نہیں ہوا ہے۔ ہوا بھی ہے تو چند ایک۔ دوسری بات یہ کہ ناولٹ کو اردو ادب میں بہت بعد میں پہچانا گیا اور اسے ایک الگ صنف کا درجہ عطا کیا گیا۔'' (ص 12)

یہاں یہ بتاتا چلوں کہ توسیعی نثری داستان یا مختصر ناول کو ناولٹ کہتے ہیں۔ اس میں مصنف کو ایک مخصوص حد بندی میں اپنی کہانی کو رقم کرنی پڑتی ہے اور اپنے تجربات و مشاہدات کو بروئے کار لا کر قارئین سے اپنی صلاحیتوں کو منوانے کی بھرپور کوشش کی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں نصر کا کہنا ہے کہ'' ناولٹ ناول سے الگ نہیں لیکن مکمل ناول بھی نہیں ہے' زیادہ تر لوگ اس کی شناخت اس کی ضخامت کی بنیاد پر کرتے ہیں لیکن یہ اس کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت ہے۔ دوسری خصوصیات میں اس کی کہانی اور پلاٹ منفرد اور مختصر ہو۔ کہانی کسی ایک یا چند کردار پر مرکوز ہو۔ ناولٹ نگار کا مقصد بھی مخصوص و محدود ہو۔ اس کا اختصار اس کی مقبولیت کا راز ہے۔'' (ص 18-17)

فاضل مصنف نے ناولٹ کے آغاز و ارتقا پر بحث کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ پہلا ناولٹ نگار کون ہے' اس کے متعلق ناقدین کی الگ الگ رائے ہے اور اس کا فیصلہ کرنا ایک مشکل امر ہے لیکن مجموعی طور پر ڈپٹی نذیر احمد کی کتاب 'ایامیٰ' میں وہ تمام خصوصیات ملتی ہیں جس کی بنیاد پر اسے ناولٹ کہا جا سکتا ہے۔ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے مصنف نے ہندوستان اور پاکستان میں لکھے گئے تقریباً 90 سے زائد ناولٹ کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے جن ناولٹس کا تفصیلی جائزہ لیا ہے ان میں ڈپٹی نذیر احمد کا 'ایامیٰ'، عبدالحلیم شرر کا بدر النسا کی مصیبت' پریم چند کا روٹھی رانی' اور 'بیوہ' نیاز فتحپوری کا 'ایک شاعر کا انجام' اور 'شہاب کی سرگزشت' کشن پرشاد کول کا 'شیاما'، سجاد ظہیر کا 'لندن کی ایک رات'، عصمت چغتائی کا 'ضدی' سعادت حسن منٹو کا 'بغیر عنوان کے' کرشن چندر کا 'طوفان کی کلیاں' اور اپندر ناتھ اشک کا 'پتھر الپتھر' شامل ہیں۔

مندرجہ بالا ناولٹ کا ذکر کرنے کے بعد فاضل مصنف نے 1960 کے بعد کی اردو ناولٹ نگاری کا جائزہ لیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ بیسویں صدی کی چھٹی دہائی کے بعد قومی

اور بین الاقوامی سطح پر بڑی تبدیلیاں آئیں۔ سیاسی وسماجی حالات بدلے۔ جس کے نتیجے میں ڈھیر سارے مسائل جنم لیے۔ ان مسائل پر مبنی 25 ناولٹ سامنے آئے۔ ان میں قرۃ العین حیدر کے چار، سیتا ہرن (1960)، چائے کے باغ (1964)، اگلے جنم مجھے بٹیا نہ کیجو (1976) اور دلربا (1981)، جیلانی بانو کے دو، نغمہ کا سفر (1963) اور کیمیائے دل (1967)، راجندر سنگھ بیدی کا ایک چادر میلی سی (1960)، کرشن چندر کا دادر پل کے بچے (1960)، خواجہ احمد عباس کا دو بوند پانی (ساتویں دہائی)، قاضی عبدالستار کا مجو بھیا (1961)، عصمت چغتائی کا دل کی دنیا (1972)، حیات انصاری کا مدار (1981)، بانو قدسیہ کا موم کی گلیاں (2010) اور شمول احمد کا چمرا سر (2019) خاص ہیں۔

ہندوستان گیر سطح پر ناولٹ کے آغاز و ارتقا کے بعد ایم نصر اللہ نصر نے 'بنگال میں اردو ناولٹ نگاری' پر سیر حاصل گفتگو کی ہے اور اپنی تحقیقی کاوشوں سے 1917 سے لے کر 2021 تک کے 25 ناولٹ کا تذکرہ و تجزیہ کیا ہے۔ ان ناولٹس میں شین مظفر پوری کے دو، بشیر الدین ظامی کے دو، صغرا سبزواری کے دو اور صدیق عالم کے دو ناولٹس کا تجزیہ بھی شامل ہے۔ مغربی بنگال میں ناولٹ نگاری سے متعلق نصر اللہ نصر کی رائے کچھ یوں ہے:

''میرا موضوع بحث چونکہ بنگال میں ناولٹ نگاری ہے تو اس سلسلے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہاں اس کی شروعات تاخیر سے ہوئی اور بنگال میں کافی کم ناول اور ناولٹ لکھے گئے ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ بنگال میں لکھے گئے ناول اور ناولٹ کی اہمیت اردو ادب میں کوئی خاص نہیں ہے لیکن اس کے ساتھ اس حقیقت کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ جو بھی لکھا گیا اس کی قدر نہیں کی گئی۔ (ص 105)

ایم نصر اللہ نصر نے بنگال کے 25 ناولٹ کا صرف تذکرہ ہی نہیں کیا ہے بلکہ گہرائی سے ان کا شاندار تجزیہ بھی کیا ہے جو ان کی علمی وتنقیدی بصیرت کا اشاریہ بھی ہے۔ تحقیق کے ساتھ تنقید کا بہت گہرا رشتہ ہے۔ جس محقق کے یہاں تنقیدی بصیرت کے جوہر زیادہ ہوں گے۔ یقیناً اس کا تحقیقی کام اتنا ہی اعلیٰ ہوگا۔ اس بات سے غالباً سبھی واقف ہیں کہ تحقیق کا کام کبھی مکمل نہیں ہوتا۔ نصر نے بھی اس کتاب میں اس کمی کی طرف اشارہ کیا ہے لیکن انھیں اس بات کا ادراک ضرور ہے کہ باشعور اور پختہ کار محقق اپنی تنقیدی بصیرت سے اپنے تحقیقی کام کو بہت حد تک کامیابی سے ہم کنار کرلیتا ہے۔

ایم نصر اللہ نصر کی کتاب 'بنگال میں اردو ناولٹ نگاری' ایک عمدہ تحقیقی کاوش ہے۔ انھوں نے اس کتاب میں اپنی بات بیباکی سے رکھی ہے اور اپنے آپ کو نمایاں کرنے کی کوشش نہیں کی ہے جو انکی فطرت کا خاصہ بھی ہے۔ یہ کتاب مغربی بنگال میں ناولٹ کے تعلق سے ایک سنگِ میل ثابت ہوگی اور بعد کے محققین اس کی بنیاد پر مزید نئی راہیں تلاش کرسکتے ہیں۔ امیدِ کامل ہے کہ اردو ادب کا سنجیدہ حلقہ اس کتاب کو سراہے گا اور نصر اللہ نصر کی ادبی کاوشیں مقبولیت حاصل کریں گی۔

ابلاغیات

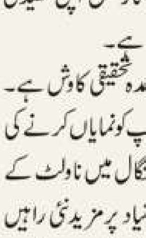

صحافت (کتابیات)

مرتب: ڈاکٹر محمد ذاکر حسین

صفحات: 624، قیمت: 1000 روپے، سنہ اشاعت: 2022

ناشر: مرکزی پبلی کیشنز، جامعہ نگر، نئی دہلی

مبصر: محمد مرجان علی، شعبۂ اردو، جے پرکاش یونیورسٹی، چھپرا، بہار

اردو صحافت کے دو سو برس مکمل ہونے پر بزمِ صدف انٹرنیشنل کی جانب سے یہ اعلان کیا گیا تھا کہ 'جامِ جہاں نما' کی اشاعت کی دوصدی کی تکمیل یعنی 27 مارچ 2022 کو بزمِ صدف انٹرنیشنل اردو صحافت کی تاریخ پر ایک کتاب شائع کرے گی۔ مگر دیکھا یہ گیا کہ حیدرآباد میں منعقدہ 'جشنِ اردو صحافت' میں 27-26 مارچ 2022 کو ایک ساتھ اردو صحافت کے حوالے سے دو ضخیم کتابیں منظرِ عام پر آئیں۔ 'اردو صحافت: دوصدی کا احتساب 2022-1822' مرتبہ صفدر امام قادری، محمد مرشد اور راج دیو کمار (752 صفحات) اور 'صحافت (کتابیات)' مرتبہ ڈاکٹر محمد ذاکر حسین (624 صفحات)۔ یقیناً اردو صحافت کے محققین کے لیے یہ دونوں کتابیں مشعلِ راہ کا کام کریں گی۔

اردو میں صحافت کی تاریخ کے تعلق سے زیادہ کتابیں موجود نہیں۔ خاص طور سے جدید ذرائع علم کی روشنی میں اُن کی تدوین وترتیب برائے نام ہے۔ اُن کی پیش کش کا انداز بھی معقول نہیں جس کے سبب نئے محققین کو ہزار طرح کی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ انھی مقاصد کے پیشِ نظر ممتاز محقق ڈاکٹر محمد ذاکر حسین نے اردو صحافت کی تاریخ کے حوالے سے ایک ضخیم کتابیات تیار کی ہے بہ عنوان 'صحافت (کتابیات)'۔ اس کتاب کے سببِ تالیف پر روشنی ڈالتے ہوئے مرتب رقم طراز ہیں:

''جب اردو صحافت کی دو سو سالہ تقریب کے انعقاد کا پروگرام مرتب کیا جانے لگا تو ایک ضرورت یہ محسوس کی گئی کہ ان دو سو برسوں میں اردو صحافت کے تعلق سے جو بھی کام ہوئے ہیں، اُس کی ایک ببلیوگرافی تیار کی جائے۔ بزمِ صدف کے ڈائرکٹر اور مشہور ومعروف ناقد ومحقق اور کالم نگار پروفیسر صفدر امام قادری صاحب نے اِس کمی کو محسوس کیا اور اس ناچیز کی ذہن سازی کرتے ہوئے اِس کام کو کر ڈالنے کا مشورہ دیا۔ یہ باتیں 10 دسمبر 2021 کو ہوئیں اور تقاضا یہ کہ 15 فروری 2022 تک اِسے مکمل کرنا ہے۔ اب اِن دو مہینوں کی محنت کا ثمرہ آپ کے سامنے ہے۔'' (ص 21-20)

اِس کتاب میں صحافت سے متعلق تقریباً تمام کتابوں کی تفصیل فراہم کر دی گئی ہے۔ کتاب کے 'حرفِ آغاز' میں کتاب کا ایک مختصر خاکہ اور ترتیب وتدوین کے دوران تمام نشیب وفراز سے گزرنے کے واقعات درج ہیں۔ اس کے بعد صفدر امام قادری صاحب کا ایک تعارفی مقدمہ شامل ہے جہاں صحافت کی تاریخ، اُس کی اہمیت اور موجودہ دور میں اردو صحافت اور اُس کی تحقیق کہاں کھڑی ہے؛ ان تمام باتوں کی شمولیت سے مقدمے کی افادیت میں اضافہ ہوا ہے۔ فہرست پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ حرفِ آغاز اور مقدمے کے بعد اصل میدان کی طرف ہم بڑھتے ہیں۔ اشاریۂ کتب میں کتابوں کی فہرست ۷ ارحصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصّے کا عنوان 'صحافت پر کتابیں: بہ لحاظ موضوعات' ہے۔ اِس حصے میں 29 موضوعات شامل کیے گئے ہیں جہاں 300 مطبوعہ کتابوں کی فہرست فراہم کی گئی ہے جس میں 'اداریہ نویسی' کو اوّلیت کا درجہ عطا کیا گیا ہے۔ چونکہ اخبارات ہوں یا رسائل، اداریہ نویسی کو اولیت کا درجہ حاصل ہے۔ اِس سلسلے سے چند دیگر عنوانات کچھ اس طرح سے نظر آتے ہیں:

''اداریہ نویسی، ادبی صحافت، اصول وفن، الکٹرانک میڈیا، تاریخ، پابند سلاسل، تحریکِ آزادی، تجارت، تشدد، تصویری صحافت، تفتیشی صحافت، خبرنگاری، ذرائع ابلاغ، رپورٹنگ، رسائل واخبارات، زبان وبیان، صحافت اطفال، صحافت نسواں، صحافی، عالمی تناظر، علاقائی تناظر، فارسی صحافت، فرہنگ واشارات، گلدستہ، مجلاّتی صحافت، مذہبی صحافت، مزاحیہ صحافت، مسائل وامکانات، مطالعۂ عمومی۔''

فہرست سے یہ خوش آئند نتیجہ نکلتا ہے کہ صحافت کے محققین اور خاص طور سے نئی نسل کو دورانِ تحقیق جو دشواریاں پیدا ہو رہی ہیں، انھیں کچھ حد تک اِس کتاب سے سہولت پیدا ہو جائے گی۔ اِس اشاریۂ کتب سے ایک اور بات یقین میں بدل جاتی ہے کہ ہمارے محققین جو صحافت کے تعلق سے بیش بہا خدمات انجام دینے میں پیش پیش

رہتے ہیں، وہ اِس کتاب کے مطالعے سے یہ سمجھ سکتے ہیں کہ اردو صحافت میں اور کون سی کتابوں اور کن کن موضوعات پر تحقیق کی ضرورت ہے؟ اور کون سے موضوعات ابھی ادھورے ہیں؟ اردو صحافت کے علمی درجے کو مزید مستحکم بنانے میں یہ کتاب ضرور مددگار ثابت ہوگی۔ اردو صحافت کے عالمی تناظر عنوان کے تحت 'بر صغیر'، 'برطانیہ'، 'پاکستان'، 'مصر'، 'ہندستان' کے متعلق کتابیں شامل ہیں جس سے اردو صحافت کے عالمی تناظر کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ 'علاقائی تناظر' عنوان کے تحت ہندستان کے مختلف علاقوں میں اردو صحافت سے متعلق کتابیں درج کی گئیں ہیں۔ مثلاً بنگال، بہار، یوپی، آگرہ، تمل ناڈو، جنوبی ہند وغیرہ وغیرہ موضوعات پر کتابوں کی تفصیلات دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ اردو صحافت کے محققین نے عالمی سے لے کر علاقائی اور مقامی موضوعات پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔

کتاب کے دوسرے حصے کا عنوان 'صحافت پر مضامین کتابوں میں: بہ لحاظ موضوعات' ہے۔ اِس میں کتابوں میں شامل مضامین کو شامل رکھا گیا ہے۔ اِس میں 60 موضوعات کے تحت 709 مضامین کی فہرست شامل ہے۔ چند موضوعات یہ ہیں: آزادی کے بعد اردو صحافت، آن لائن، اخلاقیات، اداریہ نویسی، ادبی تبصرہ، ادبی صحافت، اردو زبان، اشتہار، اصول وفن، افسانے، تحریک، آزادی، الکٹرانک میڈیا، انٹرنیٹ، ترتیب و تدوین، ٹریننگ، ٹکنالوجی، خبر نگاری، دہشت گردی، پروف ریڈنگ، ایڈیٹنگ، اصول وفن، وغیرہ وغیرہ۔'' اس میں 'الکٹرانک میڈیا'، 'انٹرنیٹ'، 'آن لائن'، 'ٹکنالوجی'، 'پروف ریڈنگ'، 'ایڈیٹنگ'، 'اصول وفن'؛ یہ ایسے موضوعات ہیں جہاں سے نئی نسل کو صحافت کے نئے رموز سے واقفیت کی ایک نئی راہ سامنے آئے گی۔

تیسرے حصے کا عنوان ہے: 'صحافت پر مضامین رسائل میں: بہ لحاظ موضوعات'۔ اِس حصے میں رسائل میں موجود 57 موضوعات پر 811 مضامین کی فہرست شامل کی گئی ہے۔ اِن موضوعات پر غور کریں تو مرتب کی محققانہ کاوشوں کی داد دینی پڑے گی۔ نہایت سنجیدگی اور باریک بینی سے مضامین کو رسائل سے اخذ کرکے مرتب کیا گیا ہے۔ آزادی کے بعد اردو صحافت، آن لائن، آئین، اصطلاحات، اداریہ نگاری، تحریکِ آزادی، سائنسی صحافت، ذرائع ابلاغ وغیرہ اِس ضمن میں کتابوں کی فہرست مطالعے سے ذوق رکھنے والوں کے لیے ایک علمی قطب نما سے کم نہیں۔

اِس کے علاوہ 'صحافت پر کتابیں: بہ ترتیب مصنّفین رمرتبین'، 'صحافت پر مضامین کتابوں میں: بہ ترتیب مضمون نگاران'، 'صحافت پر مضامین رسائل میں: بہ ترتیب مضمون نگاران'، 'صحافت پر کتابیں: بہ ترتیب ابجدی'، 'صحافت پر مضامین کتابوں میں: بہ ترتیب ابجدی'، 'صحافت پر مضامین رسائل میں: بہ ترتیب ابجدی'، 'اردو رسائل کی فہرستیں' میں 14 کتابیں، 'اردو رسائل کی اشاعتِ نو' کے تحت 9 رسائل کی 20 کتابیں، 'اردو رسائل کے انتخابات' کے تحت 20 رسائل کی 85 کتابیں، 'اردو رسائل کے صحافت نمبر' کے ضمن میں 12 رسائل کے خصوصی نمبر، 'اردو رسائل کے اشاریے' کے ذیل میں 132 کتابیں، 'کالم نگاری' کے لیے 15 کتابیں، 'اردو صحافی'، 'یونیورسٹیوں میں صحافت پر تحقیق' کے ضمن میں 80 تحقیقی مقالات: ایسے موضوعات پر کتابوں کی فہرست جمع کرکے ڈاکٹر محمد ذاکر حسین نے یقیناً ایک کارنامہ انجام دیا ہے۔ اردو کے موجودہ نقادوں کو ذاکر صاحب کے محققانہ ذہن اور کمال کا اعتراف کرنا ہی پڑے گا۔ مقدّمے میں صفدر امام قادری صاحب نے اِس اشاریۂ کتب کی افادیت واہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

''یہ کتابیاتِ صحافت اپنے اندر اردو صحافت کی تاریخ سے دل چسپی رکھنے والوں کے لیے معلومات کا ایک ایسا ذخیرہ ہے جہاں سے کوئی خالی ہاتھ نہیں لَوٹ سکتا۔ اِس کتابیات کے مطالعے کے بعد پڑھنے والوں کو ہزار نئے موضوعات ملیں گے اور تحقیق کی نئی راہیں کھلیں گی۔ جن موضوعات کے تعلق سے تحقیق کار یہ سمجھتے تھے کہ اب اِن باتوں کے لیے کوئی نئی دریافت ممکن نہیں یا تحقیقی مواد ہی دستیاب نہیں ہے؛ اِس کتاب کے بعد علم کا یہ اندھیرا چھٹ جائے گا اور وہ فرحت بخش استعجاب میسر آئے گا کہ ہمارے کتب خانوں میں علم وفن کی کتنی شاداب فصلیں ہمارا انتظار کر رہی ہیں۔''

یہ کتاب اپنی افادیت کے اعتبار سے آبِ حیات کا درجہ رکھتی ہے۔ عام طور پر صحافت کو ذرا کم ہی تحقیق کا موضوع بنانے کا اردو والوں میں رواج ہے جب کہ اس شعبے میں جس قدر علمی وادبی سرمایہ موجود ہے، اس کا بہت کم حصّہ محققین کے استعمال میں آسکا ہے۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد یقینی طور پر لوگ اردو کے عظیم صحافتی سرمائے کی علمی شان کی طرف متوجہ ہوں گے۔ یہ کتاب ہر یونی ورسٹی، کتب خانے اور ہر اخبار کے دفتر میں مصنّفین اور محققین کے ٹیبل پر ہونی چاہیے جہاں سے فوری طور پر نئے موضوعات کی تلاش وتحقیق کے دریچے وا ہوسکیں گے۔ 'صحافت (کتابیات)' کے مرتّب ڈاکٹر محمد ذاکر حسین اور مکتبہ صدف دونوں مبارک باد کے مستحق ہیں جن کی وجہ سے اردو صحافت کی دو صدی تقریبات میں علمی توجہ اور احتساب کا رویہ شامل ہوا اور ایسی قاموسی کتابیں منظرِ عام پر آسکیں۔

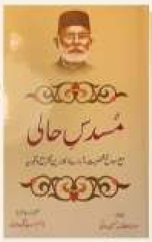

ترتیب

مسدس حالی

مرتب: سید تقی عابدی
صفحات: 270، سنہ اشاعت: 2021
مبصر: نجم الحسن خان

ڈاکٹر سیّد تقی عابدی معاصر ادب میں اہم مقام اور منفرد شناخت رکھتے ہیں۔ ان کی اردو، فارسی خدمات، متنوع اور منفرد موضوعات کی وجہ سے اہم ادبی مقام ومرتبہ کی حامل ہیں۔ وہ بیک وقت شاعر، محقق، نقاد، مرتب، مدون مورخ، اقبال شناس اور غالب شناس ہیں۔ انھوں نے حالی شناسی، اقبالیات اور غالبیات کے باب میں اہم اضافے کیے جو قابل ستائش ہیں۔ کلاسیکی متون کی بازیافت اور احیا کے لیے ڈاکٹر سیّد تقی عابدی کا تحقیقی زاویہ نگاہ انفرادیت کا حامل ہے۔ 'مسدس حالی' کی ترتیب بھی ان کے منفرد انداز تحقیق کا نمونہ ہے۔ 'مسدس حالی' مولانا الطاف حسین حالی کی شہرہ آفاق طویل نظم ہے۔ یہ نظم مدوجزر اسلام کے عنوان سے تخلیق ہوئی لیکن مشہور 'مسدس حالی' کے نام سے ہوئی۔

مسدس حالی کی تحقیق وترتیب کا فریضہ ڈاکٹر سیّد تقی عابدی نے بطریق احسن انجام دیا ہے۔ مسدس حالی کی اشاعت اول 2015 میں ہوئی جب کہ اشاعت دوم 2021ء میں ہوئی۔ یہ کتاب چھوٹی تقطیع کے 270 صفحات پر مشتمل ہے۔ ابتدائی سولہ صفحات کا کاغذ آرٹ پیپر ہے۔ ان سولہ صفحات میں سے چند مولانا الطاف حسین حالی کی دو تصاویر، عکس مزار، عکسِ تحریر حالی، عکس ومتن مکتوب سرسیّد بنام مولانا حالی پر مشتمل ہیں۔

(پروفیسر شارب ردولوی: 'ڈاکٹر تقی عابدی: محقق و دانشور' مشمولہ ماہنامہ حکیم الامت، سری نگر، مدیر: محمد ظفر حیدر، اکتوبر تا دسمبر 2019، ص 26، بک کارنر جہلم)

ڈاکٹر سیّد تقی عابدی کی 'مسدس حالی' کی ترتیب کا تحقیقی کارنامہ ادبی اہمیت کا حامل ہے۔ انھوں نے ہمیشہ ایسے موضوعات کو پیش کرنے کی کوشش کی جو دیگر محققین کی نظروں سے اوجھل رہے ہیں یا وہ منشائے مصنف کے مطابق پیش کرنے اور انفرادیت قائم کرنے میں ناکام رہے۔ ڈاکٹر سیّد تقی عابدی نے اندازِ تحقیق کی انفرادیت، محنت اور لگن سے بہت سارے معروف ومقبول موضوعات کو وقیع بنانے کے لیے بھرپور توانائیاں صرف کیں جنھیں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ تحقیق کے میدان میں ان کی عمیق نظری اور

ژرف نگاہی کا زمانہ قائل ہے۔

'مسدس حالی' کو اردو کی سب سے زیادہ شائع ہونے والی کتاب کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس قدر کثیر الاشاعت نظم کی از سر نو اشاعت، چہ معنی دارد؟ اس کا بنیادی جواب یہی ہوسکتا ہے کہ مقبول عام اور شاہکار تخلیق کی بازیافت اور بار بار اشاعت جہاں اس کی حیات جاودانی کی ضامن رہتی ہے وہاں اہم علمی ادبی ورثے کی نسل در نسل منتقلی کا سبب بھی بنتی ہے۔ تجارتی مقاصد بھی شہرہ آفاق تصانیف کی اشاعت کا محرک ہوتے ہیں لیکن محض مالی فوائد اور موضوع سے عدم دلچسپی کے تناظر میں متون کی اشاعت اغلاط سے پاک نہیں ہوسکتی۔ اغلاط در اغلاط سے متون پر تحقیق کا سلسلہ رکے نہ رکے سست روی کا شکار ضرور ہوجاتا ہے۔ بقول ڈاکٹر سیّد تقی عابدی:

''حالی کے کلام کی کمیابی اور پرانی کتابت کی غلطیوں سے بھرے ہوئے نسخوں کی طباعت حالی شناسی میں خلل انداز ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گذشتہ چالیس پچاس سال میں حالی پر کوئی خاص کار آمد تحقیقی اور تنقیدی کام نہ ہوسکا۔ کچھ عمدہ مقالے، تبصرے اور تجزیے مقدمہ شعر وشاعری پر ہر دور میں ہوتے رہے اور یہ صدائیں بھی دو تین دہائیوں سے خاموش ہوگئیں۔ راقم نے حالی شناسی کے فروغ کے لیے حالی کے کلام کو صرف نصاب میں شامل ضروری نہ جانا بلکہ عوام میں اس کے چرچے کو لازم جان کر اس کی فراہمی کا منصوبہ بنایا جس میں اکیسویں صدی کے اردو ماحول میں کلام حالی کا کلام جدید علمی تحقیقی وتنقیدی زاویوں پر استوار کر کے تجزیے اور تشریح کے ساتھ ایسی ترتیب اور تدوین کے ساتھ پیش کیا جائے کہ عالم اور عامی اس سے مستفید ہوسکیں۔ چنانچہ حالی کے کلام کے ہر حصے پر دقیق، دیدہ ریزی اور مستند حوالوں کی آبیاری سے گلشن تجزیے اور تشریح کو سنوارا گیا۔'' (ڈاکٹر سیدتقی عابدی (مرتب)، ڈاکٹر تقی عابدی، ص19)

سیدتقی عابدی کے پیش نظر کلیات حالی نظم کے تمام اہم مجموعے رہے۔ اس میں اسماعیل پانی پتی کی مرتبہ نامکمل کلیات بعنوان کلیات نظم حالی اور افتخار صدیقی کی مرتبہ 'کلیات نظم حالی' اور مسدس کے صدی ایڈیشن سے استفادہ کیا گیا۔ وہ ایک پختہ تحقیق کار ہیں، ان اہم کلیات نظم حالی کے علاوہ بھی انھوں نے حین حیات اور بعد از وفات کے مطبوعہ نسخوں سے ضرور استفادہ کیا ہوگا۔ مسدس حالی کے ایڈیشن اور پیش نظر مطبوعہ نسخوں کے بارے میں ڈاکٹر سیّد تقی عابدی رقم طراز ہیں:

''حالی کے مسدس کا پہلا ایڈیشن سال بھر میں ختم ہوگیا۔ دوسرا ایڈیشن بھی ایک ہی سال میں ختم ہوا تو مسدس کے تیسرے ایڈیشن میں حالی نے مسدس پر نظر ثانی کی مصرعوں کو بدلا، بندوں میں اضافہ کیا اور ضمیمہ کا بھی اضافہ کر کے چھے سال بعد اٹھارہ سو چھیاسی میں شائع کروایا۔ حالی کی مسدس میں 294 بند ہیں اور ضمیمہ میں 164 بند ہیں اس طرح کل بندوں کی تعداد چار سو اٹھاون ہے حالی کی سو سالہ ولادت کی سالگرہ پر 1935 میں ڈاکٹر عابد حسین کے مقدمے کے ساتھ مسدس کا صدی ایڈیشن بڑے اہتمام سے شائع ہوا۔ ہم نے یہاں اسی صدی ایڈیشن کے نسخے سے استفادہ کیا۔'' (ایضاً، ص22)

مسدس حالی مرتبہ ڈاکٹر سیّد تقی عابدی میں انھوں نے مختلف مضامین بعنوان 'پیش لفظ' حالی کی حیات اور شخصیت'، 'مسدس کا اجمالی جائزہ'، 'مسدس پر اکابرین کے تاثرات' اور 'اقتباسِ مسدس' تحریر فرمائے ہیں جو کہ خاصے کی چیزیں ہیں۔ پیش لفظ آٹھ صفحات پر مشتمل مختصر مقدمہ ہے جس میں معماران اور محسنین ادب کی بے قدری کے ذکر کے ساتھ ساتھ الطاف حسین حالی کی عصری پذیرائی کا بیان بھی ہے۔ اس کے علاوہ اشاعتِ کلام حالی کی عہد بہ عہد روایت کو درج کیا ہے۔ بنیادی طور پر پانچ میں سے چار مضامین کو مقدمے کے اجزا قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ یہ مضامین مذکورہ بالا ترتیب میں پیش کیے گئے ہیں۔

''حالی کی حیات اور شخصیت'' پہلا مضمون ہے جو کہ سوانح، شخصیت حالی کا مستند مصدر ہے۔ ڈاکٹر سیّد تقی عابدی نے زیادہ تر صالحہ عابد حسین کی تصنیف 'یادگار حالی' غلام السطین کی غیر مطبوعہ ڈائری اور مولانا حالی کے خانوادے کے بیانات سے استفادہ کیا ہے۔ سوانحی حالات میں مولانا حالی کا خاندانی پس منظر، ولادت، اولادیں، مذہب ومسلک، تعلیم، ادبی خدمات کا احاطہ جامع انداز میں پیش کیا ہے۔ جبکہ شخصیت کے تناظر میں اخلاق و کردار، ملازموں کے ساتھ سلوک اور خاندان کے افراد سے رویے اور بالخصوص شریک حیات کے ساتھ سلوک و رویے کو موضوع بنایا گیا ہے۔

اس مقالے کے آخر میں ڈاکٹر سیّد تقی عابدی نے انتہائی مہارت اور محنت سے مولانا حالی کے مکمل کلام کا جدول بعنوان 'جدول اشعار حالی' ترتیب دی ہے۔ اس میں مولانا حالی کے فارسی اور اردو دونوں زبانوں کے اشعار کی تعداد رقم کی گئی ہے۔ اس سے ان کے کلام کی تقسیم بہ لحاظ اصناف بھی سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اسی طرح 'مسدس حالی کا اجمالی جائزہ' دوسرا مضمون ہے جو مولانا حالی کی فکر وفن کا شاندار تنقیدی جائزہ ہے۔ اس مضمون کی ابتدا میں سنین تصنیفات رباعی، مسدس، ضمیمہ اور عرض حال تحریر کیے ہیں اور ساتھ ہی جدول اشعار مسدس کچھ یوں رقم کی ہے:

''جدول اشعارِ مسدس

رباعی: 2 شعر، مسدس: (294 بند) 882 شعر، ضمیمہ: (164 بند) 492 شعر، عرض حال: 63 شعر، کل تعداد اشعار: مسدس اور ضمیمہ: (1374) اشعار (ایضاً، ص73)

ڈاکٹر سیّد تقی عابدی کا تیسرا مضمون 'مسدس پر اکابرین کے تاثرات' کے عنوان سے ہے۔ سر سید احمد خان، شیخ محمد اکرام، علامہ اقبال، سید سلیمان ندوی، عبدالماجد دریابادی، عبید الرحمٰن خان شیروانی، مولوی عبدالحق، سید سر راس مسعود، خواجہ غلام السیدین، عابد حسین، رام بابو سکسینہ، رشید احمد صدیقی صالحہ عابد حسین کے اردو میں تاثرات رقم ہیں جبکہ سیدہ سیدین حمید کا انگریزی میں مسدس پر تاثر شامل ہے۔ اس کے علاوہ مالک رام، ابو اللیث صدیقی، جلیل قدوائی اور ڈاکٹر گریہم بیل کے تاثرات بھی شامل ہیں۔

ڈاکٹر سیّد تقی عابدی کے چوتھے مضمون کا عنوان 'اقتباس مسدس' ہے۔ مسدس حالی کے نام سے مشہور طویل نظم کا عنوان مدو جزر اسلام ہے۔ عنوان سے ہی نظم کے موضوعات کا انداز ہوتا ہے۔ یہ نظم اسلام کے شاندار ماضی اور مسلمانوں کے کرب ناک حال کا نوحہ ہے۔ ڈاکٹر سیّد تقی عابدی نے مدو جزر اسلام کے موضوعات کا احاطہ مسدس کے اشعار کے انتخاب اور ان کی تشریح سے کرنے کی کوشش کی ہے۔

بحیثیت مجموعی مسدس حالی کی ترتیب اہم کلاسیکی متن کی بازیافت کے ساتھ ساتھ عوام تک رسائی اور دستیابی کا سبب بھی ہے۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی نے اغلاط سے پاک متن ترتیب دیا اور مقدمہ کے تینوں اجزا سوانحِ مصنف، اہمیت تصنیف اور اصول ترتیبِ متن کا بطور خاص خیال رکھا ہے۔ ترتیبِ متن کے ساتھ ساتھ فرہنگِ متن کا اہتمام قارئین کی آسانی کا سامان ہے اور مذکورہ صفحے پر اندراج مفہوم ومعنی، مراجعت میں آسانی کا سبب ہے۔ انھوں نے اپنے شاندار پانچ مقدماتی مضامین سے کثیر الاشاعت متن کو منفرد اور وقیع بنا دیا ہے اور فرہنگِ متن سے تعبیر وتشریح کا فریضہ انجام دیا ہے۔ ان کی یہ کاوش جہاں حالی شناسی کے باب میں اہم اضافہ ہے وہاں شہرہ آفاق تصنیف کی قدردانی اور داد وتحسین کا واضح ثبوت ہے۔

نیا ناول نیا تناظر (اکیسویں صدی میں)

مرتبین: کوثر مظہری، امتیاز احمد علیمی
صفحات: 536، قیمت: 450 روپے، سنہ اشاعت: 2021
ناشر: کریٹیو اسٹار پبلی کیشنز، جامعہ نگر، نئی دہلی
مبصر: مصطفیٰ علی، جونیئر پروجیکٹ فیلو، ڈپارٹمنٹ آف ایجوکیشن ان لینگویجز، این سی ای آر ٹی، نئی دہلی

ایک ڈیڑھ صدی کی طویل مسافت کے بعد اردو ناول اب اکیسویں صدی میں سفر کر رہا ہے۔ اس صدی میں اس کا کیا رنگ روپ ہے، کیسی شکل وشباہت ہے، کس ٹرینڈ اور طرز پر چل رہا ہے، یہ جاننے اور سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم موجودہ صدی کی تکمیل شدہ دونوں دہائیوں میں شائع شدہ ناولوں کا ایک سرسری جائزہ لیں، پھر ان میں سے چند کو منتخب کر کے ان کا گہرائی سے مطالعہ کریں۔ اس طرح ناولوں کی تعداد جتنی زیادہ ہوگی، ہمیں اتنا ہی وقت درکار ہوگا، لیکن اگر فرد واحد کے بجائے ایک جماعت سے یہ خدمت لی جائے تو مدتِ مدید کا یہ کام قلیل مدت میں سرانجام پا جائے گا۔ پروفیسر کوثر مظہری اور امتیاز احمد علیمی جیسے مرتبین نے ہماری سہولت کی خاطر اس امر کو اپنے ذمے لیا اور اسے پایۂ تکمیل کو پہنچاتے ہوئے 'نیا ناول نیا تناظر (اکیسویں صدی میں)' کے نام سے کتابی شکل میں ہمارے سامنے پیش کر دیا، جو کہ اقتضائے وقت کے عین مطابق ہے۔ اور جس دور میں تصنیف وتالیف کے میدان میں چراغ کے سامنے شمع جلانے کا کارزیاں زوروں پر چل رہا ہو، کسی کام کا تقاضائے وقت کے مطابق ہونا بڑی خوش آئند بات ہے۔

زیر تبصرہ کتاب میں جن الگ الگ ناولوں کے تنقیدی وتجزیاتی مطالعے پر مبنی کل پینتیس مضامین شامل ہیں، ان کے نام ترتیب وار یہ ہیں: کئی چاند تھے سرِ آسماں (شمس الرحمٰن فاروقی)، بنارس والی گلی (فیاض رفعت)، اگر تم لوٹ آتے (آچاریہ اشوک خلیل)، بلھا کیہ جاناں میں کون (ذکیہ مشہدی)، چراسر (شموئل احمد)، اماوس میں خواب (حسین الحق)، تلک الایام (نورالحسنین)، خواب سراب (انیس اشفاق)، مرزبوم (صدیق عالم)، اجالوں کی سیاہی (عبدالصمد)، عزازیل (یعقوب یاور)، مانجھی (غضنفر)، پلیتہ (پیغام آفاقی)، راجدیو کی امرائی (صادقہ نواب سحر)، آخری سواریاں (سید محمد اشرف)، میرے ہونے میں کیا برائی ہے (رینو بہل)، فائرنگ رینج کشمیر 1990 (شفق سوپوری)، اندھیرا پگ (ثروت خان)، نعمت خانہ (خالد جاوید)، برف آشنا پرندے (ترنم ریاض)، اللہ میاں کا کارخانہ (محسن خان)، مرگ انبوہ (مشرف عالم ذوقی)، ہجور آما (شبیر احمد)، صدائے عندلیب بر شاخ شب (شائستہ فاخری)، آسماں سے آگے (احمد صغیر)، آنکھ جو سوچتی ہے (کوثر مظہری)، لیمی نیٹیڈ گرل (اختر آزاد)، زباں بریدہ (آصف زہری)، تخم خوں (صغیر رحمانی)، میرے نالوں کی گمشدہ آواز (محمد علیم)، روحزن (رحمٰن عباس)، اوڑھنی (نصرت شمسی)، تعاقب (ممتاز عالم رضوی)، خلش (سفینہ بیگم) اور لفظوں کا لہو (سلمان عبدالصمد)۔

شروع میں پانچ مضامین ایسے بھی ہیں جو اردو ناول کے مکمل سفرنامے یا اکیسویں صدی میں اردو ناول کے منظرنامے کا بھرپور احاطہ کرتے ہیں۔ ان مضامین اور مضمون نگاران کے نام بالترتیب یہ ہیں: اردو ناول اکیسویں صدی میں از کوثر مظہری، ناول اور ہم از خالد جاوید، اکیسویں صدی میں اردو ناول از مولا بخش، اکیسویں صدی میں ناول کی اہمیت، انکشافات اور امکانات از ابوبکر عباد، مکالمہ اکیسویں صدی کے ناولوں پر از امتیاز احمد علیمی۔

لکھنے والوں میں اساتذہ بھی ہیں اور ریسرچ اسکالرز بھی۔ زیر تبصرہ کتاب میں پیش کردہ مضامین کا سادہ اسلوب، وضاحتی طریقۂ کار اور تنقیدی بصیرت میں ڈوبا ہوا بے لاگ ودوٹوک انداز بیان بے حد متاثر کن ہے۔

مذکورہ کتاب کو مرتب کرنے کے پیچھے یہ مقصد کارفرما رہا ہے کہ اکیسویں صدی میں ناول کا جو نیا ٹرینڈ قائم ہوا ہے اس کی تفہیم ہو سکے۔ اس کے علاوہ موضوع، اسلوب اور تکنیک کی سطح پر جو نمایاں تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ ان کا محاکمہ متن کی روشنی میں کیا جا سکے۔ تعصب اور مرعوبیت سے پاک مضامین پر مشتمل یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کے مطالعے سے بحث کے نئے دروا ہونے کے قوی امکانات ہیں۔ مضامین سے قبل ہر تخلیق کار کا مختصر سوانحی خاکہ بھی دیا گیا ہے، جس سے قارئین کو متعلقہ تخلیق کار کے بارے میں کچھ معلومات بھی حاصل ہو سکے گی۔

زیر نظر کتاب ہمارے زمانے کی سب سے اہم اور مقبول صنف ناول کا تنقیدی اور تجزیاتی مطالعہ پیش کرتی ہے۔ یہ مطالعہ اکیسویں صدی کو محیط ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس صدی میں ناول نے اپنی تعریف بدلی ہے۔ اس کے صنفی امتیازات اب پوری طرح ابھر کر سامنے آ چکے ہیں۔ کیوں اور کیسے؟ اس کا جواب اس کتاب کا مطالعہ کرنے پر آپ کو مل جائے گا۔

کتاب پروف اور ٹائپنگ کی خامیوں سے تقریباً پاک ہے اور طباعت بھی عمدہ ہے۔ فونٹ سائز معیاری اور ورق بھی مناسب استعمال ہوا ہے۔ تمام مضامین تجزیہ وتنقید نگاری کے بنیادی اصولوں کی حتی الامکان پیروی کرتے ہیں۔ اس طرح اس کتاب کو تجزیہ نگاری کا عملی نمونہ قرار دینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ متذکرہ کتاب طلبہ کی تنقیدی وتجزیاتی بصیرت افروزی کے لیے بے حد معاون ثابت ہوگی۔ کتاب کے مرتبین اس کے لیے مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے تازہ ترین کام ترتیب دے کر ہم تشنگانِ علم وادب کی سیرابی کا سامان فراہم کیا۔ مجھے قوی امید ہے کہ علمی وادبی حلقوں میں اس کی خوب پذیرائی ہوگی۔

کلیات یگانہ

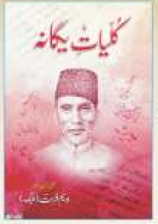

مرتب: وسیم فرحت (علیگ)
صفحات: 392، قیمت: 400 روپے، سنہ اشاعت: جنوری 2022
ناشر: عالیہ فرحت
پبلشر: اردو پبلی کیشنز، امراوتی، مہاراشٹر
مبصر: طلعت جہاں، 55/H/4، اسماعیل اسٹریٹ، کولکاتہ۔700014، مغربی بنگال

یاس یگانہ چنگیزی اردو شاعری میں ایک اہم نام ہے جنھوں نے اردو شاعری کی تمام مروج روایتوں سے انحراف کیا اور شاعری میں خصوصاً غزلوں میں نئے موضوعات اور نئے اسلوب کا اختراع کیا ان میں جدت وندرت پیدا کی۔ یگانہ کی زندگی آزمائشوں سے بھری رہی لیکن انھوں نے زندگی سے کبھی ہار نہیں مانی بلکہ دیدہ دلیری کے ساتھ اس کا سامنا کیا، زندگی کے طویل عرصے تک تنہا اہل لکھنؤ کی مخالفت کا سامنا کرنا، اپنی شاعری کے ذریعے بے باک ہو کر انھیں جواب دینا یگانہ جیسے غیر معمولی شخص ہی کر سکتے تھے۔ اس عظیم شخصیت کو نئے سرے سے سمجھنے اور ان کے شعری کلام کو نئے انداز سے متعارف کرنے کا کام وسیم فرحت (علیگ) صاحب کی مرتب کی ہوئی کتاب کلیات یگانہ مکمل کامیابی کے ساتھ کرتی ہے۔

'کلیات یگانہ' تین اہم ابواب پر مشتمل ہے جن میں غزلیات (اردو اور فارسی)، رباعیات (اردو اور فارسی) اور متفرقات (سہرا، قطعہ، نظم، مثلث، قطعۂ تاریخ) وغیرہ

شامل ہیں۔ یوں تو 2003 میں مشفق خواجہ صاحب نے کلیات یگانہ کو ترتیب دیا تھا لیکن اس کتاب سے وسیم فرحت صاحب قطعی شاکی نظر آتے ہیں کیونکہ خواجہ صاحب کی ترتیب کردہ 'کلیات یگانہ' 900 صفحات پر مشتمل ہے اس ضخیم کلیات کا نصف حصہ شعر اور نصف حصہ نثر ہے۔ وسیم فرحت صاحب کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''پی ایچ ڈی کا مقالہ اور شعری کلیات میں یقیناً فرق ہوتا ہے۔ ہم خواجہ صاحب کے نصف ہزار صفحات کو تحقیق کا اعلیٰ نمونہ تو قرار دے سکتے ہیں تاہم ان صفحات کی کلیات میں بے دریغ شرکت قطعی مناسب نہیں۔'' (کلیات یگانہ از وسیم فرحت (علیگ) ص 7)

یہی بات کلیات یگانہ کی از سرِ نو تحقیق و تدوین کا محرک بنی جس میں انھوں نے اختصار کو ملحوظ خاطر رکھا ہے۔

مذکورہ کتاب میں ایک مقدمہ درج ہے جس میں حیات برائے جہاد، جہاد برائے ادب، ادب برائے وجود اور وجود برائے ادب جیسے عنوانات قائم کیے گئے ہیں۔ ان عنوانات میں یگانہ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ وسیم فرحت کے قائم کردہ ان عنوانات کے مطالعے کے بعد ہمیں یگانہ کی انسان دوستی کا مسلّم ثبوت ملتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم نے یگانہ کو خود پرست اور غالب کی مخالفت کرنے والا شاعر ہی سمجھا ہے لیکن اس مخالفت کے پس پردہ کیا وجوہات کارفرما رہے تھے، کس طرح اہل لکھنؤ نے انھیں ذہنی و جذباتی طور پر رسوا کیا، انھیں معاشی تنگ دستی سے نبرد آزما ہونا پڑا حتیٰ کہ گھر چھوڑنے پر مجبور کیا گیا اور کئی سارے قیمتی مسودات کو ضائع کر دیا گیا وغیرہ تمام باتیں مع حوالہ وسیم فرحت صاحب نے پیش کیا ہے۔ کتاب کے حواشی لکھنے میں جس طرح انھوں نے عرق ریزی سے کام لیا ہے وہ ان کے یگانہ کے تئیں خلوص، ان کے محققانہ جذبہ اور ادب سے ان کے لگاؤ کو بخوبی نمایاں کرتا ہے۔ اپنی اس بات کی تائید میں درج ذیل اقوال کے ذریعے کرنا چاہوں گی:

''کلیات یگانہ کی اشاعت آپ کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ یگانہ پر آپ کی تین مشہور کتابیں مونوگراف، یگانہ شناسی اور 'یگانہ چنگیزی شخصیت و فن' یگانہ کو ان کا ادبی حق دلانے کی بہترین کوششیں ہیں۔ اردو میں بہت جلدی لوگ ماہر کا خطاب حاصل کر لیتے ہیں لیکن یگانہ پر جس طرح آپ نے کام کیا ہے وہ ان کی شخصیت اور ان کی شاعری پر آپ کی مہارت کا اظہار ہے۔'' ڈاکٹر شارب ردولوی (لکھنؤ)

''یگانہ پر آپ نے جتنا کام کیا ہے وہ عدیم المثال ہے۔ اب پچھلے چند دنوں سے آپ کا مرتب و مدون 'کلیات یگانہ' میرے مطالعے میں ہے۔ یہ کام اداروں کا ہے جسے آپ نے تنہا کر دکھایا ہے... کلیات یگانہ آپ کی تحقیقی، ترتیبی اور تدوینی صلاحیتوں کا شاہکار اور تاریخی دستاویز ہے جس کے مطالعے سے یہ معلوم ہوگا کہ اگر یگانہ نہ ہوتے تو اردو ہی نہیں ہندوستانی زبانوں میں لکھی جانے والی غزل کی یہ چھب نہ ہوتی نہ ایسا ڈھب'' شین کاف نظام

یگانہ چنگیزی پر وسیم فرحت صاحب کی کاوش یقیناً قابل تحسین ہے جس سے دنیائے ادب خصوصاً طالب علم طبقہ ہمیشہ فیضیاب ہوتا رہے گا۔

امید ہے کہ وسیم فرحت (علیگ) صاحب کی اس سنجیدہ کاوش کے بعد یاس یگانہ چنگیزی پر قلم اٹھانے والا ہر لکھاری صدق دل سے ہی ان پر قلم اٹھائے گا۔ مختصراً میں اپنی بات کو داغ دہلوی کے اس شعر سے ختم کرنا چاہوں گی۔

خط ان کا بہت خوب عبارت بہت اچھی
اللہ کرے حسن رقم اور زیادہ

طنز ومزاح

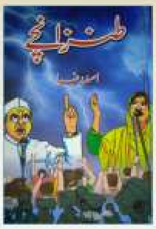

طنزانچے

مصنف: اسد رضا
صفحات 128، قیمت: 150 روپے
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
مبصر: جمال عباس فہمی، 75 قاضی زادہ، امروہہ 244221 (یوپی)

تبصرے کے لیے میرے سامنے جو کتاب ہے وہ ہے 'طنزانچے'۔ اس کے مصنف ہیں اسد رضا۔ اسد رضا صحافی بھی ہیں شاعر بھی ہیں۔ ادیب بھی ہیں اور مزاح نگار بھی ہیں۔ درجن بھر سے زیادہ کتابیں لکھ چکے ہیں۔ اسد رضا مختلف موضوعات پر طویل عرصے سے لکھ رہے ہیں۔ 20 برس تک طنزیہ اور مزاحیہ کالم لکھتے رہے ہیں۔ مجموعی طور پر اردو صحافت اور خصوصی طور پر پنجاب میں اردو صحافت کی تاریخ پر دستاویزی حیثیت کی کتابیں لکھ چکے ہیں۔ میرٹھ یونیورسٹی کی ایک اسکالر انکی طنز و مزاح نگار کی حیثیت پر تحقیقی مقالہ لکھ چکی ہے۔ اسد رضا ٹیکنالوجی کے عروج سے پہلے کا دور بھی دیکھے ہوئے ہیں اور ٹیکنالوجی کے عروج کو بذات خود برت بھی رہے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ آج کا انسان شارٹ کٹ پسند ہو گیا ہے۔ کم سے کم وقت میں وہ بہت کچھ حاصل کر لینے کا خواہاں ہے۔ اس کی اسی شارٹ کٹ سوچ کو مدنظر رکھتے ہوئے اسد رضا نے افسانچہ کی طرز پر مختصر طنزیہ اور مزاحیہ مضامین لکھنا شروع کیے، اور اسکو نام دیا طنزانچہ۔ مختصر لکھتے لکھتے اسد رضا چند سطری طنزیہ و مزاحیہ مضامین تک پہنچ گئے۔ 'طنزانچے' کتاب میں شامل مضامین کی تعداد 59 ہے۔ ان میں 9 مضامین دس یا دس سے بھی کم سطروں میں سمٹے ہوئے ہیں۔

اسد رضا صحافی اور شاعر ہیں۔ گرد و پیش کو دیکھنے کا ان کا انداز عام لوگوں سے جداگانہ ہوتا ہے۔ وہ حالات، واقعات، سماجی، سیاسی، مذہبی اور اقتصادی تبدیلیوں کا گہرائی اور گیرائی سے جائزہ لیتے ہیں اس کے بعد ان کا قلم حرکت میں آتا ہے۔ انھوں نے ان موضوعات پر تحریر کیا جن پر عام طور پر قلم اٹھایا نہیں جاتا۔ اسد رضا نے سماجی برائیوں پر بھی لکھا۔ معاشرے اور سیاسی میدان کی گوناگوں تبدیلیوں پر بھی لکھا۔ اخلاقی قدروں کے انحطاط پر بھی انکا قلم چلا۔ 'دعوت چہلم' طنزانچہ سماجی برائیوں اور اسراف کے خلاف ان کی ایک پر اثر تحریر ہے:

''نہیں نہیں میں اپنے سونے کے بندے اور کڑے بیچنے کے لیے ہرگز نہیں دوں گی۔ رابعہ کے پاپا ذرا سوچیے ہماری دو بیٹیاں ہیں۔ انکی شادی پر سونے کے یہی زیور کام آئیں گے۔'' رابعہ اور رافعہ کی امی نے ہاتھ جوڑ کر اپنے شوہر کلیم سے کہا تو فوراً کلیم کی والدہ بول پڑیں۔ ''اے بہو کلیم کے ابا کا چہلم بار بار نہیں ہوگا۔ کلیم کی نوکری کورونا کی وجہ سے ختم ہو گئی ہے لیکن جلد ہی یہ وبا ختم ہو جائے گی۔ نوکری بحال ہونے کے بعد تمھاری بیٹیوں کے لیے زیور خرید لیے جائیں گے۔''

''ہاں اماں آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ ابا کا چہلم تو ایک ہی بار ہونا ہے۔ نوکری بحال ہوتے ہی میں اپنی بیٹیوں کے لیے زیور بنوا دوں گا۔'' کلیم نے یہ کہہ کر اپنی روتی ہوئی بیوی سے زیور لیے نہیں بلکہ تقریباً چھین لیے۔ فاتحہ و دعوت چہلم پر لگ بھگ ڈیڑھ لاکھ روپے خرچ ہونے تھے جبکہ زیور پونے دو لاکھ کے فروخت ہوئے۔ اس لیے اگلے روز مسجد کے لاؤڈ اسپیکر سے امام صاحب اعلان کر رہے تھے۔ ''مرحوم سلیم احمد کی فاتحہ اور دعوت چہلم کل بروز جمعرات دو پہر ایک بجے ہوگی۔ ساری برادری سے شرکت کی

درخواست ہے۔ ''اسد رضا کا تعلق چونکہ اخبارات سے رہا ہے اور اخبارات کی زبان عوامی ہوتی ہے۔ آسان ہوتی ہے۔ اس لیے اسد رضا کی زبان بھی نہایت آسان اور سادہ ہے۔ وہ بھاری بھرکم الفاظ کا استعمال نہیں کرتے ہیں۔ 'اردو کی بدقسمتی' عنوان کے طنزانچے کی زبان ملاحظہ کیجیے:

''کل ہند مشاعرہ لوٹنے اور تیس ہزار روپے کا حامل لفافہ لے کر معروف اردو شاعرہ شاہینہ شاہجہانی جیسے ہی اسٹیج پر آکر بیٹھیں ایک اردو روزنامہ کے رپورٹر نے ان کے سامنے ایک ڈائری رکھتے ہوئے ان سے درخواست کی کہ'' میں اپنے اخبار میں اس مشاعرے کی رپورٹ دونگا۔ پلیز اپنا ایک پسندیدہ شعر ڈائری میں لکھ دیجیے۔'' یہ سن کر شاہینہ پہلے تو سٹپٹائیں اور پھر اپنے پرس سے قلم نکال کر ڈائری میں ہندی رسم الخط میں یعنی ناگری لپی میں اپنا شعر لکھ دیا۔ جسے دیکھ کر رپورٹر نے سوال کیا۔ ''شاہینہ صاحبہ آپ تو ایک اہم شاعرہ ہیں۔ لیکن شعر آپ نے ناگری لپی میں میں لکھا ہے۔ کیا آپ اردو زبان سے ناواقف ہیں۔''

یہ سوال سن کر شاہینہ نے شرمندگی کے ساتھ کہا'' معاف کیجیے مجھے بدقسمتی سے اردو لکھنا پڑھنا نہیں آتا۔''

یہ آپ کی نہیں اردو کی بدقسمتی ہے کہ آج اس کی شاعرہ اپنی شاعری کی زبان نہیں جانتیں۔''

موضوعات ہمارے چاروں طرف بکھرے پڑے ہیں۔ اسد رضا کمال احتیاط کے ساتھ موضوع منتخب کرتے ہیں اور نہایت نپے تلے انداز میں اس پر تحریر کرتے ہیں۔

طنزیہ اور مزاحیہ مضامین لکھنا ویسے بھی دشوار ہوتا ہے اور وہ بھی مختصر ترین طور سے لکھنا نہایت ہی مشکل مرحلہ ہے اور اسد رضا اس مشکل مرحلے کو بہ آسانی طے کر جاتے ہیں۔ امید کی جاسکتی ہے کہ نوزائیدہ صنف ادب 'طنزانچہ' جوان بھی ہوگی اور نئے لکھنے والوں میں مقبول بھی ہوگی۔ طنزانچے کے مختصر طنزیہ مضامین پڑھ کر مصنف کی فکری روش اور عصری تقاضوں سے اس کی ہم آہنگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسد رضا کے طنزیہ مضامین پڑھ کر اگر آپ زوردار قہقہہ لگا کر نہ بھی ہنسیں تو زیرلب مسکراہٹ کا تو لطف ضرور لیں گے۔

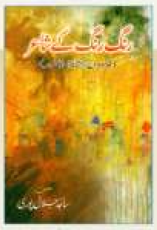

رنگ رنگ کے شاعر

مصنف: ساجد جلال پوری (عزادار حسین)

صفحات: 224، قیمت: 250 روپے، سنہ اشاعت: 2021

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، انصاری روڈ، دریا گنج، نئی دہلی

مبصر: محمد اشرف یاسین، E-66، دوسری منزل، شاہین باغ، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی، 25

اردو ادب میں طنز و مزاح کی تاریخ اور روایت کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس میدان میں عمومی طور پر ہمارے مزاح نگاروں کی اکثریت نے صرف دو اصناف 'انشائیہ' اور 'خاکہ' کو ہی اپنی تخلیق کے لیے منتخب کیا ہے۔ اس کی وجہ بتاتے ہوئے پروفیسر قمر رئیس نے اپنی کتاب 'اُردو ادب میں طنز و مزاح کی روایت اور ہم عصر رجحانات ایک جائزہ (1986)' میں صفحہ نمبر 09 پر لکھا ہے: ''دراصل اردو کے بیشتر ادیب طنز و مزاح کے لیے انشائیہ یا خاکے کا انتخاب کرتے ہیں۔ اس لیے کہ اس کے محدود اور مختصر پیکر میں کچھ مبالغہ کچھ ماحول آفرینی اور کچھ مزیدار جملوں اور فقروں کی تراش سے رنگ بھرنا نسبتاً آسان ہوتا ہے۔ وہ کسی بڑے تخیلی کینوس پر، ڈرامہ یا قصہ کی صورت میں سماجی نظام کی مضحک ناہمواریوں کے شعبدے دکھانے سے گریز کرتے ہیں۔ اس لیے کہ اس میں تخیلی فکر اور تخلیقی ہنر دونوں کی آزمائش ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو طنز و مزاح کا بڑا سرمایہ بڑے اور زندہ رہنے والے تخلیقی ادب کی سطح سے پست رہتا ہے۔''

آزادی کے بعد جن مزاح نگاروں نے اس فن کو نکھارا، سنوارا ان میں مشتاق احمد یوسفی، احمد جمال پاشا، یوسف ناظم، کنہیا لال کپور، فکر تونسوی، مشفق خواجہ اور مجتبیٰ حسین وغیرہ کے نام اہم ہیں۔ انجم عثمانی اور نصرت ظہیر نے ماضی قریب تک اس میں اضافے کیے فی الحال اردو میں ابن کنول، اسد رضا اور زاہد علی خان اثر جیسے کئی انشائیہ نگار مسلسل لکھ رہے ہیں۔

'رنگ رنگ کے شاعر' نامی اس کتاب کے تخلیق کار ساجد جلال پوری نئی نسل کے ایک ابھرتے ہوئے قلم کار ہیں۔ اس کتاب میں انھوں نے شعرائے کرام کی مختلف اقسام پر مبنی پچیس انشائیے لکھے ہیں۔ ان شعرا کی تفصیل کچھ اس طرح سے ہے۔ استاد الشعرا، شاعرِ غزل، اشتہاری شاعر، درباری شاعر، خیالی شاعر، خاندانی شاعر، تجارتی شاعر، سیاسی شاعر، بلند پرواز شاعر، شاعر زلف دراز، شاعر شراب، شاعر کباب، شاعر نصاب، خوش خوراک شاعر، خوش پوشاک شاعر، شاعر احساس کمتری، شاعر احساس برتری، شاعر ترنم، شاعر بلا معاوضہ، مقتول شاعر، صاحب زبان شاعر، شاعر خود نوشت، شاعر تخلص، شاعر اکھاڑہ، صدر شاعر اور ماہرین غالب وغیرہ، ساجد جلال پوری سے پہلے سید احمد شاہ بخاری (پطرس بخاری) نے اپنے ایک انشائیہ ''لاہور کا جغرافیہ'' میں طلبا کی ایسی ہی کئی اقسام بتلائی ہیں۔ جیسے جمالی، جلالی، خیالی اور خالی۔

شعرائے کرام کو اپنے انشائیوں کا موضوع بنانے کی وجہ بتاتے ہوئے ساجد جلال پوری نے ایک جگہ لکھا ہے'' آج تک شعرا نے دوسروں پر طنز کیے ہیں۔ دوسروں کے ذریعے دوسروں کو ہنسایا ہے۔ لیکن خود اپنے آپ پر طنز کر کے اپنے کو اور غیروں کو ہنسانا گویا ایسا شغل ہے جیسے کسی سرکس کا جوکر اپنے کرتب و کرامات سے دوسروں کو ہنسا کر خود بھی ہنسے۔''

ساجد جلال پوری پچھلے بارہ برسوں سے درس و تدریس کے فرائض کی انجام دہی کے ساتھ ساتھ طنز و مزاح کے گیسو سنوار رہے ہیں؛ جس کا ایک ثبوت ان کے انشائیوں پر مشتمل یہ کتاب ہے۔ اس کا انتساب مرزا اسد اللہ خاں غالب، مشتاق احمد یوسفی اور مجتبیٰ حسین کے نام ہے۔ جبکہ ساجد جلال پوری کی انشائیہ نگاری پر پروفیسر شارب ردولوی [سید مسیب عباس]، پروفیسر علی احمد فاطمی، زاہد جعفری، پروفیسر عباس رضا نیر جلالپوری اور ڈاکٹر ذیشان حیدر وغیرہ نے بھی اظہار خیال کیا ہے، جو کتاب میں شامل ہے۔

کتاب کے مطالعہ کے دوران مجھے بہت سے ایسے جملے نظر آئے، جنھیں پڑھ کر مشتاق احمد یوسفی کی یاد تازہ ہوگئی۔ محض مثال کے طور پر یہاں چند جملے پیش کیے جاتے ہیں:

1 استاد بننے کا مطلب دوسروں کے گناہوں کا بوجھ اپنے سر پر ڈھونا ہے۔
2 ایسے استاد بھی کثرت سے ملتے ہیں، جن کو شاگرد پالنے کا اتنا ہی شوق ہے، جتنا مسلمانوں کو مرغی پالنے کا۔
3 غزل اگر نوجوانوں کے لیے روح افزا ہے تو بزرگوں کے لیے کسی ٹانک سے کم نہیں۔
4 اشتہاری شاعر کو اشتہار میں نام درج کروانے کی اتنی بری عادت لگ گئی ہے کہ جیسے بعض نوجوانوں کو نشہ آور ادویات کی۔
5 اشتہار سے مشاعرے اسی طرح پھنستے ہیں، جیسے ندیوں، تالابوں میں جال لگانے سے مچھلیاں۔

اس کتاب میں شامل مختلف شعرا کے اشعار اور پیروڈیاں تحریر میں بالکل اسی طرح پیوست ہیں، جیسے انگوٹھی میں نگینہ پیوست ہو کر انگوٹھی کے حسن کو دو چند کر دیتا ہے۔

طنز و مزاح کے عمومی طور پر پانچ فنی حربے پائے جاتے ہیں۔ جنھیں ہم موازنہ (Comparison)، زبان و بیان کی بازی گری، مزاحیہ صورتِ واقعہ (Humorous Situation)، مزاحیہ کردار (Humorous Character) اور پیروڈی یا تحریف وغیرہ

کے نام سے جانتے ہیں۔ان حربوں میں سے ساجد جلال پوری کے یہاں زبان و بیان کی بازی گری کثرت سے پائی جاتی ہے۔ جیسے پالن، سالن، چھاجاتے ہیں، پاجاتے ہیں، سبکدوش، سبک اسٹیج مفلس مخلص، اصلی، نسلی، صیاد، جلاد، پختہ، ریختہ، محترم، معظم، شریف، نظیف، شرافت، شرارت، لطافت، نزاکت، بالغ، نابالغ، جوان، کسان، عوام، غلام، ضعیف، عفیف، نحیف، ظریف، لیاقت، نزاکت، منصب، مکتب، مشغولیات، مصروفیات، ترنم، تکلم، تبسم، قامت، ضخامت، جسامت، قدامت، عشرت، عسرت، تنگ دستی، بالا دستی، سینہ، کینہ، خزینہ، قطعات، رباعیات، لغویات، ہجویات، فضولیات، کلیات، گورکن، کان کن، ججمانی، منمانی، کابل، قابل، نس بندی، نوٹ بندی وغیرہ کی طرح بے شمار الفاظ اس کتاب میں بھرے پڑے ہیں۔ یاد رہے کہ ساجد جلال پوری اس مجموعے میں ہمیں زبان وبیان کی بازی گری کی کئی کئی مثالیں مل جاتی ہے، لیکن مزاحیہ صورتِ واقعہ اور موازنہ کی مثالیں خال خال ہی نظر آتی ہیں۔ خیر جو بھی ہو یہ مصنف کی باضابطہ پہلی کوشش ہے، اس لیے مستقبل میں ان سے مزید اچھی توقعات وابستہ کی جاسکتی ہیں۔

سوانح/شخصیات

محب اردو حمید انور اور بک امپوریم (مطالعات ومشاہدات)

مولف: ڈاکٹر محمد ممتاز فرخ

ضخامت: 336، قیمت: 350 روپے، سنہ اشاعت: 2022

ناشر: بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ

مبصر: ثناءاللہ دوگھروی

معرفت بک امپوریم، اردو بازار، سبزی باغ، پٹنہ۔ 800004 (بہار)

دنیا میں ہمیشہ کچھ شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جو اپنے کارہائے نمایاں یا اپنے دیگر اوصاف کے سبب لوگوں کے دلوں میں جگہ بنالیتی ہیں، ایسی ہی شخصیتوں میں محبّ اردو حمید انور کا نام بھی لیا جائے گا۔ حمید انور ادیب تھے لیکن بہترین ادبی ذوق اور خوبصورت کردار کے مالک تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں شہر عظیم آباد میں مختلف ادبی اور تاریخی حوالے موجود ہیں ان ہی میں ایک اہم تاریخی، تہذیبی اور ادبی حوالہ سبزی باغ میں کتاب کی ایک چھوٹی سی دکان 'بک امپوریم' بھی ہے، جو اپنی افادیت کی خوشبو دور تک بکھیر رہی ہے اور تشنگان علم وفن آج بھی یہاں سے اپنی پیاس بجھارہے ہیں۔ آج حمید انور اس دنیا میں نہیں ہیں لیکن ان کا قائم کیا ہوا یہ سلسلہ آج بھی جاری وساری ہے۔ حمید انور نے اپنی جو الگ شناخت بنائی اور اپنی کتاب کی دکان بک امپوریم کو شہرت کی بلندیوں پر پہنچادیا تو اس کا سبب ان ادبی ذوق اور بلند اخلاق ہی تھا۔ حمید انور اور بک امپوریم دونوں میں لازم وملزوم کی سی حیثیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے دانشوران ادب حمید اور بک امپوریم کی اہمیت وافادیت کے حوالے سے اپنے قلم کو حرکت دینے پر مجبور ہوگئے اور ان دونوں پر کثیر تعداد میں مضامین اور تاثرات اخبارات ورسائل میں شائع ہوئے۔

پیش نظر کتاب حمید انور کے بڑے صاحبزادے ڈاکٹر محمد ممتاز فرخ کی تالیف ہے جس میں موصوف نے حمید انور اور بک امپوریم کے حوالے سے دانشوران اردو کے تحریر کیے گئے مضامین، تاثرات ومکتوبات وغیرہ جو ادھر ادھر منتشر تھے، کو بڑی جانفشانی سے جمع کرکے انھیں بہترین انداز میں ترتیب دینے کی کوشش کی ہے۔ سرورق پر بک امپوریم اور حمید انور کی تصویر کتاب کی اہمیت کو روشن کرتی ہے۔ کتاب کے فلیپ پر پہلے معروف تنقید نگار، شاعر وصحافی ڈاکٹر عطا عابدی کی تحریر موجود ہے، فلیپ پر دوسری جانب ڈاکٹر محمد ممتاز فرخ کا تعارف ہے اور کتاب کی پشت پر حقانی القاسمی کی تحریر ہے۔ کتاب کی ابتدا میں 'عرض مرتب' کے نام سے ڈاکٹر محمد ممتاز فرخ صاحب کا مضمون ہے، جس میں انھوں نے اپنے والد حمید انور کے تعلق سے تفصیلی گفتگو کی ہے جس میں انھوں نے ان کی تعلیم وتربیت، ملازمت کے تعلق سے جدوجہد، ان کے اخلاق، عادات واطوار، ان کی نشست وبرخاست، ان کا ادبی ذوق نیز صبح بیدار ہونے سے رات کے سونے تک کا خاکہ دلکش انداز میں کھینچ دیا ہے جس سے حمید انور مرحوم کے متعلق عام قاری کو بہت کچھ معلومات حاصل ہوجاتی ہیں۔ اس کے بعد شکیل استھانوی کے قلم سے 'توقیت حمید انور' ہے جس میں حمید انور اور ان کے کنبے کا مختصر تعارف پیش کیا گیا ہے۔ کتاب کو سات ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے جس میں پہلا باب مشاہیر ادب کے کل 43 مضامین وتاثرات پر مشتمل ہے اس کے بعد مکتوبات، علقمہ شبلی کے قلم سے تاریخ قطعات اور پروفیسر راشد طراز کے قلم سے خراج عقیدت ہے، اس کے بعد ڈائری کے منتخب حصے، متفرقات اور اخیر میں ایک مکمل باب تصاویر پر مبنی ہے، جس میں کل 72 تصاویر ہیں۔ ہر باب کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ مضامین وتاثرات، مکتوبات اور تصاویر پر مبنی ابواب کتاب کی جان ہیں۔

پہلے باب میں حمید انور اور بک امپوریم کے حوالے سے اتنی تعداد میں مضامین ہیں کہ شاید ہی کوئی گوشہ تشنہ رہ گیا ہو۔ ان مضمون نگاروں میں اردو ادب کے بڑے بڑے نام شامل ہیں۔

کتاب میں مضامین کے بعد حمید انور کے نام آئے مشاہیر کے مکتوبات کا باب ہے جس سے نہ صرف پیشہ ورانہ روابط کا اظہار ہوتا ہے بلکہ اس وقت کے ادبا، شعرا اور دانشوران اردو ادب سے ان کے گہرے مراسم اور دلی لگاؤ اور حمید انور کی قدر ومنزلت کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے، ساتھ ہی یہ مکتوبات حمید انور کے ادبی ذوق، ان کی خوش خلقی، خوش مزاجی اور شرافت کے روشن حوالے ہیں۔ ان چیزوں کے علاوہ بھی ان مکتوبات کی ادبی اہمیت سے کسی صورت انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ اپنے اندر ادبی خزانے سمیٹے ہوئے ہیں۔ ان مکتوبات سے اردو کے طلبا کی معلومات میں بہت کچھ اضافہ ہوسکتا ہے۔

آخر میں الگ سے ایک باب ان تصاویر پر مبنی ہے جن میں کئی بڑے بڑے شعر، ادبا، صحافی اور ناقدین ادب کی حمید انور کے ساتھ تصاویر ہیں جو بک امپوریم پر ان لوگوں کے خوشگوار لمحات کے ساتھ ساتھ ان کے آپسی روابط اور خلوص پر مبنی رشتے کی گواہ ہیں۔ ہر تصویر اپنے اندر ایک مکمل کہانی رکھتی ہے۔ اس طرح ڈاکٹر محمد ممتاز فرخ صاحب نے اس کتاب کو کافی نظم وضبط کے ساتھ ترتیب دے کر اسے حد درجہ کارآمد بنانے کی کوشش کی ہے اور اس میں وہ کامیاب بھی نظر آتے ہیں۔

ہمیں یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ مجموعی طور سے یہ کتاب حمید انور اور بک امپوریم کے حوالے سے گراں قدر معلومات پر مشتمل ہے۔ اردو والوں کو اس کتاب کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے اور حمید انور مرحوم کی زندگی سے سبق ضرور لینا چاہیے۔ کتاب کے مؤلف ڈاکٹر محمد ممتاز فرخ کی اس کوشش کو سراہا جانا چاہیے کیونکہ حقانی القاسمی صاحب کے لفظوں میں ''ڈاکٹر ممتاز فرخ نے پوری اردو دنیا کی طرف سے فرض کفایہ ادا کیا ہے، جس کے لیے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔''

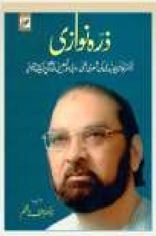

ذرّہ نوازی

مرتب: ڈاکٹر الف ناظم

صفحات: 528، قیمت: 300 روپے

ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی

مبصر: ڈاکٹر فرقان سردھنوی، محلّہ بوڑھا بابو سردھنہ، میرٹھ

زیرِ تبصرہ کتاب 'ذرہ نوازی' ڈاکٹر نواز دیوبندی کی شعری، علمی، ادبی اور تعلیمی خدمات

پر ایک بھر پور دستاویز ہے۔ جس کو گورنمنٹ ڈگری کالج رامپور میں اسسٹنٹ پروفیسر اردو ڈاکٹر الف ناظم صاحب نے ترتیب دی ہے۔ اس کتاب میں ہندوستان و پاکستان کے علاوہ دیگر ممالک کے مشہور و معروف ادبا و شعرا کے 100 مضامین شامل ہیں۔ جن میں ڈاکٹر نواز دیوبندی صاحب کی شاعری، شخصیت، علمی اور ادبی خدمات پر بہت ہی خوبصورتی کے ساتھ بھرپور طریقے سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی سے شائع اس مجموعہ کا کور پیج بہت ہی پرکشش ہے۔ اور اس کتاب میں شامل تمام مضامین بہت ہی معیاری اور معلوماتی ہیں۔ اس ضمن میں کتاب کے مرتب ڈاکٹر الف ناظم صاحب اپنے پیش لفظ بعنوان عرضِ مرتب میں یوں رقم طراز ہیں:

''نواز صاحب کی شخصیت اور علمی خدمات پر دنیائے علم و ادب کے مایہ ناز قلمکاروں نے بھرپور روشنی ڈالی ہے اور اس طرح سخن نوازی اور شخصیت شناسی کا حق ادا کیا ہے۔ جس سے نواز صاحب کی دلنواز شخصیت کے مختلف پہلو اپنی تمام تر جلوہ سامانیوں کے ساتھ ادب کے افق پر مرتسم ہیں۔''

ڈاکٹر الف ناظم صاحب نے اس کتاب کو ترتیب دینے میں اپنی صلاحیت کا بھرپور استعمال کیا ہے۔ جس کا اندازہ کتاب میں شامل مضامین کی فہرست سے بخوبی ہو جاتا ہے۔ اس کتاب میں روایت سے ہٹ کر کچھ چیزیں شامل کی گئی ہیں جو کتاب کی اہمیت کو اور بھی زیادہ بڑھا دیتی ہیں۔ مثلاً اس کتاب میں پہلا باب 'عطردان' کے نام سے شامل کیا گیا ہے۔ جس میں ڈاکٹر نواز دیوبندی صاحب کے فن اور شخصیت پر مشاہیر کی مختصر ترین رائے شامل کی گئی ہیں۔ بعد ازاں کتاب کے مرتب ڈاکٹر الف ناظم صاحب نے مختصر اور جامع پیش لفظ بعنوان عرضِ مرتب لکھا ہے۔ پیش لفظ کے بعد ڈاکٹر نواز دیوبندی کا مضمون 'بھیگے ہوئے پروں سے... ' اس مضمون میں ڈاکٹر صاحب نے اپنی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ جس میں ابتدائی تعلیم سے لے کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں اپنی شاعری کی ابتدا اور شاعری کے ذریعہ دنیائے شعر و ادب میں ملی شہرتوں کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔ مضامین کے بعد چار انٹرویو شامل کیے گئے ہیں جن میں پہلا انٹرویو احمد معراج کولکاتہ کا 'ایک ملاقات' کے عنوان سے ہے۔ دوسرا انٹرویو ڈاکٹر الف ناظم کا 'کہ گم اس میں ہیں آفاق' کے عنوان سے، تیسرا انٹرویو ڈاکٹر امام اعظم، کولکاتا کا 'گفتگو' کے عنوان سے ہے اور چوتھا انٹرویو گلزار جاوید راولپنڈی کا ہے جو 'پوچھتے ہیں وہ' کے عنوان سے شامل ہے۔ ان تمام انٹرویو میں ڈاکٹر نواز دیوبندی صاحب سے ان کی شخصیت، ان کی تعلیمی، ادبی اور سماجی خدمات کے تعلق سے سوالات کیے گئے ہیں اور ان تمام سوالات کا جواب ڈاکٹر نواز دیوبندی صاحب نے سوالوں کے عین مطابق دیے ہیں۔ کتاب کے آخر میں ڈاکٹر نواز دیوبندی کا منتخب کلام شامل کیا گیا ہے۔ جس میں ان کا مطبوعہ اور غیر مطبوعہ دونوں کلام شامل ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ منتخب کلام کو صنفِ شاعری کے اعتبار سے 6 حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جن کے پہلے حصے میں منتخب نعتیں، دوسرے حصے میں منتخب اشعار، تیسرے حصے میں منتخب قطعات، چوتھے حصے میں منتخب بچوں کی نظمیں، پانچویں حصے میں منتخب نظمیں اور چھٹے حصے میں منتخب غزلیات کو شامل کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر الف ناظم صاحب نے مضامین کو بہت طریقے اور سلیقے سے ترتیب دیا ہے۔ وہ اپنے پیش لفظ عرضِ مرتب میں ڈاکٹر نواز دیوبندی صاحب کے تعلق سے لکھتے ہیں کہ ''عصر حاضر کے مقبول ترین شاعر اور ہر دل عزیز انسان ڈاکٹر نواز دیوبندی ایک ایسی شخصیت کے مالک ہیں جو مشاعرے کے حوالے سے بین الاقوامی شہرت و مقبولیت رکھنے کے ساتھ ساتھ اپنے مزاج کی سادگی، حق گوئی و بے باکی، قوم و ملت کے تئیں فکر مندی، نونہالانِ ملت بالخصوص تعلیم نسواں کے نقیب کی حیثیت سے اپنی منفرد شناخت رکھتے ہیں۔ اور شاعری کی تاریخ میں ایسی شخصیتیں نایاب ہیں جن کی شاعری اور شخصیت میں یکسانیت و مماثلت پائی جاتی ہو۔''

میں ڈاکٹر الف ناظم صاحب کو 'ذرّہ نوازی' کی اشاعت پر مبارک باد پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ قارئین کتاب کے مطالعے سے ڈاکٹر نواز دیوبندی کی شاعری اور شخصیت سے محظوظ ہوں گے۔

مکاتیب

مظفر حنفی (فن، شخصیت اور خطوط)

مصنف/ ناشر: شکیل اعجاز

صفحات: 128 قیمت: 200 روپے

مبصر: فصیح اللہ نقیب، نور نگر، اکوٹ فیل، اکولہ 444001 (مہاراشٹر)

ہمارا معاشرہ جب سے موبائل زدہ ہو گیا خطوط نگاری کا فن ڈوب گیا۔ جبکہ شعرا اور ادبا کے خطوط ان کی ذاتی زندگی، ان کے مزاج، ان کے روز مرہ حالات اور معاشرہ کے تئیں ان کے رویہ کا رنگا رنگ اور سچا عکس پیش کرتے تھے۔ ان خطوط سے نہ صرف شعرا و ادبا کی نجی زندگی کے کئی پہلو سامنے آتے بلکہ اس دور کے شعر و ادب کا رجحان، ادبی سرگرمیاں، مجادلے، مباحث، ذاتی اور ادبی چشمکیں صفحہ قرطاس پر اتر آتیں۔ آنے والی نسل کے فنکاروں کے لیے اس میں تربیت و ترغیب کا وافر مواد ہوا کرتا تھا۔

ڈاکٹر مظفر حنفی بیسویں صدی کی آخری تین اور اکیسویں صدی کی اولین دو دہائیوں میں اردو شعر و نقد کا ایک بڑا نام ہے۔ اپنے نام حنفی صاحب کے چوالیس اور غنی اعجاز مرحوم کے نام ایک خط شکیل اعجاز نے مرتب کر کے نیز حنفی صاحب کی شخصیت اور فن پر چھ مضامین یکجا کر کے 'مظفر حنفی۔ فن، شخصیت اور خطوط' کے عنوان سے ایک مختصر مگر اہم کتاب تصنیف کی ہے۔

تمام خطوط نجی نوعیت کے ہیں جن میں حنفی صاحب شکیل اعجاز کے فن مصوری کی ستائش کرتے ہوئے اور ان کی مزاح نگاری میں بہتر امکانات کی پیشن گوئی کرتے نظر آتے ہیں۔

اس سے قبل ڈاکٹر محبوب راہی کے نام خطوط پر مشتمل کتاب 'مکتوباتِ مظفر حنفی بنام محبوب راہی' کے نام سے شائع ہو چکی تھی۔ شکیل اعجاز نے راہی صاحب کی اجازت سے اس کتاب سے استفادہ کرتے ہوئے 'خط خاکہ' کے عنوان سے حنفی صاحب کی شخصیت کا خاکہ بنانے کی سعیٔ مشکور کی ہے اس میں نہ صرف یہ کہ وہ مظفر حنفی کا خاکہ بلکہ ڈاکٹر محبوب راہی کا خاکہ اجاگر کرنے میں بھی کامیاب نظر آتے ہیں۔ راہی صاحب کے نام خطوط میں کئی ادبی انجمنوں، مشاعرہ بازی کے جھمیلوں، کتابوں کی اشاعت کے لیے مختلف امدادی اداروں کے رویے، ادبی انعامات میں سیاست کا عمل دخل نیز راہی صاحب کی شاعری پر تنقید، مشورے، اصلاحی اشارے ایک شفیق سینئر فنکار کے مشفقانہ نصائح نظر آتے ہیں۔ ویسے یہ تمام مشورے اور نصائح تمام نئے کہنے والوں کے لیے بھی سبق آموز ہیں۔

حنفی صاحب اکثر اپنے مقطعوں میں اپنے مزاج شعر پر، شعری رجحانات پر، ناقدینِ فن پر اظہار خیال فرماتے تھے۔ ایک مضمون میں ان کے مقطعوں کے ذریعہ ان کے کج شاعری کو، ان کے نظریہ شعر کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ شکیل اعجاز نے مضمون 'ایک در بچہ مظفر شناسی کا' کی خوبصورت تلخیص پیش کر کے ایک طویل مضمون سے عطر کشید کیا ہے۔

'طوفان طوفان، مظفر حنفی' میں آکولہ میں حنفی صاحب کی صدارتی غزل سے مضمون کا آغاز کیا گیا۔ پھر حنفی گھرانے کی پندرہ روزہ مہمان نوازی کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

جب وہ حنفی صاحب کی چند کتب کے ٹائٹل اور ادب اطفال کی دو ایک کتابوں کے لیے اندرونی اسکیچیز بنانے کے لیے دلی گئے تھے۔ وہاں انھیں حنفی صاحب کے دیگر افرادِ خانہ سے ملنے جلنے، ان کے گھر کے رکھ رکھاؤ اور ان کی مہمان نوازی سے (خصوصی طور پر حنفی صاحب کی اہلیہ محترمہ کی ممتا بھری نوازش سے) لطف اندوز ہونے کا موقع ملا۔ اسی مضمون میں راہی صاحب کے مقالے کے حوالے سے حنفی صاحب کے بچپن کو، ہم جماعت دوستوں کے ساتھ ان کے رویے، شرارتوں اور کتب بینی کے شوق وغیرہ کے ساتھ، خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ مضمون میں کھنڈوہ کی ادبی سرگرمیوں اور حنفی صاحب کے سفرنامے 'چل چنبیلی باغ میں' سے کئی دلچسپ اقتباسات نقل کر کے اس میں اپنی حس مزاح کا نمک لگا کر لذیذ تر کر دیا گیا ہے۔

'روح غزل' حنفی صاحب کے مرتب کردہ غزل کے عالمی انتخاب کا نام ہے۔ جس پر شکیل اعجاز نے اسی عنوان سے تبصرہ کیا ہے جو شروع اس طرح ہوتا ہے۔ ''گھر میں داخل ہوا تو مجھے بتایا گیا کہ مظفر حنفی صاحب کے ہاں سے روح غزل آئی ہے۔ ہم سمجھے ان کے کالج کی کوئی طالبہ ہوگی... '' اندازہ لگا سکتے ہیں کہ آگے کیا کچھ ہوگا۔

'بول میری مینا' حنفی صاحب کی ادب اطفال پر شعری کلیات ہے۔ مظفر حنفی جس طرح جدید غزل کا ایک منفرد نام ہے۔ اسی طرح وہ ادب اطفال میں بھی ہر عمر کے بچوں کے لیے ان کی استعداد ولیاقت کے مطابق الفاظ کے انتخاب اور زبان و بیان کی نزاکتوں کا پیمانہ کم زیادہ کرتے ہیں اور اُن تک ترسیل میں صدفی صد کامیاب ہوتے ہیں۔

ہر چند کہ خطوط شکیل اعجاز کے لیے نجی ہیں۔ مگر ان میں ایسے چمکتے جملے ہیں جن سے ہر کوئی محظوظ ہو سکتا ہے مثلاً... یہ جان کر واقعی مسرت ہوئی کہ تم نے کرشن چندر پر Ph.D. کے لیے رجسٹریشن کرا لیا ہے۔ موضوع بہت اچھا ہے۔ تمھاری صلاحیت کے پیش نظر توقع ہے کہ کام خاطر خواہ ہو جائے گا... بلٹز میں تمہاری تیار کردہ چند تصاویر دیکھیں اور خوش ہوا۔ انشاء اللہ تم بہت آگے جاؤ گے۔ تمھاری طبیعت کا انکسار اور مزاج کی لگن بڑے امکانات کی نشاندہی کرتے ہیں... اس خوبصورت اور حسین منظر کے لیے جو تم نے میری نذر کیا ہے۔ بہت بہت شکریہ قبول کرو... تمہارے خط کا ابتدائی حصہ ایک لفظی پینٹنگ ہے جس کے حسن سے محظوظ تو ہو سکتا ہوں لیکن خود تصویریں نہیں بنا سکتا... میرا خط جب تک تمھیں ملے گا تم اپنی بائیں پسلی کی تلاش میں کامیاب ہو چکے ہو گے بہت بہت مبارک ہو۔ اپنی شریک سفر حیات کو بھی ہماری طرف سے مبارکباد پیش کرو کہ انھیں شکیل اعجاز جیسا پیارا نصف کمتر ملا ہے۔ اسکیچیز مل گئے۔ مجھے تو تمھارے موئے قلم سے محبت ہے ہی جامعہ کے شاہد بھائی نے بھی انھیں بہت پسند کیا... امید ہے بیسویں صدی میں ہمارے مشاعرے اور طنز و مزاح سمینار والی تصویر نظر سے گزری ہوگی... مشاعرہ والی بحث میں سنجیدہ ارباب ادب کو حق بیانی کے ساتھ شرکت کے لیے آمادہ کرو۔ اچھا موقع ہے۔ اس موضوع پر ہندوستان گیر سطح پر غور و فکر ہونا چاہیے۔ شاید مشاعروں کا ابتذال کچھ اعتدال پر آ جائے۔

آخری بات کتاب کے ٹائٹل کی کروں کہ یہ تو شکیل اعجاز کا میدان خاص ہے۔ اس کتاب کے ٹائٹل پر ایک ہلکے نیلے لفافے کا فوٹو ہے جس پر مظفر حنفی صاحب کی ہینڈ رائٹنگ میں شکیل اعجاز کا پتہ انگریزی میں درج ہے۔ لفافے کے کونے پر حنفی صاحب کے بہت خوبصورت پورٹریٹ کو پوسٹل ٹکٹ کا روپ دیا گیا ہے۔ ٹکٹ کے پورٹریٹ پر بھی شکیل اعجاز کے دستخط ہیں۔ کتاب پر مصنف کا نام ان کی کیلی گرافی کا نمونہ ہے۔ ٹائٹل کلاسک لگتا ہے۔

الغرض شکیل اعجاز اپنے نام سے موصول مظفر حنفی کے نجی خطوط اور کتاب میں شامل مضامین کے ذریعہ ان کے فن اور شخصیت کا عمدہ خاکہ بنانے میں کامیاب ہیں۔

فکشن

خاموش لب

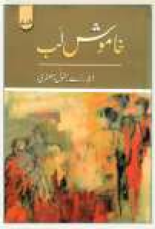

مصنف: ایم، اے، کنول جعفری

صفحات: 184، قیمت: 150 روپے، سنہ اشاعت: 2021

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی 110002

مبصر: ڈاکٹر شیخ نگینوی

راقم منزل، چھنگا والا چوک، نگینہ 246762 (یوپی)

مغربی اتر پردیش کا ضلع بجنور اردو فکشن نگاری کا اہم محور و مرکز رہا ہے۔ بابائے ناول ڈپٹی نذیر احمد، اولین افسانہ نگار سجاد حیدر یلدرم، پہلے سائنسی ناول نگار اظہار اثر کرتپوری، عثمان اطہر پرویز، کوثر چاند پوری، رفعت سروش، عشرت کرتپوری، نور بجنوری، فرقان صدیقی، قاسم صدیقی، سالک دھام پوری، نذر سجاد، صدیقہ بیگم سیوہاروی، قرۃ العین حیدر، شفیق بانو، پنہاں انصاری، شہناز کنول، ثروت ذکی، ڈاکٹر ذکاء الرب رباب، نعیم کوثر، نصرت مہدی، شمع افروز زیدی، صائمہ ذوالنور، رخشندہ روحی، ڈاکٹر مناظر احسن، سراج الدین ندوی، ایم اسلم صدیقی، تہذیب ابرار، فخر الدین فخر، محمد احمد دانش کا تعلق ضلع بجنور سے ہے اور اسی سرزمین کے فرزند محبوب احمد ہیں جو ادبی حلقوں میں ایم اے کنول جعفری کے نام سے اپنی شناخت رکھتے ہیں جن کا 'چاک کا بوسیدہ ٹکڑا' کے بعد دوسرا افسانوی مجموعہ 'خاموش لب' حال ہی میں منظر عام پر آیا ہے۔

184 صفحات پر مشتمل اس مجموعے میں 16 کہانیاں ہیں۔ دیدہ زیب کور اور عمدہ کاغذ و چھپائی سے مزین اس مجموعے کی ابتدا ڈاکٹر محمد مستمر کے مضمون 'انسانیت کا متلاشی افسانہ نگار ایم اے کنول جعفری' کے عنوان سے ہوتی ہے۔ جنھوں نے کنول جعفری اور ان کی ادبی کاوشوں پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے ''کنول جعفری کا ارتکاز، مطمح نظر یا فوکس، انسانیت پر رہتا ہے۔ وہ جس موضوع پر افسانہ بنتے ہیں ان کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ انسانیت زندہ رہے۔ وہ زندگی کے ہر موڑ اور زاویے میں انسانیت کو تلاش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ اپنے افسانے کا آغاز، ارتقا اور پھر انجام ایسے نقطۂ عروج پر مرتکز کرتے ہیں جسے انسانیت کی معراج کہا جاتا ہے۔ وہ اپنے افسانوں کے توسل سے انسانوں کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ دنیا میں انسانیت سے بڑھ کر کوئی مذہب نہیں۔''

تقریباً دو دہائیوں سے ہندوستان اور سرحد پار کے مؤقر اخبار و رسائل میں متواتر شائع ہونے والے ایم اے کنول جعفری کے افسانے ضلع بجنور میں ہی گھومتے ہیں اور یہاں کے سماجی، سیاسی اور موجودہ حالات کے اردگرد رہتے ہیں۔ گرتی ہوئی قدریں، تقسیم ہوتے خاندان، فرقہ پرستی، تنگ دستی، نوجوانوں میں بے راہ روی، تعصب، منافرت، بدعنوانی، سماجی اور انسانی رشتوں کے زوال کو کنول جعفری نے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ جو آج کل ہر علاقے کی کہانی اور المیہ ہے۔

'خاموش لب' کی تمام کہانیاں اکیسویں صدی میں لکھی گئی ہیں اور اس صدی کے مسائل، مشاہدات و تجربات کو کہانیوں میں شامل کیا گیا ہے۔ کنول جعفری نے اپنی کہانیوں کو بیانیہ کے سہارے آگے بڑھایا ہے اور اس میں پلاٹ اور کردار کو مضبوطی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

کنول جعفری نے 'خاموش لب' کی پہلی کہانی 'برادری کی دعوت' میں سماج اور برادری میں رائج بے جا رسومات اور طے شدہ فارمولوں کو موضوع بنایا ہے۔ جبکہ 'تسکین کے چند لمحات'، 'سفید خون' اور 'پتھر کے آنسو' کہانیوں میں ہندو مسلم بھائی چارے، گنگا جمنی تہذیب کو، نفرتوں، ہندو مسلم کے نام پر فرقہ پرستی اور سیاست دانوں کے ذریعے اپنے مفاد کے لیے

سماج میں زہر گھولنے کو الفاظ سے تراش کر کہانی پیش کی ہے۔

کہانی 'خاموش لب' جو کتاب کا عنوان ہے میں کنول جعفری نے بزرگ ماں باپ کی کہانی پیش کی ہے۔ جنھیں ان کے بیٹے بوجھ سمجھتے ہیں۔ 'کباڑ خانہ' میں وہ آج کے کلچر اور قدروں کے انحطاط و تنزل کی طرف توجہ مبذول کراتے ہیں۔ 'پربھوداسی'، 'بے نور آنکھیں'، 'حویلی کی چڑیا'، 'گئو رکشک' وغیرہ کہانیوں کی تھیم انسانیت اور سماج میں پھیلی برائیاں ہیں۔ جو اس دور کا المیہ ہیں۔ لاکھ ترقی کے باوجود انسان آج بھی انسانیت سے دور ہے اور صرف صارف کے چشمہ سے دنیا کو دیکھ رہا ہے۔ خاموش لب کا آخری افسانہ 'کھانسی کا شربت' کووڈ کے زمانے کی کہانی ہے۔ جس میں ایک غریب مزدور کی حالت زار بیان کی گئی ہے۔ غریب مزدور کوڑے دان میں فاقہ کش بچوں کے لیے رزق تلاش کرتا ہے اور بیوی بھوکے بچوں کو کھانسی کا شربت پلا کر سلا دیتی ہے۔ یہاں بھی کنول جعفری انسانیت، ہمدردی، بھلائی کے جذبے کو زندہ رکھتے ہیں اور غریبوں کی مدد کے لیے ایک فرشتہ صفت شخص مل جاتا ہے۔

ایم اے کنول جعفری کی تمام کہانیاں تفریح اور وقت گزاری کا سامان نہیں ہے بلکہ ہر کہانی میں ایک سبق ہے انسانیت کو بچانے کا، اصلاح معاشرے کا، ٹوٹتے ہوئے رشتوں کو جوڑنے کا، گرتی ہوئی قدروں کو کھڑا کرنے کا۔ ایم اے کنول جعفری کے افسانوں کی زبان سہل اور سلیس ہے۔ طرز تحریر خاصا متاثر کن ہے۔ سبھی افسانے آج کے زمانے میں سماجی سطح پر پھیل رہی برائیوں کو اجاگر کرتے ہیں۔ ساتھ ہی اس کا حل اور اس برائی کو دور کرنے کی دوا بھی بتاتے ہیں۔ تمام افسانے اخلاقی یا اصلاحی پیغام لیے ہوئے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ یہ افسانوی مجموعہ تمام قارئین کو پسند آئے گا اور انسانی جذبے کو زندہ رکھتے ہوئے برائیوں کو دور کر کے ایک مثالی معاشرہ تیار کرنے میں بھی معاون ثابت ہوگا۔

شاعری

کاسۂ دل

شاعر: ڈاکٹر منصور خوشتر

صفحات: 352، قیمت: 400، سنہ اشاعت: 2022

ناشر: دربھنگہ ٹائمز پبلی کیشنز، شوکت علی ہاؤس، دربھنگہ 846004

مبصر: ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، حامد خالونی، محلّہ فیض اللہ خان دربھنگہ

اردو ادب کا منظر نامہ جن جواں سال تخلیق کاروں کی کہکشاں سے جگمگا رہا ہے ان میں سے ایک نام منصور خوشتر کا ہے۔ انھیں نثر اور شاعری دونوں سے گہری دلچسپی ہے۔ ان کے ادبی کارگزاریوں کا اندازہ ان کی تالیف و ترتیب شدہ کتابوں سے لگایا جا سکتا ہے۔ ان کی ادارت میں سہ ماہی 'دربھنگہ ٹائمز' دربھنگہ کی مسلسل اشاعت ہو رہی اور اس کے گراں قدر دستاویزی شمارے پسند کیے گئے ہیں۔ اولین شعری مجموعہ 'کچھ محفل خوباں کی' 2015 میں اشاعت کے تقریباً سات برس بعد دوسرا مجموعہ کلام 'کاسۂ دل' منظر عام پر آیا ہے۔ اس مجموعے میں غزلیں، نظمیں اور نظمیاتِ اطفال شامل ہیں۔

کاسۂ دل کی شاعری میں واردات قلبی اور صورت دنیا کی عکاسی موجود ہے۔ واردات قلبی کو لفظوں کا حسین پیکر عطا کرنے میں انھیں مہارت حاصل ہے۔ شاعر جذبۂ محبت کو زندگی کا منبع و مقصد تصور کرتا ہے۔

ان کے یہاں انسانی ہمدردی کا جذبہ جا بجا ملتا ہے۔ دراصل تخلیق کار کی یہی پونجی اسے امیر بناتی ہے۔

اک چراغ ان کے گھروں میں بھی جلاؤ بھائی   روشنی جن کے گھروں میں ہوئی مدت سے نہیں
دو سہارا انھیں اور ان کو بٹھاؤ بھائی   ہائے رستے میں جو تھک ہار کے ہیں بیٹھ گئے

منصور خوشتر کی شاعری میں سادگی اور سلاست پائی جاتی ہے۔ انگریزی اور ہندی کے عام فہم اور مروجہ الفاظ کا استعمال بھی کرتے ہیں، اس کے باوجود حسن میں کمی نہیں آتی۔ غزل کا روایتی انداز انہیں زیادہ پسند ہے۔ نظموں میں بھی طبع آزمائی کرتے ہیں لیکن غزل کی جانب ان کا خاص رجحان ہے۔ اس مجموعے میں شامل ماں، ماں کی ممتا، کورونا وائرس، کورونا وغیرہ نظمیں متاثر کرتی ہیں۔ شخصیات پہ مبنی نظموں میں اعتراف و اقرار اور عقیدت کا تاثر ابھرتا ہے۔

مجموعہ کے شروعاتی صفحات پر 'خوشتر: وادیٔ صحافت سے ایوان غزل تک' (پروفیسر طرزی)، 'کاسۂ دل: کلاسیکیت و جدیدیت کا حسین امتزاج' (شوکت محمود شوکت)، 'کاسۂ دل' (نعمان نظیر)، 'کاسۂ دل' (سرور غزالی جرمنی)، منصور خوشتر کی غزلیں۔ ایک جائزہ (ڈاکٹر محمد اشرف کمال)، 'کاسۂ دل': شعری معنویت کی دردناک چیخ (احمد سہیل) عنوانات سے اہل علم و نظر کی مشمولہ تحریریں (منظوم و منثور) اس مجموعہ کلام کے حسن اور پسندیدگی کے حوالے ہیں۔ احمد سہیل لکھتے ہیں:

"کاسۂ دل افراد کے موضوعی رنج و آلام، دکھ اور انسان کی لاچارگی کے احوال کی داستان ہے۔ شاعر نے خارجی کرب کو یوں بیان کیا ہے جیسے اس کی حرکیات اور سکونیات سے ہی اس کا وجود تشکیل پاتا ہے۔ اس مجموعہ کلام میں شامل تمام غزلیات عہد حاضر کے معاملات اور جبر کی منظر کشی ایک ایسے کینوس پر کرتی ہے، جس کے تمام رنگ انسان کے خون کے رنگ سے بنے ہیں۔"

کتاب کے خوبصورت سرورق پہ شعر معنویت سے بھرپور ہے۔

کون دولت مند ہے مجھ سے بڑا   کاسۂ دل میں اسی کا ہے جمال

پشت پہ ڈاکٹر شارب ردولوی، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، راشد انور راشد اور سمیں کرن کے تاثرات ان کی شاعری کی خوبیوں کو درشاتے ہیں۔ منصور خوشتر کی شاعری میں جو امکانات کا ایک ننھا پودا دکھائی دیا تھا اب وہ ایک سرسبز درخت کی شکل اختیار کرنے لگا ہے۔ ان سے بہت ساری عمدہ شاعری کی توقعات ہیں۔ امید ہے ان کا شعری سفر اسی رفتار سے آگے بڑھتا رہے گا۔

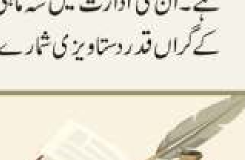

پہلی تخلیق پہلا تاثر

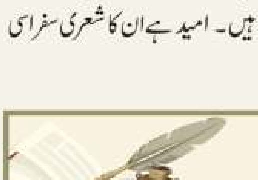

کسی بھی رسالے میں جب آپ کی تخلیق شائع ہوتی ہے تو آپ کو بے انتہا مسرت کے ساتھ ایک نئی تحریک بھی ملتی ہے۔ ماہنامہ 'اردو دنیا' میں جب آپ کی تخلیق پہلی بار شائع ہوئی تو آپ کو کیسا محسوس ہوا؟ آپ اپنے خیالات لکھ کر ہمیں بھیجیں اور یہ بھی ضرور لکھیں کہ آپ کی ذہنی اور تحریری تربیت میں ادبی رسائل کتنا اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ذرا سوچیے! اگر یہ رسالے نہ ہوتے تو...؟

ماہنامہ اردو دنیا کے کالم زبان اور زمینی صورت حال کے لیے سوال نامہ

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں مشاہیر ادب کے انٹرویوز شائع کیے جاتے تھے، یہ ایک مقبول کالم تھا۔ یہ کالم ہنوز جاری ہے۔ بس اس کی شکل وصورت ذرا سی تبدیل کر دی گئی ہے تاکہ اردو کے تعلق سے غیر ضروری مباحث کے بجائے قارئین اردو زبان کی حقیقی صورت حال سے آگاہ ہو سکیں۔

- زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟
- زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟
- زبان کا تہذیب وثقافت سے کیسا رشتہ ہے؟
- کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟
- کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟
- موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟
- اردو کا مستقبل کیا ہے؟
- زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جا سکتی ہیں؟
- کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟
- کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟
- آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کر رہے ہیں؟
- آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟
- اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کیا جا سکتی ہیں؟
- دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہو سکتی ہیں؟
- کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟
- آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟
- غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟
- ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جا سکتی ہے؟
- سینٹرل اسکولوں اور نوودے ودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں اسی سوالنامے کی روشنی میں ان لوگوں کے انٹرویوز شائع کیے جائیں گے جو اردو زبان وادب سے جڑے ہوئے ہیں اور اردو کی خدمت کا بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں مگر انھیں اپنے خیالات کے اظہار کا موقع نہیں ملتا۔ یہ سوالنامہ ہر اس فرد کے لیے ہے جو اردو کاز اور مشن سے جڑا ہوا ہے۔ اس سوالنامے کے ذریعے ہمیں اردو زبان کے تعلق سے حقیقی صورت حال کا علم ہوگا اور اسی کی روشنی میں فروغ اردو کے لیے ایک روڈ میپ تیار کیا جائے گا۔ اپنے جوابات کے ساتھ سوانحی کوائف مع تصویر درج ذیل ای میل آئی ڈی پر بھیجیں: ➢ editor@ncpul.in ➢ urduduniyancpul@yahoo.co.in

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

مولانا ابوالکلام آزاد کی وراثت کے موضوع پر خصوصی لکچر

نئی دہلی: آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد کے یوم پیدائش کی مناسبت سے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے صدر دفتر میں معروف دانشور محترمہ سیدہ سیدین حمید کے خصوصی لکچر کا اہتمام کیا گیا۔ اس موقعے پر تعارفی کلمات پیش کرتے ہوئے کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد نے مہمان مقرر کا استقبال کیا، ساتھ ہی مولانا آزاد کی شخصیت کے اہم پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ مولانا آزاد نے ہندوستان کے وزیر تعلیم کی حیثیت سے لائق تحسین خدمات انجام دیں۔

انھوں نے آزاد ہندوستان کے شاندار مستقبل کے لیے سائنس، ٹکنالوجی اور میڈیکل سائنس کی تعلیم کے بہترین ادارے قائم کرنے میں اپنی بے پناہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ تحریک آزادی کے دوران ان کی جدوجہد اور قربانیوں کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اس ملک کی آزادی میں جن عظیم رہنماؤں نے غیر معمولی کردار ادا کیا اور جن کے فکر و عمل نے ہندوستان سے انگریزی اقتدار کے خاتمے کو یقینی بنایا ان میں مولانا ابوالکلام آزاد کا نام نمایاں ہے۔ شیخ عقیل نے کہا کہ مولانا آزاد قومی یکجہتی اور بین المذاہب ہم آہنگی کے سب سے بڑے داعی تھے اور انھوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں جا بہ جا متحدہ قومیت اور اس مشترکہ وراثت کو موضوع و محور بنایا، جو ہندوستانی قوم کا ہزاروں سال کا قابل فخر سرمایہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ مولانا آزاد جیسی نابغۂ روزگار شخصیتیں صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں، وہ اپنے پیچھے قومی یکجہتی، اتحاد و اتفاق اور ملک کی تعمیر و ترقی کے تئیں جو نظریاتی نقوش چھوڑ گئے ہیں، ان پر عمل کر کے ہندوستان میں نہ صرف سماجی اتحاد کا بے مثال کارنامہ انجام دیا جا سکتا ہے، بلکہ اس طرح ہندوستان وشو گرو بھی بن سکتا ہے۔

محترمہ سیدہ سیدین حمید نے اپنے لکچر میں مولانا آزاد سے وابستہ دلچسپ یادیں تازہ کرتے ہوئے ان کی شخصیت اور زندگی کے مختلف علمی، فکری، سیاسی و سماجی پہلوؤں پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور کہا کہ مولانا آزاد ابتدائی عمر سے ہی قومی و ملی جدوجہد میں شرکت کرنے لگے تھے۔ انھوں نے کم عمری میں 'لسان الصدق' نامی اخبار جاری کیا، جس کے ذریعے قوم کو بیدار کرتے ہوئے اس وقت کے حالات میں ضروری طرزِ عمل اختیار کرنے کی دعوت دی، آگے چل کر انھوں نے یہی کام 'الہلال' اور 'البلاغ' جیسے مشہور اخباروں کے ذریعے کیا، جس کی گونج کلکتہ اور پھر پورے ملک میں سنی گئی جس کی وجہ سے اس وقت کی برطانوی حکومت نے انھیں شہر بدر کر کے رانچی میں نظر بند کر دیا۔ انھوں نے کہا کہ گاندھی جی سے ملنے کے بعد مولانا آزاد کی سیاسی سرگرمیوں میں تیزی آ گئی اور اپنے آپ کو انھوں نے قومی تحریکوں کے لیے وقف کر دیا۔ انھوں نے کہا کہ مولانا آزاد کی سیاسی فکر مشترکہ قومیت اور ہندو مسلم اتحاد پر قائم تھی اور ان کا ماننا تھا کہ تمام طبقات مل کر ہی نئے ہندوستان کی تعمیر و ترقی کا فریضہ انجام دے سکتی ہیں۔ انھوں نے مولانا کی اخلاقی و شخصی خصوصیات پر بھی خاص طور پر گفتگو کی اور اس حوالے سے ان کی مختلف خوب صورت تحریروں کے حوالے پیش کرتے ہوئے بتایا کہ مولانا آزاد کی ذات میں بہت غیر معمولی قسم کی انسانی و اخلاقی خوبیاں جمع ہو گئی تھیں۔ انھوں نے عصر حاضر میں مولانا آزاد کے افکار کی معنویت پر زور دیا اور کہا کہ آج ہم جس قسم کے تشویش انگیز حالات سے گزر رہے ہیں، ان میں خصوصاً مولانا کے افکار ہماری رہنمائی کرتے ہیں اور ان پر عمل کر کے ہم اپنی مشکلات پر قابو پا سکتے ہیں۔ پروفیسر شیخ عقیل احمد کے اظہارِ تشکر کے ساتھ مجلس اختتام پذیر ہوئی۔ اس موقعے پر کونسل کا تمام عملہ موجود رہا۔ پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 10 نومبر 2022

قومی اردو کونسل کے وفد کا دورۂ ناگالینڈ

ناگالینڈ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اہتمام اور مسلم کونسل دیماپور و اجمل فاؤنڈیشن کے اشتراک سے ناگالینڈ میں اہل علم و ادب کے ساتھ ناگالینڈ کی سماجی

تنظیموں، اسکولز، کالجز اور مدارس کے نمائندگان کے ساتھ ایک انٹرایکشن پروگرام کا انعقاد کیا گیا، جس میں اردو زبان کے فروغ کے تعلق سے کونسل کی اسکیموں کا تعارف کروایا گیا اور ناگالینڈ میں اردو کی تعلیم و ترقی کے امکانات پر گفتگو کی گئی۔ اس موقعے پر کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد نے مہمانوں اور شرکا کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ اردو ایک ایسی زبان ہے، جسے ہندوستان کے کونے کونے میں لوگ بولتے اور سمجھتے ہیں، اس

کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ مدارس و مساجد ملک کے ہر گوشے میں موجود ہیں، جن میں سے بیشتر کا ذریعہ تعلیم اردو ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو ہندوستان کی ایسی میٹھی اور خوب صورت زبان ہے جسے بول کر اور لکھ کر آپ اپنے مخاطب پر اچھا اثر ڈال سکتے ہیں۔ اردو میں دنیا کی مختلف زبانوں کے علاوہ ہندوستان کی بیشتر زبانوں کے الفاظ بھی بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں، اس لیے ہر زبان کے لوگ جب اردو کو سنتے اور پڑھتے ہیں تو انھیں اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا بلکہ انھیں ایسا لگتا ہے کہ اردو ان کے دل کے بہت قریب ہے۔

ڈائرکٹر این سی پی یو ایل نے قومی اردو کونسل کی خدمات اور اسکیموں کا تعارف کرواتے ہوئے کہا کہ کونسل وزارت تعلیم، بھارت سرکار کا ایک خود مختار ادارہ ہے جس کا مقصد اردو زبان کا پورے ہندوستان میں فروغ کرنا ہے، اس کے لیے ہماری کئی اسکیمیں چلتی ہیں، ہم عربی، اردو اور فارسی ڈپلوما کورسز چلاتے ہیں جن کی تعداد ہزاروں میں ہے اور لاکھوں طلبہ و طالبات وہاں تعلیم حاصل کرتے ہیں، جس کی تکمیل کے بعد انھیں اچھی نوکریاں بھی ملتی ہیں۔ شیخ عقیل نے کہا کہ کونسل کے ذریعے پورے ملک میں کمپیوٹر سینٹرز بھی چلائے جاتے ہیں جہاں کمپیوٹر اپلی کیشنز و بزنس اکاؤنٹنگ کی تعلیم دی جاتی ہے، یہ کورس نہایت کامیاب ہے اور اسے مکمل کرنے کے بعد بچوں کو سرکاری و پرائیویٹ نوکریاں بھی ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ کیلی گرافی اور گرافک ڈیزائننگ سینٹر کی بھی اسکیم ہے، جس کے ملک کے مختلف اضلاع میں 71 سینٹر ہیں، جن میں دو سو سے زیادہ اساتذہ برسر کار ہیں اور تین ہزار سے زائد طلبہ کیلی گرافی سیکھ رہے ہیں، جس کی تکمیل کے بعد کوئی بچہ بے روزگار نہیں رہتا۔ شیخ عقیل نے سامعین کو کونسل کی اسکیموں سے فائدہ اٹھانے اور فروغ اردو کی مہم میں شامل ہونے کے بارے میں بتایا کہ ہمیں بیدار رہنے اور قوانین سے آگاہ رہنے کی ضرورت ہے تاکہ مختلف سرکاری اسکیموں سے کماحقہ استفادہ کرسکیں اور ملک و قوم کی ترقی میں حصہ لے سکیں۔

پروفیسر عقیل نے کہا کہ اسکل ڈیولپمنٹ کے کورسز میں بھی ہم اردو کی لازمی تعلیم دیتے ہیں، ہمیں معلوم ہے کہ ناگالینڈ کے لوگ ناگا اور انگریزی بہت اچھی جانتے ہیں، اگر وہ اردو بھی جانیں گے تو انھیں بطور خاص میڈیا کے شعبے میں اچھی ملازمت مل سکتی ہے، آج کل میڈیا میں مختلف زبانیں جاننے والوں کے لیے اچھے مواقع ہیں۔ انھوں نے کہا کہ زبان کوئی بھی ہو یہ ایسی چیز ہے جس میں پوری دنیا کا علمی و ادبی خزانہ پایا جاتا ہے، لہٰذا ہم جتنی زیادہ زبانیں سیکھیں گے، ہمارے علم میں اتنا ہی اضافہ ہوگا، اس لیے ہمیں زیادہ سے زیادہ زبانیں سیکھنی چاہیے۔ شیخ عقیل نے کہا کہ ہم ناگالینڈ میں کونسل کی تمام اسکیمیں نافذ کرنا چاہتے ہیں، ضرورت ہے کہ ناگالینڈ کے بیدار مغز اور سنجیدہ افراد اور ادارے آگے آئیں اور اردو زبان کی ترقی اور نئی نسل کو تعلیم یافتہ بنانے کی مہم میں ہمارے ساتھ چلیں۔

اس موقعے پر مسلم کونسل دیماپور کے ورکنگ پریسیڈنٹ اے رحمان، مسلم کونسل کے نائب صدر، اجمل فاؤنڈیشن کے ڈائرکٹر خسر الاسلام، جنرل منیجر ایم آر الیف آزاد، قومی اردو کونسل کے ریسرچ آفیسرز انتخاب عالم اور ڈاکٹر کلیم اللہ کے علاوہ ناگالینڈ کی سماجی تنظیموں، اسکول، کالجز اور مدارس کے نمائندگان بڑی تعداد میں موجود رہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے سہ رکنی وفد نے ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد کی سربراہی میں ناگالینڈ کے چیف سکریٹری جناب محمد جان عالم سے ملاقات کرکے خطے کی تہذیبی و ثقافتی ترقی اور اردو زبان کے فروغ سے متعلق امور پر تبادلۂ خیال کیا اور اس حوالے سے کونسل کی جانب سے ہر ممکن تعاون کی پیشکش کی، جس کا محترم چیف سکریٹری نے استقبال کیا اور اپنی طرف سے سنجیدہ اقدامات کی یقین دہانی کروائی۔ شیخ عقیل نے ملاقات کے دوران کہا کہ ہم چاہتے ہیں کہ ناگاؤں کے کلچرل فیسٹیولز میں ان کے ساتھ مل کر قوالی، غزل خوانی وغیرہ کا پروگرام کیا جائے تاکہ انھیں اردو زبان کے اس خوبصورت پہلو سے آشنا کروایا جائے۔ انھوں نے کہا کہ ناگا زبان میں موجود کہانیوں، بچوں کی کہانیوں یا اساطیر پر مشتمل کتابوں کا اردو میں ترجمہ کروانا چاہیں تو ہم اس کے لیے تیار ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ مقامی لوگوں میں اردو کا ذوق پیدا کیا جائے اور اردو زبان کی طرف انھیں راغب کیا جائے۔ انھوں نے چیف سکریٹری سے اپیل کی کہ سرکاری اسکولوں میں پرائمری لیول پر اردو پڑھانے اور سکھانے کا انتظام کیا جائے، اس سلسلے میں کونسل اپنے دائرہ اختیار کے مطابق مدد کرنے کے لیے تیار ہے۔ اسی طرح انھوں نے سرکاری شعبے میں ایک لینگویج سیل کے قیام کی بھی اپیل کی جو اردو کے فروغ کے لیے کام کرے، انھوں نے کہا کہ اس سیل کے ساتھ مل کر ہم مختلف ادبی و ثقافتی پروگرام کریں گے۔ چیف سکریٹری نے ان کی باتیں دلچسپی سے سنیں اور یقین دہانی کروائی کہ سرکار سے بات کرکے وہ لینگویج سیل بنائیں گے اور اس کے ذریعے اردو کے فروغ کی کوشش کریں گے، انھوں نے کہا کہ اس سلسلے میں مقامی این جی اوز سے بھی مدد لے جائے گی اور سرکاری اسکولوں میں اردو پڑھانے کا بھی انتظام کیا جائے گا۔ مسٹر جان عالم نے کہا کہ ہم بھی اس خطے میں اردو کو پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتے ہیں اور ہمیں خوشی ہے کہ قومی اردو کونسل یہاں اپنی ترقیاتی اسکیمیں نافذ کرنا چاہتی ہیں۔ اس موقعے پر وفد میں پروفیسر شیخ عقیل احمد کے ساتھ کونسل کے ریسرچ آفیسرز انتخاب عالم اور ڈاکٹر کلیم اللہ بھی موجود تھے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 8-7 نومبر 2022

وانمباڑی میں قومی اردو کونسل کا پچیسواں اردو کتاب میلہ

نئی دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ذریعے اردو کے فروغ کے لیے مختلف اسکیمیں چلائی جاتی ہیں، جن میں سے ایک اہم اسکیم اردو کتاب میلہ بھی ہے۔

کونسل ہر سال دس روزہ کتاب میلے کا انعقاد کرتی ہے، جس میں ملک کے مشہور و معروف اردو پبلشرز اپنی عمدہ علمی، ادبی کتابوں کے ساتھ شریک ہوتے ہیں۔ اس کے لیے ملک کے مختلف علاقوں بالخصوص اردو آبادی پر مشتمل جگہوں کا انتخاب کیا جاتا ہے، تاکہ وہاں کے لوگوں میں اردو زبان اور اردو کتابوں کے تئیں شوق و رغبت اور دلچسپی پیدا کی جائے۔ اس مرتبہ کونسل نے وانمباڑی مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی کے اشتراک سے اسلامیہ کالج وانمباڑی، تملناڈو میں اس میلے کے انعقاد کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ کتاب میلہ 31 دسمبر 2022 سے 8 جنوری 2023 کے دوران منعقد کیا جائے گا۔ کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد نے اس میلے کے تئیں غیر معمولی جوش و جذبے کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہم سنتے آئے ہیں کہ تملناڈو کے وانمباڑی اور مضافات کے علاقے میں اردو کے شائقین اور اس زبان سے محبت کرنے والے کثیر تعداد میں ہیں اور طلبا میں بھی اردو سیکھنے کا شوق پایا جاتا ہے، اس لیے مجھے امید ہے کہ اس کتاب میلے میں وانمباڑی اور تملناڈو کے تمام محبان اردو غیر معمولی دلچسپی کا مظاہرہ کریں گے اور بک اسٹال سے اہم کتابیں خرید کر ان کا مطالعہ کریں گے جس سے ان

کے علمی و ادبی ذوق کی تسکین ہوگی۔ انھوں نے بتایا کہ اس میلے میں کونسل کے علاوہ ہندوستان بھر کے درجنوں ناشرینِ کتب شرکت کریں گے اور ہر قسم کی علمی و ادبی کتابیں بہت مناسب قیمتوں پر بہ آسانی دستیاب ہوں گی۔ شیخ عقیل نے کہا کہ کونسل کے کتاب میلے ہمیشہ کامیاب رہے ہیں اور اب تک اس کے زیرِ اہتمام مختلف شہروں میں چوبیس میلے منعقد کیے جا چکے ہیں، پچھلے سال مہاراشٹر کے شہر مالیگاؤں میں اس کا انعقاد کیا گیا تھا جس میں شائقینِ علم و ادب نے ایک کروڑ سے بھی زائد کی کتابیں خرید کر ایک ریکارڈ قائم کیا تھا۔ انھوں نے توقع ظاہر کی کہ وانمباڑی کتاب میلے کے تئیں بھی لوگ اسی ذوق و دلچسپی کا مظاہرہ کریں گے اور یہ میلہ علاقے میں کتاب دوستی کا عمومی ذوق پیدا کرنے میں کامیاب ہوگا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 1 نومبر 2022

شاہین کی پرواز

نئی دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے صدر دفتر میں ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد کے ہاتھوں آج ماہنامہ 'اطلاع عام' آسنسول کے ایڈیٹر ڈاکٹر عبدالرؤف کے سفرناموں کے مجموعے 'شاہین کی پرواز' کا اجرا عمل میں آیا۔ اس موقعے سے شیخ عقیل

نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر عبدالرؤف ایک سرگرم صحافی اور مشہور صاحبِ قلم ہیں، ان کی ادارت میں کئی سالوں سے ماہنامہ 'اطلاع عام' پابندی سے شائع ہو رہا ہے، انھوں نے بیرون و بیرون ملک کے اپنے اسفار کی روداد اس کتاب میں بہت عمدہ انداز میں بیان کی ہے۔ اس کتاب میں ہندوستان کے مختلف شہروں کے علاوہ سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات وغیرہ کے ان کے اسفار کا احوال بھی درج ہے، جسے پڑھ کر بہت کچھ نیا جاننے کو ملتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو میں سفرنامہ نگاری کا رواج قدیم زمانے سے ہے اور بہت سے اصحابِ علم و قلم نے اپنے سفرنامے تحریر کیے ہیں، جن میں سے کچھ اپنی علمی و ادبی خصوصیات کی وجہ سے بہت مشہور بھی ہیں، مجھے امید ہے کہ ڈاکٹر عبدالرؤف کے سفرناموں کا یہ مجموعہ بھی اہلِ علم کے حلقے میں پذیرائی حاصل کرے گا۔ اس موقعے پر کتاب کے مصنف ڈاکٹر عبدالرؤف نے اپنی کتاب کے مشمولات کے حوالے سے اظہار خیال کیا اور قومی اردو کونسل اور پروفیسر شیخ عقیل احمد کا خصوصی شکریہ ادا کیا۔ پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 3 نومبر 2022

فروغِ اردو کے لیے نمائشی پروگراموں کے بجائے اردو کی بنیادی تعلیم پر توجہ دینے کی ضرورت ہے: پروفیسر شیخ عقیل احمد

نئی دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد نے اپنے ایک بیان میں اردو زبان کی موجودہ صورتِ حال اور اس کے مستقبل پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ کوئی بھی زبان اس وقت زندہ رہتی ہے، جب اس کی باضابطہ تعلیم دی جائے اور اس

کے لیے سنجیدہ کوششیں کی جائیں۔ انھوں نے کہا کہ آج ایک بڑا طبقہ خصوصاً جھگی بستی میں رہنے والی بہت بڑی آبادی ایسی ہے، جس کی تعلیم و تربیت کا کوئی انتظام نہیں، اگر ہمارے غیر سرکاری ادارے ان بچوں کی تعلیم پر توجہ دیں، انھیں کتاب، کاپی، قلم مہیا کرایا جائے، انھیں تعلیم سے وابستہ کیا جائے اور انھیں اردو زبان سکھائی جائے تو یہ ایک بڑا کام ہوگا اور یہی بچے آگے چل کر نہ صرف مختلف علمی و عملی شعبوں میں نام پیدا کریں گے، بلکہ یہی ہماری زبان و ثقافت کے بھی محافظ بن کر ابھریں گے، کیوں کہ اردو کے ایلیٹ کلاس کے لوگ اپنے بچوں کو اردو نہیں پڑھانا چاہتے اور ان کے ہاتھوں میں اردو کا مستقبل غیر محفوظ ہے۔ انھوں نے کہا کہ اگر ان پسماندہ علاقوں کے بچوں کو اردو زبان کے تعلق سے بیدار کیا جائے اور انھیں ابتدائی تعلیم دی جائے تو آگے وہ اسکولوں میں بھی اردو پڑھنا چاہیں گے اور اس طرح ان اسکولوں میں بھی اردو تعلیم کا نظم ہوسکتا ہے جہاں ایسا نہیں ہے۔ شیخ عقیل نے کہا کہ مختلف اداروں کی جانب سے فروغ اردو کے نام پر جو پروگرامز، سمینار وغیرہ منعقد کیے جاتے ہیں اور ان کے ذریعے پروفیسر حضرات کو جو لاکھوں کے اعزازات دیے جاتے ہیں، حقیقت میں ایسے عمل سے اردو کا فروغ نہیں ہوسکتا اور اگر ہم نے اپنے رویے میں تبدیلی نہ کی تو آئندہ انھی پروفیسرز، دانشوران اور ناقدین کی کتابوں کو کوئی پڑھنے والا بھی نہیں ملے گا، ان کی کتابیں لائبریریوں میں پڑی دھول کھائیں گی یا دیمک کی نذر ہو جائیں گی، اس لیے ہمیں پہلے سے ہی مشہور اور مادی اعتبار سے خوشحال دانشوروں پر مال و اسباب خرچ کرنے کے بجائے ان بچوں کو اس زبان کی طرف راغب کرنے کی تدبیریں کرنی چاہئیں، جو مختلف وجوہات کی بنا پر تعلیم گاہوں سے دور ہیں، ان کی تعلیم کا انتظام کرنا چاہیے اور انھیں اردو سکھانے پر غور کرنا چاہیے کیونکہ یہ بچے ہی ہمارا اور ہماری زبان و تہذیب کا مستقبل ہیں۔ اس تعلق سے قومی اردو کونسل کیا کر رہی ہے؟ اس سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ کونسل ایک سرکاری ادارہ ہے اور اس کا جو ڈائرکٹر ہوتا ہے اس کے اختیارات اور اسکیمیں طے شدہ ہیں، وہ انھی اسکیموں کے تحت زبان یا تعلیم کے فروغ کا کام کرسکتا ہے۔ قومی اردو کونسل پورے ملک میں اردو زبان کی تعلیم کے لیے سیکڑوں سینٹر چلا رہی ہے، جہاں ہر سال ڈیڑھ لاکھ بچے اردو سیکھتے ہیں، اس کے علاوہ ہماری ویب سائٹ پر آن لائن اردو لرننگ پروگرام بھی چلایا جاتا ہے، جس سے اب تک 36 ملکوں کے پچاس ہزار سے زائد غیر اردو داں لوگ اردو سیکھ چکے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہم ایسے این جی اوز کو ترجیحی طور پر اردو سینٹر دیں گے جو جھگی جھونپڑی اور آدیواسی علاقوں کے بچوں کو اردو سکھانے کا جذبہ رکھتے ہوں۔ انھوں نے کہا کہ آج روایتی اردو طبقے کے برعکس غیر اردو داں طبقے میں اس زبان کے تئیں زیادہ جوش، محبت اور لگاؤ پایا جاتا ہے اور وہ اس زبان کو بڑی تیزی سے سیکھ رہے ہیں، یہی وجہ ہے کہ برصغیر ہند و پاک کے علاوہ یورپ و امریکہ اور مختلف عرب ممالک میں بھی باقاعدہ اردو کی نئی بستیاں آباد ہو چکی ہیں جہاں لوگ محض اپنے ذوق و شوق سے اس زبان کو سیکھ رہے ہیں اور اس کی غیر معمولی خوبصورتی، جاذبیت اور شیرینی سے محظوظ ہو رہے ہیں، لیکن افسوس کی بات ہے کہ جو ہمارا اردو داں طبقہ ہے وہ اس زبان کے فروغ کے لیے بنیادی اور ضروری نوعیت کا کام نہیں کر رہا ہے۔ انھوں نے غیر سرکاری این جی اوز اور اصحابِ ثروت باذوق حضرات سے اپیل کی کہ اگر وہ واقعی اردو زبان سے محبت کرتے ہیں اور اسے فروغ دینا چاہتے ہیں، تو سمیناروں اور دیگر نمائشی پروگراموں میں اپنا سرمایہ ضائع کرنے کے بجائے خصوصاً غریب اور جھگیوں میں بسنے والے بچوں میں علم و کتاب کی روشنی پھیلا کر اپنی ثروت، وقت اور توانائی کا صحیح استعمال کریں، قوم و ملک کے لیے بھی ان کا یہ عمل زیادہ مفید اور کارگر ثابت ہوگا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 14 نومبر 2022

اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

دھلی

آزادی کے 75 سال: حقوق نسواں، چیلنجز اور امکانات

نئی دھلی: شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی کے زیراہتمام آرٹس فیکلٹی میں سالانہ نظام خطبے کا انعقاد کیا گیا، جس کا

موضوع 'آزادی کے 75 سال: حقوق نسواں، چیلنجز اور امکانات' تھا۔ اس پروگرام کی صدارت اردو اکادمی، دہلی کے سکریٹری محترم احسن عابد نے کی اور معروف صحافی مرنال پانڈے، سابق چیئرپرسن، پرسار بھارتی نے توسیعی خطبہ دیا۔ اس پروگرام میں شرکا اور مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے شعبہ اردو کی صدر پروفیسر نجمہ رحمانی نے کہا کہ 1966 میں سالانہ نظام خطبات کا آغاز ہوا۔ اس کے بانی خواجہ احمد فاروقی ہیں۔ سالانہ خطبے کا آغاز نظام حیدرآباد کے خاندان کے فرد مُکرّم جاہ کے تعاون سے ہوا۔ 1966 سے اب تک ہندوستان کی اہم شخصیات نے یہ خطبہ پیش کیا۔ مرنال پانڈے سالانہ نظام خطبات کی پہلی خاتون خطیب ہیں۔ سالانہ نظام خطبہ پیش کرتے ہوئے محترمہ مرنال پانڈے نے کہا کہ آزاد خاتون کا کوئی تصور ہماری تاریخ میں موجود نہیں ہے۔ جنگ آزادی میں خواتین جذباتی طور پر شریک تھیں، اس کی بڑی وجہ گھر کے مرد تھے، جن کی وجہ سے خواتین جنگ آزادی سے منسلک تھیں۔ آج ہمیں غور کرنے کی ضرورت ہے کہ ملک کی آزادی کے 75 برسوں بعد کیا ملک کی نصف آبادی کو وہی آزادی، برابری اور وہی حقوق حاصل ہیں جو مردوں کو حاصل ہیں۔ خواتین کو برابر کے حقوق دینے کے لیے حکومتوں اور عوام دونوں کو تیار رہنا پڑے گا۔ ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ ہمارا نظام انصاف کہاں کھڑا ہے۔ ہر شعبۂ حیات میں خواتین کو آنے دیا جائے تو خواتین اپنی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کرسکتی ہیں۔ احسن عابد نے کہا کہ اردو شاعری یقیناً لاجواب ہے لیکن سماجی، سیاسی اور حقوق نسواں کے حوالے سے ہندی میں بہت اہم کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ میرے خیال میں اس طرح کے موضوعات کا مطالعہ ہندی میں کرنے سے اردو والوں کو فائدہ ہوگا۔ پروگرام کے آخر میں اظہار تشکر کرتے ہوئے شعبہ کی استاذ پروفیسر ارجمند آرا نے کہا کہ مرنال پانڈے کی تقریر سے ہمیں بہت سے موضوع پر غور کرنے کا موقع ملا ہے۔ اس میں بہت سی ایسی شقیں ہیں، جن پر مزید غور کرنے کی ضرورت ہے۔ سالانہ نظام خطبات میں بڑی تعداد میں اساتذہ طلبہ وطالبات نے شرکت کی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 14 اکتوبر 2022

جی ڈی چندن کے سو سال اور اردو صحافت کے دو سو سال

نئی دھلی: معروف صحافی آنجہانی جی ڈی چندن کے 100 ویں یوم پیدائش اور اردو صحافت کے دو سو سال

پورے ہونے کے موقعے پر غالب اکیڈمی کے زیراہتمام غالب اکیڈمی میں 'جی ڈی چندن کے سو سال اور اردو صحافت کے دو سو سال' کے موضوع پر سمینار کا انعقاد عمل میں آیا۔ سمینار میں زیادہ تر صحافتی میدان سے وابستہ شخصیات مدعو تھیں۔ سمینار میں تین اجلاس ہوئے۔ پہلے اجلاس میں سینئر صحافی شکیل حسن شمسی نے اپنے کلیدی خطبے میں کہا کہ کاغذ کا استعمال اٹلی میں ہوا۔ 1435 میں پرنٹنگ پریس وجود میں آئی۔ انگریزی اخبار 1790 میں کلکتہ سے شائع ہوا۔ اردو اخبار کی تاریخ میں سب سے بڑا نام مولوی محمد باقر کا ہے۔ آج کی صحافت اور قدیم صحافت میں بہت فرق ہے۔ مشہور صحافی سہیل انجم نے اپنا مقالہ 'جام جہاں نما' پر مقالہ پڑھا جب کہ ڈاکٹر یامین انصاری نے 'اردو صحافت کا سفر' پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ اس موقعے پر پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ اردو صحافت اپنے قاری کے احساسات و جذبات کی لڑائی لڑتی ہے۔ اردو صحافت کا ہندوستان کی جنگ آزادی میں بڑا رول ہے۔ جی ڈی چندن صاحب بڑے افسر تھے، لیکن لوگوں کو جوڑنے میں یقین رکھتے تھے۔ ہمیں چندن کی یاد کو آگے بڑھاتے رہنا چاہیے۔ ڈاکٹر جی آر کنول نے بھی اظہار خیال کیا۔ اس سمینار میں لئیق رضوی نے الیکٹرانک میڈیا کے حوالے سے گفتگو کی۔ ظفر انور نے ڈی جی چندن کی صحافت پر اظہار خیال کیا۔ وسیم راشد نے اردو کے غیر مسلم صحافیوں کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔ شاہ تاج نے 'مہاراشٹر میں اردو صحافت' پر گفتگو کی۔ فرحت رضوی نے 'خواتین صحافی کے رول' پر روشنی ڈالی۔ حقانی القاسمی نے 'ادبی صحافت کے دو سو سال' پر مقالہ پیش کیا۔ اس سمینار میں عبدالباری مسعود، ابھے کمار، فاروق ارگلی، پروفیسر شریف حسین قاسمی نے بھی مقالے پیش کیے۔ پہلے اجلاس کی نظامت ڈاکٹر شاداب تبسم، دوسرے اجلاس کی نظامت عامر سلیم اور آخری اجلاس کی نظامت جاوید رحمانی نے کی۔ پہلے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر جی آر کنول اور دوسرے و تیسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر احمد محفوظ اور عبدالماجد نظامی نے کی۔ ڈاکٹر عقیل احمد سکریٹری غالب اکیڈمی نے اظہار تشکر کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 19 اکتوبر 2022

خبرنامہ

شاہجہاں آباد، گزشتہ اور حال

نئی دھلی: دہلی اردو اکادمی کی جانب سے چوتھا توسیعی خطبہ بہ عنوان 'شاہجہاں آباد: گزشتہ اور حال' کا اہتمام اردو اکادمی دہلی کے قمر رئیس سلور جوبلی آڈیٹوریم میں کیا گیا، جس میں پروفیسر شریف حسین قاسمی نے توسیعی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ صدیاں گزر جانے کے باوجود بھی شاہجہاں آباد کی یادیں آج بھی باقی ہیں۔ شاہجہاں آباد محض ایک شہر یا آبادی کا نام نہیں ہے، یہ ایک تہذیب، ایک تمدن اور شاندار تاریخ کا نام ہے، اگر یہ محض ایک شہر ہوتا تو قرونِ وسطیٰ میں کئی بار اسے لوٹا گیا، برباد کیا گیا تو اس کے نتیجے میں اسے صفحۂ ہستی سے مٹ جانا چاہیے تھا۔ پروفیسر قاسمی نے لال قلعہ اور دیگر عمارتوں کے تعلق سے سیر حاصل گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اورنگ زیب 25 برسوں تک لڑتا رہا، اسے خطرہ لاحق تھا کہ کوئی دہلی پر حملہ کرسکتا ہے۔ اس خوف سے اس نے سوچا لال قلعہ کو محفوظ کیا جانا چاہیے تو اس نے لال قلعہ کے دونوں مرکزی دروازوں کے سامنے دو عمارتیں تعمیر کرادیں۔ لال قلعہ کی تعمیر کے دس برس بعد 1648 میں شاہجہاں آباد کو باقاعدہ بڑے پیمانے پر بسانے کا کام شروع ہوا۔ فصیل بند اس شہر کو نصف دائرے کی شکل میں بنایا گیا۔ اس فصیل میں چھوٹے بڑے 14 دروازے اور 14 کھڑکیاں تھیں۔ یہ فصیل اب کہیں کہیں باقی ہے۔ آپ آج بھی شاہجہاں آباد پر نظر ڈالیے تو احساس ہوگا کہ یہ شہر بنیادی طور پر مسجدوں، مندروں، گرجا گھروں اور گرودواروں کا شہر ہے۔ شعبۂ تاریخ دہلی یونیورسٹی کے سابق صدر پروفیسر سید ظہیر حسین جعفری نے کہا کہ 19 ویں صدی کی کتابوں میں ہونے والی تبدیلیوں کا ذکر نہیں کیا گیا ہے، جو زوال کی داستان ہے، اسے نظر انداز کیا گیا ہے۔ عروج کی داستان ہمیں معلوم ہے۔ جنرل ولیم اور ڈلن کی کتابوں میں دہلی کی تباہی کی داستان بھی موجود ہے۔ لال قلعہ صرف مغلوں کے لیے نہیں بلکہ ہندوستان کے لیے ایک امیج کے طور پر ابھی بھی قائم ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 23 اکتوبر 2022

غزالی سے ابن خلدون تک عربی فکر و ثقافت

نئی دھلی: انڈیا عرب کلچرل سینٹر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام 'غزالی سے لے کر ابن خلدون تک عربی فکر و ثقافت' کے موضوع پر توسیعی خطبے کا پروفیسر محمد ایوب ندوی ڈائرکٹر انڈیا عرب کلچرل سینٹر، جامعہ ملیہ اسلامیہ کی

صدارت میں انعقاد کیا گیا، جس میں پروفیسر حمید اللہ مرازی ڈائرکٹر سینٹر فار اسپریچول اسٹڈیز، اسلامک یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹکنالوجی، کشمیر نے اپنا خطبہ پیش کیا۔ پروگرام کے آغاز میں پروفیسر محمد ایوب ندوی ڈائرکٹر انڈیا عرب کلچرل سینٹر جامعہ ملیہ اسلامیہ نے مہمان خطیب، اساتذہ اور طلبہ کا استقبال کرتے ہوئے مہمان خطیب کا تعارف اور موضوع کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ پروفیسر محمد ایوب ندوی کے بعد مہمان خطیب نے امام غزالی اور ابن خلدون کی علمی خدمات کا تجزیہ کرتے ہوئے بتایا کہ ابن خلدون نے کس طرح سے امام غزالی سے فلسفہ کے میدان میں استفادہ کیا جس کی وجہ سے وہ اپنے وقت کے ماہر سماجیات بلکہ اس کے امام تصور کیے جاتے ہیں۔ موصوف کے خطاب کے بعد موضوع کے متعلق بہت سے سوالات کیے گئے جن کے جوابات فاضل خطیب نے دیے۔ پروگرام کے آخر میں انڈیا عرب کلچرل سینٹر کے استاذ ڈاکٹر احسن رضا نے مہمانِ خطیب، اساتذہ اور تمام طلبہ و طالبات کا شکریہ ادا کیا۔ اس پروگرام میں بطور خاص پروفیسر عبدالماجد قاضی، ڈاکٹر آفتاب عالم، ڈاکٹر احسن رضا اور دوسرے اساتذہ کے علاوہ انڈیا عرب کلچرل سینٹر اور شعبۂ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے طلبہ و طالبات نے شرکت کی۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 15 اکتوبر 2022

اقبال پر توسیعی خطبہ

نئی دھلی: داراشکوہ فاؤنڈیشن اور جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے اشتراک سے اسکول آف لینگویجز لٹریچر اور کلچر اسٹڈیز میں ایک توسیعی خطبے کا اہتمام کیا گیا، جس میں بطور مہمان خصوصی اور ماہر اقبالیات کی حیثیت سے ڈاکٹر روی کمار مشرا ڈپٹی ڈائرکٹر نہرو میموریل لائبریری نئی دہلی نے خطاب کیا۔ انھوں نے کہا کہ اقبال کی حیثیت موجودہ دنیا میں ایک عبقری شخص کی ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں کائناتی آفاقی اور فلسفیانہ نظریہ پیش کرتے ہوئے ملک سے محبت اور اس کے تئیں وفاداری کا درس دیا ہے۔ استقبالیہ کلمات میں پروفیسر مظہر آصف ڈین اسکول آف لینگویجز لٹریچر اور کلچر اسٹڈیز نے کہا کہ اقبال ماہر فن اور وطن پرست تھے اور ہندوستان کے حوالے سے ان کی تمام نظمیں اہمیت کی حامل ہیں اور اسلام کو انھوں نے ایک آفاقی مذہب کے طور پر پیش کرتے ہوئے دنیا کے اندر امن و سکون کو تلاش کرنے کی بات بھی کی ہے، اس کے علاوہ انھوں نے داراشکوہ فاؤنڈیشن کے مقاصد اور نظریات پر بھی اپنی بات رکھی۔ اخیر میں داراشکوہ ریسرچ فاؤنڈیشن کے ٹرسٹی ڈاکٹر محسن علی اسسٹنٹ پروفیسر جامعہ ملیہ اسلامیہ نے تمام مہمانان اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ نظامت صدام حسین ریسرچ اسکالر جواہر لال نہرو یونیورسٹی نے کی۔ اس پروگرام میں جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے علاوہ دہلی یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اساتذہ اور ریسرچ اسکالر موجود تھے، جن میں پروفیسر انور پاشا، پروفیسر رضوان الرحمٰن، پروفیسر خورشید، پروفیسر اخلاق آہن، ڈاکٹر قطب الدین، ڈاکٹر اختر عالم، ڈاکٹر زرنگار، محترمہ صنم، ڈاکٹر ساجد مبین، ڈاکٹر قرۃ العین، ڈاکٹر انور خیری، ڈاکٹر عبدالواسع، محمد امجد وغیرہ شامل ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 21 اکتوبر 2022

اردو اساتذہ کے لیے ورکشاپ

نئی دھلی: اکادمی برائے فروغ استعداد اردو میڈیم اساتذہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ کا دائرۂ کار خصوصاً زبان و ادب کے تدریسی مسائل و معاملات سے متعلق ہے۔ اکادمی اس سلسلے میں تدریسی تربیت، ورکشاپ، سمینار اور ترغیبی پروگرام کے ساتھ ساتھ نصابی ضرورتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے تدریسی مواد کی تیاری کا فریضہ تقریباً ایک دہائی سے انجام دے رہی ہے۔ اسی سلسلے کو دراز کرتے ہوئے اکادمی برائے فروغِ استعدادِ اردو میڈیم اساتذہ نے ہیومن ویلفیئر ٹرسٹ، نئی دہلی کے اشتراک سے 10 تا 14 اکتوبر 2022 پانچ روزہ ورکشاپ کا انعقاد کیا، جس کے آج اختتامی اجلاس کی صدارت اکادمی کے اعزازی ڈائریکٹر پروفیسر شہزاد انجم نے کی۔ انھوں نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ تدریسی کتب کی تیاری کوئی آسان کام نہیں۔ ہر مرحلے پر خونِ جگر چاہتی ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ آٹھویں درجہ کی درسی کتاب 'ہماری کتاب' کے متون کے انتخاب کا مرحلہ بہ حسن و خوبی انجام پذیر ہوا۔ انھوں نے مزید کہا کہ درسی کتاب محض کتاب نہیں ہوتی، قوم و ملت کے مستقبل کا لائحہ عمل بھی ہوتی ہے۔ اس موقعے سے اظہارِ خیال کرتے ہوئے مولانا انعام اللہ فلاحی نے کہا کہ اکادمی کا علمی تعاون بلاشبہ ہمارے لیے نعمت ہے اور ہمیں امید ہے کہ آئندہ بھی یہ تعاون حاصل رہے گا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی یہ اکادمی درسی معاملات و

مسائل پر جس سنجیدگی سے کام کر رہی ہے اس کی مثال شاذ ہی مل سکے گی۔ پروگرام کو آرڈینیٹر ڈاکٹر واحد نظیر نے تفصیلی رپورٹ پیش کرتے ہوئے اطمینان کا اظہار کیا اور کہا کہ 'ہماری کتاب' کے اسباق ہر نقطۂ نظر سے مفید مطلب ہیں، ان سے بہتر آموزشی ماحصل کی توقع کی جاسکتی ہے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 15 اکتوبر 2022

این بی ٹی، انڈیا میں سہ روزہ ترجمہ ورکشاپ

نئی دھلی: نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا کے زیر اہتمام بچوں کی کتابوں کے لیے سہ روزہ ترجمہ ورکشاپ کا انعقاد ہوا، جس میں پورے ہندوستان سے اردو کے مشہور اور منجھے ہوئے ترجمہ نگاروں کو مدعو کیا گیا تاکہ ایک ساتھ کئی کتابوں کے ترجمے اردو میں کرائے جاسکیں۔ اس موقعے پر نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا کے ڈائرکٹر یوراج ملک نے کہا کہ ''ترجمے سے کسی بھی زبان کو وسعت ملتی ہے کیونکہ ایک زبان کی اچھی تخلیقات دیگر زبانوں میں ترجمہ ہوتی ہیں۔ اسی طرح اردو کی بہترین تخلیقات کی اشاعت بھی دیگر زبانوں میں ہورہی ہیں۔'' اس موقعے پر ڈائرکٹر این بی ٹی، انڈیا یوراج ملک نے پی ایم یوا مینٹورشپ کا بھی ذکر کیا اور انھوں نے کہا پچھلے سال اس اسکیم کو کامیاب بنانے میں ہر زبان کے ساتھ اردو زبان کا بھی اہم رول رہا ہے۔ نیشنل بک ٹرسٹ کی چیف ایڈیٹر نیرا جین نے کہا کہ ترجمہ کا فن ایک بڑا چیلنج بھرا فن ہے۔ اس موقعے پر نیشنل بک ٹرسٹ کے اردو کے ایڈیٹر، شمس اقبال نے کہا کہ اردو میں بچوں کی کتابوں کے لیے ورکشاپ منعقد کرانے کا مقصد اردو قارئین کو معیاری کتابیں دستیاب کرانا ہے۔'' اس ورکشاپ میں اردو کی اہم شخصیات نے حصہ لیا جن میں اسد رضا، خورشید اکرم، محمد علیم، پرویز شہریار، تنویر حسین، اظہار احمد ندیم، زین شمسی، عبدالسمیع، عبدالرزاق زیادی، آبگینہ عارف اور نثار احمد وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 2 نومبر 2022

درسی کتابوں کی تیاری میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی خدمات

نئی دھلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ کے یومِ تاسیس کے موقعے سے اکادمی برائے فروغ استعدادِ اردو میڈیم اساتذہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام ایک مذاکرے بہ عنوان 'درسی کتابوں کی تیاری میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی خدمات' کا انعقاد نوم چامسکی کمپلیکس جامعہ میں کیا گیا۔ اس مذاکرے میں جامعہ کے مختلف شعبوں کے اساتذہ کے علاوہ ملک کے دیگر اداروں کے اساتذہ اور ماہرین تعلیم نے شرکت کی۔ پروگرام کی صدارت پروفیسر سارہ بیگم، ڈین فیکلٹی آف ایجوکیشنل جامعہ ملیہ اسلامیہ نے کی۔ پروفیسر شہزاد انجم اعزازی ڈائرکٹر اکادمی برائے فروغ استعداد اردو میڈیم اساتذہ نے تمام شرکائے مذاکرہ کا استقبال کیا۔ مذاکرے کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر واحد نظیر نے انجام دیے۔ محترمہ پروفیسر سارہ بیگم نے صدارتی خطبے میں درسی کتابوں کی تیاری میں جامعہ کی خدمات کا مجموعی جائزہ پیش کرتے ہوئے اسپیشل ایجوکیشن کے میدان میں انجام دیے گئے کارناموں کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا۔ انھوں نے اعداد وشمار کی روشنی میں تقریباً تمام شعبہ ہائے جامعہ کی مجموعی کارکردگی پر بھرپور روشنی ڈالی۔ انھوں نے درسی کتابیں اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے موضوع پر مبسوط کام کرنے کی ضرورت پر بھی زور دیا اور کہا کہ اہل نظر جانتے ہیں کہ درسی کتابوں کی تیاری میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی کارکردگی قابل ستائش ہے۔ موصوف نے اس اہم موضوع پر اکادمی کے اساتذہ کی کوشش کو سراہتے ہوئے کہا کہ گذشتہ کچھ برسوں میں اکادمی نے بھی مذکورہ موضوع پر اہم کام کیے ہیں۔ پروفیسر شہزاد انجم نے کہا کہ درسی کتابوں کی تیاری میں یہاں کے اساتذہ نے دوسرے اداروں کو بھی اپنا قیمتی تعاون پیش کیا ہے۔ اس موقعے پر انھوں نے جامعہ کے بانیان اور معماران کی بیش بہا خدمات کا بھی اجمالاً ذکر کیا۔ اس موقعے پر شعبۂ اردو کے استاد پروفیسر کوثر مظہری نے کہا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ابتدائی دور میں یہاں کے اساتذہ نے مختصر ترین کتابیں لکھی ہیں۔ وہ کتابچے جامعہ کے مقاصد کے پیش نظر تیار کیے گئے تھے جو جامعہ کی لائبریری میں محفوظ ہیں۔ نئے نصاب کی تیاری میں ان کتابچوں سے استفادہ کیا جانا چاہیے۔ اس موقعے پر مرکزی تعلیمی بورڈ نئی دہلی کے کوآرڈینیٹر درسیات جناب مولانا انعام اللہ فلاحی نے تعلیمی میدان میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تاریخی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے فرمایا کہ جامعہ کے اکابرین نے جامعہ کے نصاب کی تیاری میں ابتدائی دور سے ہی توجہ دی ہے اور ہر سال نئے نصاب کی تیاری میں خصوصی دلچسپی لی۔ انھوں نے اکادمی برائے فروغ استعداد اردو میڈیم اساتذہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اشتراک سے ہیومن ویلفیئر ٹرسٹ کی درسی کتابوں کی تیاری کا بھی تفصیلی جائزہ پیش کیا۔ شعبۂ تعلیم، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے معروف استاد پروفیسر وسیم احمد خان نے درسی کتابوں کے حوالے سے اکادمی برائے فروغ استعداد اردو میڈیم اساتذہ کی کارکردگیوں کی ستائش کی۔ انھوں نے مزید کہا کہ شخصیت کی تعمیر میں صرف درسی کتابوں پر ہی منحصر رہنا مناسب نہیں ہے بلکہ شخصیت میں ان کے انجذاب پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ شعبۂ ہندی، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے استاد پروفیسر رحمٰن مصور نے درسی کتابوں کی تیاری کے تعلق سے شعبۂ ہندی کی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے کچھ اہم کتابوں کی تفصیل پیش کی۔ ڈاکٹر شکیل اختر ماس کمیونیکیشن جامعہ نے جامعہ ریڈیو کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ نصابی ضرورتوں کے نقطۂ نظر سے جامعہ کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ کتابوں کی اشاعت کے ساتھ ساتھ ان کے نشر کا بھی اہتمام موجود ہے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 29 اکتوبر 2022

اترپردیش

سرسید اور ان کی صحافت

علی گڑھ: تقریبات سرسید کے سلسلے میں مرکز تحقیقات فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (اے ایم یو) کے زیر اہتمام 'سرسید اور ان کی صحافت' کے موضوع پر ماس کمیونیکیشن شعبہ کے سابق سربراہ اور ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ یافتہ پروفیسر شافع قدوائی کے خصوصی خطبہ کا اہتمام کیا گیا۔ پروگرام کی صدارت پروفیسر شان محمد، سابق ڈائرکٹر، سرسید اکیڈمی نے کی۔ پروفیسر شافع قدوائی نے اپنے لکچر میں کہا کہ سرسید کی صحافت کے نام پر عموماً علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق کا ہی ذکر کیا جاتا ہے۔ سرسید 1860 میں ایک ششماہی جریدہ، خیر خواہان مسلمانان ہند نکالا اور ایک فارسی اخبار زبدۃ الاخبار سے منسلک رہے اور اصلاحی مضامین لکھتے رہے۔ ایک صحافی کی حیثیت سے انھوں نے سرسید کی زندگی کے ہر گوشے پر روشنی ڈالی۔ اپنی صدارتی تقریر میں سرسید اکیڈمی کے سابق ڈائریکٹر پروفیسر شان محمد نے سرسید کی شخصیت پر اپنی تحقیق کے حوالے سے کچھ دلچسپ اور سبق آموز واقعات بیان کیے اور ملک وقوم کی فلاح و بہبودی کے لیے ان کے ذریعے کیے گئے اقدامات اور عصر حاضر میں ان کی اہمیت ومعنویت پر روشنی ڈالی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 3 اکتوبر 2022

یادِ راہی معصوم رضا

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (اے ایم یو) کی فیکلٹی آف آرٹس کی جانب سے آرٹس فیکلٹی لاؤنج میں معروف مصنف راہی معصوم رضا کی یاد میں ایک پروگرام کا انعقاد کیا گیا۔ 'یادِ راہی معصوم رضا' کے عنوان سے

ہونے والے اس پروگرام میں راہی اور ان کی قلمی و ادبی خدمات پر گفتگو کے ساتھ ساتھ راہی کی مشہور تحریر جس کا ہندی ترجمہ سیما صغیر مرحومہ نے 'بھارتیتا کی پہچان: طلسم ہوشربا' کے عنوان سے کیا، کا اجرا عمل میں آیا۔ پروگرام کی صدارت کرتے ہوئے معروف کہانی کار ڈاکٹر نمیتا سنگھ نے کہا کہ وقت کے ساتھ ساتھ راہی کے ادب کی معنویت بڑھتی جا رہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ راہی معصوم رضا اپنی زندگی اور تحریروں میں معاشرے میں موجود خلیج کو پر کرنے کا کام کرتے رہے۔ داستان سے متعلق ان کی تحقیق کو ہر ہندی قاری کو پڑھنا چاہیے، کیونکہ اس سے ثقافت کے بارے میں صحیح نقطۂ نظر پیدا کرنے میں مدد ملتی ہے۔ پروفیسر شافع قدوائی نے کہا کہ راہی معصوم رضا نے اس مقالے میں اس وقت تک دستیاب جدید ترین ادبی تحقیقی نقطۂ نظر کو استعمال کیا ہے۔ ہندوستانی تناظر میں داستانوی ادب کا ان کا مطالعہ انتہائی اہمیت کا حامل ہے اور پرانی ادبی لسانی روایات کا نچوڑ پیش کرتا ہے۔ پروگرام کے مہمان خاص، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ ہندی کے پروفیسر نیرج کمار نے کہا کہ اردو نے زبان کو دربار سے نکال کر عوام تک پہنچایا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 19 اکتوبر 2022

پانچ روزہ بین الاقوامی کثیر لسانی نوجوان اردو اسکالرس فیسٹیول

میرٹھ: شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، بین الاقوامی نسائی ادبی تنظیم،

(بنات) اور بین الاقوامی نوجوان اردو اسکالرز انجمن (آیوسا) کے اشتراک سے چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی کے اپلائڈ سائنس آڈیٹوریم میں پانچ روزہ بین الاقوامی کثیر لسانی نوجوان اردو اسکالرس فیسٹیول (اردو، ہندی، انگریزی، سنسکرت، فارسی) بعنوان 'اردو کی ادبی صحافت' کا شاندار آغاز ہوا۔ صدارت کے فرائض محترم سید محمد اشرف اور مہمانانِ خصوصی کے بطور معروف ادیب عارف نقوی، ڈاکٹر ولا جمال العسیلی نے شرکت کی۔ نظامت کے فرائض معین شاداب نے بحسن وخوبی انجام دیے۔

پہلے اجلاس میں کلیدی خطبہ معروف محقق و ناقد ڈاکٹر جمیل اختر نے پیش کیا۔ جبکہ ایاز گورکھپوری، دائم انصاری، معین شاداب نے اپنے مقالات پیش کیے۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر آصف علی نے انجام دیے۔ شام سات بجے شعبۂ اردو اور سوانگ شالا ایکٹنگ اکیڈمی، میرٹھ کی مشترکہ پیش کش، پروفیسر اسلم جمشید پوری کا لکھا ہوا ڈراما 'تکرار' اسٹیج کیا گیا۔ اس پروگرام کی نظامت معروف ڈائریکٹر و پروڈیوسر نیرج شرما نے کی۔ صدر شعبۂ اردو، پروفیسر اسلم جمشید پوری نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے عالمی سمینار کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی۔ ادبی رسائل کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل اختر نے کہا کہ اردو صحافت کو اگرچہ دو سو سال ہو چکے ہیں مگر چونکہ اردو کی ادبی صحافت ماسٹر رام چندر کے رسائل سے مانی جاتی ہے۔ اس لیے ادبی صحافت کو ابھی 175 سال کا عرصہ ہوا ہے۔ اس موقعے پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے معروف ادیب عارف نقوی نے کہا کہ ہمارا ادب ایک ایسا ادب ہے جو رشتوں، امن و استحکام اور قومی و عالمی ترقی کے لیے اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اردو زبان نے دیگر زبانوں سے بہت سی باتیں قبول کی ہیں۔ ہمیں زیادہ سے زیادہ ہندوستانی زبانوں سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ ساتھ ہی عالمی ادب سے بھی بھرپور استفادہ کرنا چاہیے۔ اپنی صدارتی تقریر میں سید محمد اشرف نے کہا کہ اردو کی صحافت کا دو سو سال مکمل ہونے پر اردو کی ادبی صحافت کے ساتھ ساتھ ہندی، انگریزی، سنسکرت اور فارسی زبانوں کی ادبی صحافت کو شامل کر کے اردو زبان کے خصوصی وصف دلوں کو جوڑنے کی اپنی قدیمی روایت کو برقرار رکھا گیا ہے۔

اردو فیسٹیول کے دوسرے دن پہلا اجلاس شعبہ کے پریم چند سمینار ہال میں منعقد کیا گیا جس میں تنویر اختر رومانی، جمشید پور، ڈاکٹر یامین انصاری اور ڈاکٹر منور حسن کمال، دہلی نے اپنے مقالات پیش کیے۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر ارشاد سیانوی نے انجام دیے۔ ہندی و سنسکرت کا دوسرا اجلاس شعبۂ ہندی میں منعقد کیا گیا جس میں کمار سیتاپوری اور ڈاکٹر عبدالرحیم لکھنؤ نے کی۔ مقالات ڈاکٹر اسلم صدیقی، مظفرنگر، ڈاکٹر پردیپ کمار، میرٹھ، کفیل احمد، میرٹھ، کماری ورشا، میرٹھ، پنکو کمار، میرٹھ، شیوم کمار، میرٹھ، کماری سمرین، میرٹھ، فرقان اور وکرانت نے اپنے اپنے مقالات پیش کیے۔ نظامت ڈاکٹر الکا وششٹھ نے کی۔ تیسرے اجلاس میں بشیر مالیرکوٹلوی، پروفیسر عابد حسین حیدری، سنبھل اور شاہد حبیب فلاحی نے اپنے مقالے پیش کیے۔

بعد دوپہر دو اجلاس منعقد ہوئے۔ ڈاکٹر فرحت خاتون، ناصر آزاد نے اپنے مقالے پیش کیے۔ نظامت کے فرائض۔ نوازش مہدی نے انجام دیے۔ 'محفل افسانہ' کی صدارت میں بشیر مالیرکوٹلوی، پروفیسر اسلم جمشید پوری، اشتیاق سعید، ممبئی اور افسانہ نگار کے بطور ارشد منیم، پنجاب، ڈاکٹر توصیف علی، گڑھ، ڈاکٹر ذاکر فیضی، دہلی اور سیدہ مریم الٰہی نے شرکت کی اور اپنے افسانوں کی قرأت کی۔ نظامت کے فرائض عظمیٰ پروین نے انجام دیے۔ شام 7:00/ بجے شام غزل کا پروگرام منعقد ہوا جس میں عالمی شہرت یافتہ غزل سنگر مکیش تیواری نے مختلف شعرا کی غزلیں پیش کر کے سماں باندھ دیا۔

تیسرے دن کے پروگراموں کا آغاز شعبے کے پریم چند سمینار ہال میں اردو سیشن سے ہوا جس میں احمد صغیر، عرفان عارف اور ڈاکٹر عبدالحی نے اپنے مقالات پیش کیے۔ نظامت کے فرائض نوید خان، ایم جی ایم پی جی کالج، سنبھل نے بحسن وخوبی ادا کیے۔

شعبۂ ٹاکسیکالوجی میں پروفیسر پی کے شرما (شیخ الجامعہ سہیل دیو یونیورسٹی، اعظم گڑھ اور قاضی ایم راغب نے آرٹ گیلری کا افتاح کیا۔ جس میں ڈاکٹر عابد زیدی اور دیگر فن کاروں کی تصاویر کی نمائش کی گئی۔ بعد ازاں فارسی اجلاس منعقد کیا گیا۔ مہتاب جہاں، دہلی جلوہ افروز رہیں جب کہ اسماء پروین الہ آباد، جاوید اقبال، دہلی، نصرت فاطمہ، علی گڑھ اور زویا شہزاد نے اپنے پرمغز مقالات پیش کیے۔ نظامت کے فرائض حقانی القاسمی نے بحسن وخوبی ادا کیے۔ دوپہر بعد نواں اجلاس منعقد کیا گیا جس میں مقالہ نگار کے بطور ڈاکٹر شاذیہ عمیر، دہلی، ریحانہ سلطانہ اور یوسف رامپوری نے اپنے مقالے پیش کیے۔ نظامت فرح ناز نے کی۔ تیسرے دن کے آخری اجلاس میں ڈاکٹر نوشاد منظر، دہلی، ڈاکٹر عشرت ناہید، لکھنؤ، نیاز اختر، جمشید پور اپنے اپنے مقالات پیش کیے۔ نظامت کے فرائض سیدہ مریم الٰہی نے انجام دیے۔

پانچ روزہ بین الاقوامی کثیر لسانی نوجوان اردو اسکالرس فیسٹیول (اردو، ہندی، انگریزی، سنسکرت، فارسی) بعنوان 'اردو کی ادبی صحافت' کے چوتھے دن منعقد بنات کے چھٹے یوم تاسیس کے موقعے پر بنات کے کل تین اجلاس منعقد ہوئے جس ہندوستان بھر سے بہنوں نے شرکت کی۔ اسی دوران بنات نے شیخ الجامعہ پروفیسر سنگیتا شکلا، اور پروفیسر اسلم جمشید پوری کو 'بنات' ایوارڈ سے نوازا۔ پروگرام کی صدارت کے فرائض بنات کی سرپرست قمر جمالی، حیدر آباد نے کی اور مہمانان خصوصی کے بطور پروفیسر وائی وملا اور پروفیسر بندو شرما نے شرکت کی جب کہ اس سیشن کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر شاداب علیم نے ادا کیے۔

چوتھے دن کے پروگراموں کا آغاز شعبے کے پریم چند سیمینار ہال میں اردو سیشن سے ہوا۔ جس میں وصی اعظم انصاری لکھنو، کے پی شمس الدین، کیرالا نے اپنے مقالات پیش کیے۔ نظامت عظمیٰ پروین نے کی۔

وہیں شعبۂ ٹاکسیکالوجی میں انگلش سیشن کی مجلس صدارت پر پروفیسر وکاس شرما، میرٹھ، پروفیسر صالحہ رشید، الہ آباد اور ڈاکٹر سورنا رونق افروز رہے جب کہ حنا کوثر، ڈاکٹر سیدہ، عینی سیفی اور ڈاکٹر مرنالنی انت مظفر نگر نے اپنے مقالات پیش کیے۔ نظامت کے فرائض حبا خان اور شکریے کی رسم ڈاکٹر الکا وششٹھ نے ادا کی۔ بنات کا آخری اجلاس شام 4/ بجے منعقد ہوا جس کی محفل صدارت پر ڈاکٹر ہما مسعود، ڈاکٹر فرحت خاتون، نعیمہ جعفری اور رما نہرو جلوہ افروز رہیں۔ نظامت کے فرائض چشمہ فاروقی نے بحسن وخوبی ادا کیے۔ جبکہ رفیعہ نوشین، حیدر آباد، ڈاکٹر نگہت آرا، نسیم بیگم نسیم، نصرت شمسی، رام پور، رفیعہ ولی، کشمیر، ڈاکٹر فریدہ رحمت اللہ، بنگلور، نشاط پروین برسوی، سیدہ نسیم، ناڈیکر، طلعت سروہا، سہارنپور، شہناز رحمت اللہ، زنفر کھوکھر، کشمیر، گلزار بانو کشمیر نے اپنی تخلیقات پیش کی جس کو حاضرین نے خوب سراہا۔

پانچویں دن کے اختتامی اجلاس کا آغاز شعبے کے پریم چند سیمینار ہال میں ہوا جس میں ڈاکٹر سیدہ بیگم اور نوید خان نے اپنے مقالات پیش کیے۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر ارشاد سیانوی اور شکریے کی رسم ڈاکٹر الکا وششٹھ نے ادا کی۔ اختتامی اجلاس میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے مائنارٹی ایجوکیشنل سوسائٹی کے صدر آفاق احمد خاں نے کہا کہ پنج لسانی بین الاقوامی سیمینار میں مختلف زبانوں کے ادیبوں کو یکجا کر کے پروفیسر اسلم جمشید پوری نے قومی یکجہتی کا جو نمونہ پیش کیا وہ لائق تحسین بھی ہے اور قابل تقلید بھی۔ ذیشان خان نے کہا کہ میرٹھ کی زرخیز مٹی کا کمال ہے کہ یہاں برابر علم وادب کی شمع روشن ہوتی رہی ہے۔ درمیان میں ایک خلا سا پیدا ہو گیا تھا لیکن جب سے اسلم جمشید پوری میرٹھ تشریف لائے وہ ادبی ماحول پھر سے بحال ہو گیا جو اس کی پہچان رہا ہے۔ پروفیسر اسلم جمشید پوری نے جذباتی انداز میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ الحمدللہ یہ پانچ روزہ فیسٹیول نہایت کامیابی و کامرانی کے ساتھ آج اختتام پذیر ہو رہا ہے اور میں اپنے ساتھیوں اور طالب علموں کا مشکور ہوں کہ بعض مرتبہ میرے سخت و تلخ لہجے کے باوجود وہ نہایت جانفشانی سے پروگرام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں ساتھ دیتے رہے اور میں اپنے ان تمام ساتھیوں کا بھی بے حد شکر گزار ہو جنھوں نے میرے اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے میں دامے درمے سخنے تعاون کیا۔ آخری دن ایک عالمی مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا۔ جس کی صدارت معروف ادیب و شاعر عارف نقوی نے کی۔ مہمان خصوصی کے بطور جمشید پور، ٹاٹا اسٹیل کے آفیسر حسن امام نے شرکت کی۔ نظامت کے فرائض بنات کی فعال ممبر اور معروف شاعرہ عذرا نقوی نے کی۔ پروگرام کے درمیان میں عارف نقوی، جرمنی کو 'بابائے اردو' کے خطاب سے نوازا گیا۔

پریس ریلیز: صدر شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ، 10 نومبر 2022

مولانا عبدالسلام خاں یادگاری خطبہ

رامپور: عالمی شہرت یافتہ رامپور رضا لائبریری میں 'شارح مولانا روم اور اقبال: مولانا عبدالسلام خاں' تیسرا یادگاری خطبے کا انعقاد عمل میں آیا۔ پروگرام کی نظامت کررہی ساجدہ شیروانی نے مولانا عبدالسلام خاں کا تعارف پیش کیا۔ ساجدہ شیروانی نے کہا کہ مولانا عبدالسلام خاں بیک وقت بہترین منتظم اور بہترین مصنف تھے۔ پروگرام کے مقرر خصوصی شعبۂ ماس کمیونیکیشن علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر شافع قدوائی نے کہا کہ اسلامی تہذیب میں مولانا روم اور اقبال کی شخصیت کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ مولانا عبدالسلام خاں نے جس نہج پر مولانا روم اور اقبال کی شخصیت کو پیش کیا اس کی نظیر نہیں ملتی۔ پروگرام کے مہمان خصوصی صدر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ پروفیسر اقتدار محمد خاں نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مولانا عبدالسلام خاں نے اقبال اور مولانا رومی کو جس انداز میں ہمارے سامنے پیش کیا ان سے قبل دوسرے محققین نے یہ کارنامہ انجام نہیں دیا۔ انھوں نے کہا کہ مولانا عبدالسلام خاں رامپور میں پیدا ہوئے اور یہیں سے انھوں نے تعلیم حاصل کی اور رامپور کو ہی انھوں نے میدان عمل بھی بنایا۔ انھوں نے مزید یہ بھی کہا کہ رامپور کے اہل علم وادب کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے بزرگوں کی خدمات کو نہ صرف موقع پر یاد کریں بلکہ دنیا سے متعارف بھی کرائیں۔ اس موقعے پر ساجدہ شیروانی کی کتاب 'رامپور کے فارسی گوشعرا' کا اجرا عمل میں آیا۔ سابق صدر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور رامپور رضا لائبریری بورڈ کے ممبر پروفیسر عبدالعلی نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ مولانا عبدالسلام خاں بیک وقت اردو عربی اور فارسی کے ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ فلسفہ پر بھی عبور رکھتے تھے۔ مولانا عبدالسلام خاں کے بغیر مولانا اور اقبال کے فلسفے کو سمجھنا آسان نہ ہوگا۔ بعد ازاں مولانا عبدالسلام خاں کے صاحبزادے ناصر خاں ایڈووکیٹ نے پروگرام کے سامعین اور مہمانان کا شکریہ ادا کیا۔ ڈاکٹر ابوسعد اصلاحی لائبریری وانفارمیشن آفیسر رامپور رضا لائبریری نے مہمانان کرام کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی کے بعد مولانا عبدالسلام ہی ہیں جنھوں نے رامپور رضا لائبریری کے مختلف امور میں دلچسپی لے کر کئی اہم موضوعات پر تحقیقی کارنامے انجام دیے ہیں۔ پروگرام میں ذاکر حسین کالج دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر ظہیر رحمتی، گورنمنٹ گرلز ڈگری کالج رامپور کے اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر الف ناظم، ماہر پریم چند اور محقق ڈاکٹر پردیپ جین، فیصل خاں، فرید الحق، عتیق جیلانی سالک، سید مظہر الحق کے علاوہ کثیر تعداد میں اہل علم اور لائبریری کے ملازمین نے شرکت کی۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 31 اکتوبر 2022

کشمیر

اردو اور انگریزی ادب میں محبت، امن اور انسانیت کا پیغام

سری نگر: کشمیر کے قدیم تہذیبی شہر بارہمولہ کے گورنمنٹ ڈگری کالج برائے خواتین کے زیر اہتمام 2 اور 3 نومبر 2022 کو دو روزہ قومی کانفرنس بعنوان 'اردو اور انگریزی ادب میں محبت، امن اور انسانیت کا پیغام' منعقد کیا گیا، جس میں کشمیر کے علاوہ دہلی اور الہ آباد سے مندوبین نے شرکت کی۔ افتتاحی تقریب میں کالج کی پرنسپل پروفیسر ماہین مصطفی نے کہا کہ یہ پہلا موقع ہے کہ اس کالج میں یہ معیاری کانفرنس ہو رہی ہے۔ مہمانِ خصوصی

ڈاکٹر سحرش اصغر (آئی اے ایس) ڈپٹی کمشنر بارہمولہ نے ظلم، جبر کو سماج کے لیے زہر ہلاہل قرار دیا، ساتھ ہی انھوں نے خواتین کو بااختیار بنانے کی سمت میں مثبت کام کرنے کی ترغیب دلائی۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت پروفیسر شہزاد انجم، سابق صدر شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی نے کی۔ انھوں نے کہا کہ ادب خواہ کسی زبان کا ہو اس کی روح انسانیت ہے، اسی لیے ادبیات عالم میں محبت، امن اور انسانیت کے فروغ کے لیے اعلیٰ تخلیقات سامنے آئی ہیں۔ مہمان ذی وقار پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی نئی دہلی نے کہا کہ ادب تصویر زندگی بھی ہے اور تفسیر زندگی بھی، اسی لیے ہر عہد کے ادب میں انسانیت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ پروفیسر منوج کمار، الہ آباد یونیورسٹی نے انگریزی ادب کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ انگریزی ادب میں بھی یہ حاوی موضوع رہا ہے۔ کلیدی خطبہ میں نامور ادیب اور ماہر لسانیات پروفیسر نذیر احمد ملک نے کہا کہ ادب برائے زندگی ہو یا ادب برائے ادب ہر جگہ محبت کے پیغام کو اولیت دی گئی ہے۔ اس کانفرنس میں کشمیر یونیورسٹی، سینٹرل یونیورسٹی کشمیر، وادی کشمیر کے مختلف کالجوں کے اساتذہ اور ریسرچ اسکالر نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 4 نومبر 2022

مہاراشٹر

'ہندو مذہب کی کتابوں کے تراجم' پر توسیعی خطبہ

ممبئی: ممبئی یونیورسٹی کے شعبۂ عربی کے زیراہتمام ایس کے کالینا کیمپس میں واقع جے پی نائک بھون میں 'ہندو مذہب کی کتابوں کے تراجم' جیسے اہم موضوع پر

تقریر کرتے ہوئے معروف محقق، مصنف اور کالم نگار شمیم طارق نے کہا کہ تاریخ کے نام پر یہی پڑھایا جاتا رہا ہے کہ محمد بن قاسم اور محمود غزنوی نے ہمارے ملک پر حملے کیے اور یہاں آکر لوٹ پاٹ کی۔ یہ کم لوگوں کو معلوم ہے اور لوگوں کو بتایا بھی نہیں جاتا کہ یہاں ابومعشر الفلکی اور ابوریحان البیرونی بھی آئے اور اس لیے آئے کہ وہ اس ملک کو علوم کا مخزن سمجھتے تھے۔ انھوں نے یہاں کی مذہبی زبان سیکھی، علوم حاصل کیے اور زبان و علم دونوں کی قدردانی کا حق ادا کیا۔ ہمیں لوگوں کو یہ بتانا ہوگا کہ عرب جہاز رانوں اور سیاحوں نے ہندوستان کا جس انداز سے تعارف کرایا اس نے عربوں کو بھی ہندوستانی زبان اور علوم سیکھنے کی طرف راغب کیا اور دنیا کے دوسرے ملکوں اور قوموں کے لوگوں کو بھی۔ مثال کے طور پر عربی کے بے مثل انشاپرداز، فلسفی اور متکلم جاحظ نے جس کا انتقال آج سے 1158 سال قبل 864 میں ہو چکا تھا، ایک رسالے میں ہندوستان کے اصول بلاغت پر چند سطریں اور ایک رسالہ کتاب البیان والتبیین میں اس ملک کی بعض خوبیوں پر اس انداز سے روشنی ڈالی ہے کہ ہمیں ہندوستانی ہونے پر فخر کا احساس ہوتا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ ہندوستان کے باشندوں کو ہم نے نجوم اور حساب میں بہت آگے پایا ہے۔ ان کا ایک خاص ہندی خط (رسم الخط) ہے اور طب میں بھی ان کا درجہ بہت بلند ہے۔ ان کے طب میں سنگین بیماریوں کی دوائیں اور اسرار ہیں۔ ان کے خاص فن اور آرٹ ہیں۔ شطرنج انھوں نے ایجاد کیا ہے۔ ہندوستانیوں کے بارے میں اس نے مزید لکھا ہے کہ ان میں بہادری اور اصابت رائے ہے اور ان میں جو خوبیاں ہیں وہ چینیوں میں نہیں ہیں۔ ہندوستان اور ہندوستانیوں کی ان خوبیوں کو پڑھنے اور جاننے کے بعد کون ہے جو ہندوستان اور اس کے علوم کی طرف توجہ نہ دے؟ عرب میں مہابھارت کا مختصر ترجمہ عباسی دور میں ہوا۔ آریہ بھٹ کا نام ارج بہد اور ارج بھد یعنی بدلے ہوئے تلفظ کے ساتھ درج ہے۔ عربی میں ہندوستانی کتابوں کے باقاعدہ تراجم کا دور آٹھویں صدی عیسوی میں ہی شروع ہو چکا تھا۔ عربوں نے دور دراز کے سفر کیے تو ان کے ساتھ ان کتابوں کے نام اور نقول بھی دوسرے ملکوں میں پہنچیں۔ ایسی درجنوں کتابوں کا حوالہ دیا جاسکتا ہے جو عربوں کے توسط سے یورپ پہنچیں اور انگریزی میں ان کا ترجمہ ہوا۔ 1035 عیسوی میں ابوریحان البیرونی نے اپنی کتابوں کی فہرست تیار کی تھی۔ اس فہرست میں 100 سے زائد کتابوں کا ذکر ہے، ان میں تقریباً 27 کتابیں ہندوستانی علوم سے متعلق ہیں۔ پروفیسر امیر حسن عابدی اور پھر پروفیسر شریف حسین قاسمی نے فارسی سے اردو یا سنسکرت سے فارسی تراجم کی جو تفصیل پیش کی وہ حیران کن ہے۔ پروفیسر شریف حسین قاسمی نے تو 2500 فارسی مسودوں کا سراغ لگایا جو سنسکرت کتابوں کے تراجم کی شکل میں ہیں۔ عربی فارسی سے ہندوستان کا بہت گہرا تعلق ہے مگر دونوں زبانیں غیرملکی زبانیں ہیں۔ اس کے برعکس اردو ہندوستانی زبان ہے اور اس کی ہندوستانی بنیادوں کو کوئی منہدم نہیں کرسکتا۔ اس سلسلے میں شمیم طارق نے ان کاموں کا ذکر کیا جو انجمن اسلام کی کریمی لائبریری میں انھوں نے انجام دیا۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ کوئی ان کے کاموں کو منظرعام پر لائے گا اور ادھورے چھوڑے گئے کاموں کی تکمیل کرے گا۔ افتتاحی کلمات میں شعبۂ عربی کے صدر ڈاکٹر جمشید احمد ندوی نے موضوع اور مہمانان کا استقبال بھی کیا اور ان کا تعارف بھی کرایا۔ اچھی تعداد میں طلبا، اساتذہ اور اہل علم کی شرکت نے تقریب کو کامیاب بنایا۔

روزنامہ 'اردو ٹائمز' ممبئی 21 اکتوبر 2022

اعزاز و اکرام

نعمت خانہ

نئی دہلی: عہد حاضر کے معروف فکشن نگار پروفیسر خالد جاوید شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ناول 'نعمت

خانہ' کا انگریزی ترجمہ موقر جے سی بی ایوارڈ برائے ادب دو ہزار بائیس میں شارٹ لسٹیڈ پانچ ہندوستانی ناولوں میں شامل ہوا ہے۔ پروفیسر باراں فاروقی نے پروفیسر خالد جاوید کے ناول 'نعمت خانہ' کا انگریزی زبان میں 'پیراڈائز آف فوڈ' کے عنوان سے ترجمہ کیا ہے۔ ایوارڈ کی قیمت پچیس لاکھ روپے ہے، مترجم کو بھی انعام کی رقم میں سے دس لاکھ روپے دیے جائیں گے۔ پانچ منتخب مصنفین میں سے ہر ایک کو ایک ایک لاکھ روپے جائیں گے۔

زیر بحث ناول 'نعمت خانہ' باورچی خانہ سے منسلک ہے اور یہ ایک متوسط مسلم خاندان کی کہانی ہے جو بھوک، تشدد، محبت، جرم اور اعتراف کے اردگرد گردش کرتی ہے۔ پروفیسر نجمہ اختر شیخ الجامعہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے اسے یونیورسٹی کے لیے قابل فخر لمحہ بتایا ہے۔ پروفیسر خالد جاوید کے تین ناول موت کی کتاب، نعمت خانہ، اور ایک خنجر پانی میں بہت مقبول ہوئے ہیں اور ان کا چوتھا ناول ارسلان اور بہزاد جلد ہی منظر عام پر آئے گا۔ ان کے ناول 'موت کی کتاب' کو ڈاکٹر اے نصیب خان نے 'بک آف ڈیتھ' کے عنوان سے انگریزی قالب میں ڈھالا ہے۔ پروفیسر خالد جاوید کو ملک کے مختلف ممتاز اداروں نے اہم اعزازات وانعامات سے نوازا ہے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 28 اکتوبر 2022

سرسید، منظر کاظمی اور سید اطہر الدین ایوارڈ

میرٹھ: شعبۂ اردو چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میرٹھ میں منعقدہ بین الاقوامی کثیر لسانی نوجوان اردو اسکالرس

سید محمد اشرف — قدوس جاوید — بشیر مالیر کوٹلوی

حسن امام — نگار عظیم — ولاء جمال العسیلی — حقانی القاسمی

فیسٹول (اردو، ہندی، انگریزی، سنسکرت، فارسی) میں مختلف میدانوں میں کارہائے نمایاں انجام دینے والوں کو ایوارڈ سے نوازا گیا۔ سرسید نیشنل ایوارڈ برائے فکشن، ممتاز فکشن نگار سید محمد اشرف کو دیا گیا، جب کہ سرسید نیشنل ایوارڈ برائے ادبی صحافت حقانی القاسمی اور سرسید نیشنل ایوارڈ برائے سماجی خدمات ڈاکٹر حسن امام کو دیا گیا۔ منظر کاظمی نیشنل ایوارڈ برائے فکشن تنقید معروف ناقد پروفیسر قدوس جاوید کو دیا گیا، جب کہ منظر کاظمی کو نیشنل ایوارڈ برائےبشیر مالیر کوٹلوی کو دیا گیا۔ سماجی خدمات کے لیے 'بنات' کو سید اطہر الدین نیشنل ایوارڈ سے نوازا گیا اور ادبی خدمات کے لیے سید اطہر الدین انٹرنیشنل ایوارڈ مصر کی اردو ادیبہ اور شاعرہ ڈاکٹر ولاء جمال العسیلی کو دیا گیا۔ اس موقعے پر عارف نقوی کو بابائے اردو کا خطاب عطا کیا گیا۔

پریس ریلیز: پروفیسر اسلم جمشید پوری، صدر شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ، 10 نومبر 2022

شمیم نکہت فکشن ایوارڈ 2022

لکھنؤ: پروفیسر شمیم نکہت میموریل فکشن ایوارڈ کمیٹی کے زیر اہتمام

آل انڈیا کیفی اعظمی اکیڈمی میں پروفیسر سید وسیم اختر، چانسلر انٹگرل یونیورسٹی کی صدارت میں ایک باوقار ادبی تقریب بہ عنوان 'ڈاکٹر شمیم نکہت اردو فکشن ایوارڈ' اور 'شمیم نکہت میموریل لکچر' منعقد کی گئی جس میں امسال ڈاکٹر شمیم نکہت فکشن ایوارڈ 2022 سے معروف فکشن نگار صدیق عالم کو نوازا گیا۔ جبکہ وقار مہدی رضوی صحافت وسماجی خدمت ایوارڈ روزنامہ انقلاب لکھنؤ کے ریزیڈنٹ ایڈیٹر جیلانی خان کو دیا گیا اور عارف نقوی (جرمنی) کو لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ سے سرفراز کیے گئے۔ اس موقعے پر 'ہم عصر اردو افسانہ' کے موضوع پر مشہور فکشن ناقد اور افسانہ نگار پروفیسر ابن کنول (دہلی یونیورسٹی) نے چھٹا شمیم نکہت میموریل لکچر دیا۔

پروفیسر شارب ردولوی نے خطبہ استقبالیہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں فخر ہے کہ ڈاکٹر شمیم نکہت فکشن ایوارڈ اور شمیم نکہت میموریل لکچر نے ایک تاریخ بنائی ہے۔

پروفیسر سید وسیم اختر نے اس موقع پر نہایت مختصر خطاب میں کہا کہ فکشن لکھنے والوں کو ایوارڈ اور نئے لکھنے والے طلبہ وطالبات کے لیے انعامی سلسلہ ایسا قدم ہے جو فی الحقیقت اعتراف بھی ہے اور نئے نسل کو تیار کرنے کا ایک اہم پلیٹ فارم اور موقع بھی۔ اس موقعے پر مہمان ذی وقار ڈاکٹر عمار رضوی نے اپنے مخصوص انداز میں خطاب کرتے ہوئے کہا کہ تاریخ لکھنا آسان ہے لیکن تاریخ بنانا مشکل کام ہے۔ شارب ردولوی نے ڈاکٹر شمیم نکہت اردو فکشن ایوارڈ شروع کر کے تاریخ بنائی ہے۔

پروفیسر خان احمد فاروق (کانپور) نے پروفیسر شمیم نکہت کی شفقتوں ومحبتوں کو یاد کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے اپنے شاگردوں میں بھی کسی قسم کی کبھی کوئی تفریق نہیں کی اور ان کی محبت کا یہ عالم تھا کہ ہر شخص یہی سمجھتا کہ وہ اسے سب سے زیادہ چاہتی ہیں۔

دوران نظامت پروفیسر عباس رضا نیر (صدر شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ) شمیم نکہت فکشن ایوارڈ کے اب تک کے سفر پر روشنی ڈالی اور اپنے مخصوص انداز نظامت سے مہمانوں اور سامعین کو باندھے رکھا۔ ڈاکٹر ریشماں پروین (صدر شعبہ اردو کھن کھن جی گرلس پی. جی کالج، لکھنؤ) نے تینوں اعزاز یافتگان صدیق عالم، جیلانی خان اور عارف نقوی کے تعلق سے تعارفی خاکہ پیش کیا۔ اس موقع پر ایوارڈ یافتگان نے اپنے تاثرات میں شعاع فاطمہ ایجوکیشنل ٹرسٹ وسوسائٹی کا شکریہ ادا کیا اور اپنے تجربات مختصرا بیان کیے۔ طلبہ وطالبات کے افسانہ نویسی مقابلہ میں اول آنے والی الفت فاطمہ نے اپنا افسانہ پیش کیا۔

روزنامہ 'اودھ نامہ' لکھنؤ 13 نومبر 2022

ڈاکٹر سید احمد خاں

نئی دھلی: انٹگریٹیڈ میڈیکل ایسوسی ایشن (آئی ایم اے) کی جانب سے ہندی بھون میں دھنونتری ڈے کے موقعے پر ایک تقریب کا اہتمام کیا گیا۔ آئی ایم اے کی جانب سے آیوروید اینڈ یونانی طبیہ کالج، قرول باغ کے بانی حکیم

اجمل خاں کے نام سے اس سال ایوارڈ کا ایک نیا سلسلہ شروع کیا گیا اور آل انڈیا یونانی طبی کانگریس کے سکریٹری جنرل ڈاکٹر سید احمد خاں کو پہلا حکیم اجمل خاں ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ آل انڈیا یونانی طبی کانگریس کے لیگل صلاح کار ڈاکٹر لال بہادر (ایڈووکیٹ سپریم کورٹ) نے ڈاکٹر سید احمد خاں کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہم آئی ایم اے کے ذمہ داروں کا خاص طور سے شکریہ ادا کرتے ہیں، کیونکہ بھارت کی مشترکہ تہذیب میں آیوروید اور یونانی کے لوگ صدیوں سے ایک دوسرے کے قریب رہے اور استفادہ کیا اور ان کے نام سے دھنونتری ڈے کے موقعے پر حکیم اجمل خاں ایوارڈ کا سلسلہ شروع کر کے آئی ایم اے نے بڑی مثال قائم کی ہے۔ ممتاز مجاہد آزادی مسیح الملک حکیم اجمل خاں حقیقت میں ہندو مسلم

ایکتا کی بڑی مثال تھے۔ روزنامہ'انقلاب' دہلی، 22 اکتوبر 2022

ڈاکٹر ولاء جمال العسیلی

نئی دہلی: عرب ممالک میں اردو کی ترویج وفروغ

کے لیے گراں قدر خدمات انجام دینے والی مصر کی معروف شاعرہ ومصنفہ ڈاکٹر ولاء جمال العسیلی کے اعزاز میں آج صوفی پیس فاؤنڈیشن اور انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر کے اشتراک سے ایک تقریب انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں منعقد کی گئی۔ اس موقعے پر عرب دنیا میں اردو کی گرانقدر خدمات کے اعتراف میں ڈاکٹر ولاء جمال کو 'امیر خسرو ایوارڈ' سے سرفراز کیا گیا۔ تقریب میں درگاہ حضرت خواجہ غریب نواز کے سجادہ نشین اور اے ایم یو کے سابق پروفیسر لیاقت حسین معینی نے اپنے خطاب میں کہا کہ سبھی زبانوں کی کوئی نہ کوئی ماں ہوتی ہے، لیکن اردو کسی کی ماں نہیں، بلکہ سبھی زبانوں کی بیٹی ہے۔ خواجہ امیر خسروؒ نے اس زبان کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ اس موقعے پر روزنامہ 'انقلاب' کے ایڈیٹر عبدالودود ساجد نے اپنے خطاب میں کہا کہ ڈاکٹر ولاء جمال العسیلی کا اردو سے جو عشق ہے وہ مصنوعی نہیں ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ اردو ہی بولنا اور سننا پسند کرتی ہیں۔ معروف اسلامی اسکالر پدم شری پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ ڈاکٹر ولاء جمال کئی اعتبار سے اہمیت کی حامل ہیں، وہ ایک خاتون ہیں اور ان کے ذریعے زبان کا جو رواج اور رویہ ہے وہ مثالی ہے۔ جو لوگ مصر میں اردو کو زندہ رکھے ہوئے ہیں وہ زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ اس موقعے پر انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر کے نائب صدر ایس ایم خان نے بھی ہندوستان اور مصر کے تعلقات، دونوں ملکوں کی تہذیبوں اور زبان کے حوالے سے سیر حاصل گفتگو کی۔ شاعر معین شاداب نے ڈاکٹر ولاء جمال کی تصنیف دختر نیل کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ آپ نے اس میں ذاتی غم کو ایک کائنات بنا دیا ہے۔ ان کی ہر غزل اور ہر ورق میں کوئی نہ کوئی کرب نظر آتا ہے۔ صوفی فاؤنڈیشن کے سکریٹری ڈاکٹر یامین انصاری نے ڈاکٹر ولاء جمال کی تہنیت میں سپاس نامہ پڑھا۔ یہ سپاس نامہ انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر کی جانب سے ڈاکٹر ولاء جمال کو پیش کیا گیا۔ ڈاکٹر ولاء جمال العسیلی نے تقریب کے انعقاد کے لیے منتظمین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ میرا عشق اردو سے ہے، اردو ایک جادو ہے، جس کا مجھ پر بہت اثر ہوا۔ اردو میرے لیے صرف ایک زبان نہیں، بلکہ اردو میری زندگی ہے۔ میں کبھی اردو سے دور نہیں رہ سکتی، اردو ہمیشہ میرے ساتھ رہتی ہے۔ ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن نے نظامت کے فرائض انجام دیتے ہوئے کہا کہ اردو مختلف زبانوں کی آمیزش سے بن کر تیار ہوئی ہے۔

روزنامہ'انقلاب' دہلی، 4 نومبر 2022

ڈاکٹر م ق سلیم

حیدرآباد: تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی کی جانب سے

ڈاکٹر م ق سلیم صدر شعبہ اردو شاداں کالج ووائس پرنسپل کو ان کی کتاب 'قلم برداشتہ' کو اسکیم مطبوعات پر انعام اول کا مستحق قرار دیا۔ یہ 2019 کی کتاب ہے، اس کے علاوہ 'مٹھی میں ریت' (افسانچے) کو مطبوعات پر انعامات برائے سال 2020 زمرہ فکشن میں انعام دوم کا مستحق قرار دیا گیا۔ یہ انعام نقد رقم اور توصیف نامے پر مشتمل ہے۔ اب تک ڈاکٹر م ق سلیم کی 28 کتابیں منظر پر آچکی ہیں، آسان اردو قواعد کے پچیس ایڈیشن، آؤ آسان اردو سیکھیں اور اردو آبجیکٹیو سوال وجواب کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے ہیں، انھوں نے تحقیق، تنقید، طنز ومزاح، بچوں کے ادب، افسانہ وغیرہ پر لکھا۔ تمام کتابوں پر کئی اداروں اور اکیڈمیوں سے انعام حاصل کیا ہے۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر میم قاف سلیم، حیدرآباد، تلنگانہ 20 اکتوبر 2022

کاتب منصور احمد

دیوبند: ایران کلچرل ہاؤس نئی دہلی میں 23 واں سہ روزہ کل ہند مسابقہ قرآنی اور خطاطی نمائش پروگرام کا انعقاد کیا گیا، جس میں ہندوستان اور ایران کے قرا، حفاظ اور خطاط حضرات نے حصہ لیا، وہیں دارالعلوم دیوبند سے

بھی شعبہ خوشخطی کے دو بزرگ استاذ مولانا عبدالباری اور منشی کاتب منصور احمد مسابقہ خطاطی میں شامل ہوئے۔ ایران کے نومنتخب سفیر برائے ہند ڈاکٹر ایراج الٰہی کلچرل کونسلر ڈاکٹر محمد علی ربانی اور دیگر مہمانوں نے کاتب منصور احمد کے طغرے پسند کیے اور ان کے فن کی داد دی۔ اختتامی پروگرام میں منصور احمد کاتب کو گراں قدر انعام، توصیفی سند اور ایوارڈ سے نوازا گیا۔ واضح ہو کہ کاتب منصور احمد دیوبند کے مشہور خطاط محمد احمد مرحوم کے صاحبزادے ہیں، آپ کے برادر حقیقی دلشاد احمد بھی دارالعلوم وقف دیوبند میں شعبہ خوشخطی کے استاذ ہیں۔ کاتب منصور احمد نے بے شمار کتابوں کی کتابت کی ہے اور تقریباً 45 سال سے اس فن سے منسلک ہیں۔

روزنامہ'راشٹریہ سہارا' دہلی، 13 اکتوبر 2022

ڈاکٹر شمیم دیوبندی

دیوبند: معروف شاعر ڈاکٹر شمیم دیوبندی کو فراق

گورکھپوری کے یوم پیدائش کے موقعے پر فراق گورکھپوری ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ یہ ایوارڈ ڈاکٹر شمیم دیوبندی کو غزلوں کے خاص نمبر میں شامل ہونے پر دیا گیا ہے۔ ادبی تنظیم پبلی کیشنز اور سہ ماہی رسالہ کے ذریعہ پریاگ راج میں منعقد کیے گئے پروگرام میں یہ ایوارڈ دیا گیا۔

ڈاکٹر ولاء جمال العسیلی کے شعری مجموعہ 'دختر نیل' کا اجرا

ڈاکٹر مستفیض احد عارفی کی تصنیف 'اسلوبیاتی مباحث' کا اجرا

ڈاکٹر شمیم دیوبندی نے ایوارڈ ملنے پر پروگرام کے کنوینز اور رسالہ کے ایڈیٹر امتیاز احمد غزالی کا شکریہ ادا کیا ہے۔ اس موقعے پر صحافی اشوک گپتا نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر شمیم دیوبندی کو متعدد مرتبہ ایوارڈ مل چکے ہیں، وہ ایک اچھے شاعر ہیں۔ انھوں نے ہمیشہ دیوبند کا نام روشن کیا ہے، ایوارڈ ملنے پر صحافی ماسٹر ممتاز احمد، قلمکار کمل دیوبندی، بی جے پی میڈیا سیل کے ضلع کنوینز ڈاکٹر سکھ پال سنگھ، سماجی کارکن ڈاکٹر ایس اے عزیز وغیرہ نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے ڈاکٹر شمیم دیوبندی کو مبارکباد پیش کی ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 18 اکتوبر 2022

رسم اجرا

مقالات سرسید

علی گڑھ: سرسید احمد خاں ایک نابغہ روزگار مفکر اور صاحب عمل انسان تھے۔ ان کی تحریروں اور مقالوں کی اشاعت وقت کی اہم ضرورت ہے کیونکہ یہ تحریریں ادارہ ساز ذہن پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں اور ہمیں جمود کی حالت سے باہر نکال سکتی ہیں۔ ان خیالات کا اظہار کیرالہ کے گورنر جناب عارف محمد خاں نے کیا۔ وہ سرسید اکیڈمی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (اے ایم یو) کے زیراہتمام انڈیا اسلامک کلچرل سنٹر، نئی دہلی میں 'مقالات سرسید' کی چار جلدوں کا اجرا کرنے کے بعد خطاب کررہے تھے۔ مقالات سرسید کی اشاعت پر سرسید اکیڈمی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ذمہ داران کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے جناب عارف محمد خاں نے کہا کہ سرسید نے ایسے دور میں اپنی اصلاحی و تعلیمی تحریک شروع کی جب انگریزی اور جدید تعلیم کو برا قرار دے دیا گیا تھا اور قدامت پرستی عام تھی۔ ہندوستان میں پہلی بار سرسید کے ہاتھوں وہ جمود ٹوٹا۔ سرسید کے پیغام کو علامہ اقبال کی مشہور نظم 'سید کی لوح تربت' کے حوالے سے بیان کرتے ہوئے عارف محمد خاں نے وہ نظم پڑھی اور سرسید اکیڈمی کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ آج ان تحریروں اور تخلیقات کی افادیت بڑھ گئی ہے۔ میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں کہ آپ نے سرسید کی اصل تحریروں اور تخلیقات کو شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان کتابوں سے ہمارے سماج میں ادارہ ساز ذہن پیدا ہوں گے اور جس جمود میں ہم ہیں اس سے یہ کتابیں ہمیں باہر نکال سکتی ہیں۔'' اے ایم یو کے وائس چانسلر پروفیسر طارق منصور نے اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ سرسید مختلف الجہات شخصیت تھے اور انھوں نے متنوع موضوعات پر لکھا ہے۔ انھوں نے کہا کہ سرسید کی فکر کی اشاعت و ترویج اور اہم کتب و تحریروں کی اشاعت کے لیے ہم نے سرسید اکیڈمی کو ہر ممکن تعاون فراہم کیا ہے۔ اس سلسلہ میں مزید جو بھی مشورے آئیں گے ہم ان پر سنجیدگی سے غور کریں گے اور جو چیزیں رہ گئی ہیں انھیں پورا کریں گے۔ انھوں نے کہا کہ سرسید اکیڈمی نے پچھلے دو تین برسوں میں 35 سے زائد کتابیں شائع کی ہیں۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 30 اکتوبر 2020

دختر نیل

نئی دھلی: غالب اکیڈمی نئی دہلی میں عین شمس یونیورسٹی، قاہرہ میں اردو کی استاد اور مصر کی معروف شاعرہ ڈاکٹر ولاء جمال العسیلی کے شعری مجموعہ 'دختر نیل' کا اجرا اردو ادب کی اہم ترین شخصیات کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ رسم اجرا کی اس تقریب کی صدارت پروفیسر شریف حسین قاسمی نے کی۔ اس موقعے پر ولاء جمال العسیلی نے مصر میں اردو کے فروغ پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ مصر کی یونیورسٹی میں اردو تعلیم کا انتظام ہے۔ عین شمس یونیورسٹی سے میں نے خود اردو کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور وہیں ایسوسی ایٹ پروفیسر کی حیثیت سے اردو پڑھا رہی ہوں۔ قاہرہ یونیورسٹی میں اردو کا اچھا انتظام ہے، لیکن مصر میں اردو بولنا مشکل ہے۔ گھروں میں، بازاروں میں یا دیگر عام مقامات پر اردو بولنے والے عام طور پر نہیں ملتے۔ صرف کلاس روم تک بولنے کا چلن ہے۔ اردو بولنا مشکل ہے کیونکہ اردو کی جو آوازیں عربی میں نہیں ہیں، ان کی صحیح ادائیگی نہیں ہو پاتی۔ میں اردو میں لکھتی ہوں، ترجمہ کرتی ہوں، شاعری کرتی ہوں۔ اس موقعے پر کتاب کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے صحافی ڈاکٹر یامین انصاری نے کہا کہ ولاء جمال مصر اور عربی کے بعد اردو اور ہندوستان سے بے پناہ محبت کرتی ہیں۔ ان کی غزلوں میں غزل کے بنیادی موضوعات حسن و عشق، عاشق معشوق، غم جاناں وغیرہ کے ساتھ عام انسانی زندگی کے مسائل بھی ملتے ہیں۔ پروفیسر ابن کنول نے کہا کہ اردو زبان ولاء کا عشق ہے۔ اردو ان کی سیکھی ہوئی زبان ہے۔ بہت اعتماد کے ساتھ بغیر اغلاط کے انھوں نے اپنا شاندار کلام سنایا۔ پروفیسر شہپر رسول نے کہا کہ عرب والوں کے لیے اردو کی ہکاری آوازوں کا مسئلہ ہے۔ اس کی ادائیگی ان کے لیے مشکل ہے۔ پروفیسر احمد محفوظ نے ولاء جمال کو عمدہ کلام پڑھنے کے لیے مبارکباد پیش کیا اور اپنے کچھ اشعار پیش کیے۔ اس موقعے پر ظہیر برنی اور کیلاش سمیر نے بھی اپنا کلام سنایا۔ غالب اکیڈمی کے سکریٹری ڈاکٹر عقیل احمد نے دیوان غالب پیش کرکے ولاء جمال کا خیر مقدم کیا اور کہا کہ غالب اکیڈمی کا تعلق عین شمس یونیورسٹی سے پرانا ہے، وہاں کے صدر شعبہ اردو پروفیسر یوسف عامر 20 سال پہلے یہاں لیکچر دے چکے ہیں۔ پروفیسر شریف حسین قاسمی نے اپنی تقریر میں کہا کہ ولاء جمال کا تلفظ بڑی حد تک صحیح ہے۔ بہت محنت سے اردو سیکھی ہے، ان کا لہجہ نرم ہے۔ اس جلسے میں بڑی تعداد میں دہلی کے ادیب صحافی شاعر موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 29 اکتوبر 2022

اسلوبیاتی مباحث

دربھنگہ: المنصور ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ، شوکت علی ہاؤس، پرانی منصفی کے زیراہتمام ڈاکٹر مستفیض احد عارفی کی تصنیف کردہ کتاب 'اسلوبیاتی مباحث' کا اجرا عمل میں آیا۔ تقریب کی صدارت پروفیسر محمد آفتاب اشرف صدر شعبہ اردو ایل این ایم یو دربھنگہ نے کی۔ اس موقعے پر مہمانان خصوصی کی حیثیت سے سید محمود احمد کریمی، پروفیسر سید احتشام الدین اور ڈاکٹر عطا عابدی شریک ہوئے۔ شرکا کی حیثیت سے انور آفاقی، مجیر احمد آزاد، ارشد سلفی، ریحان احمد قادری، محمد سرور حسین صدیقی، محمد شمشاد وغیرہ شامل رہے۔ کتاب کی رسم رونمائی کے بعد شرکا میں سے انور آفاقی، ڈاکٹر احسان عالم، ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، ڈاکٹر عطا عابدی، پروفیسر محمد آفتاب اشرف، پروفیسر سید احتشام الدین وغیرہ نے کتاب اور صاحب کتاب کے حوالے سے گفتگو

کی۔ ڈاکٹر منصور خوشتر نے پروگرام کی نظامت کرتے ہوئے مستفیض احد عارفی کا تعارف پیش کیا اور اور 'اسلوبیاتی مباحث' میں شامل مضامین کا ذکر کرتے ہوئے ان کی کارکردگی کو سراہا۔ انھوں نے ذکر کیا کہ جناب عارفی کی تحریریں نئی نسل کے لیے مشعل راہ ہیں اور ان سے امید کی جاتی ہے کہ اسلوبیاتی نہج کی گفتگو کو آگے بڑھائیں گے۔ انھوں نے کہا کہ 'اسلوبیاتی مباحث' موصوف کی پہلی کاوش ہے۔ اس میں کل بیس مضامین ہیں۔ اس میں اسلوب اور اسلوبیات کے تناظر میں شاعری، فکشن، نفکشن، تنقید اور تحقیق سے متعلق مضامین پر خامہ فرسائی کی گئی ہے۔ موصوف کا اسلوب توضیحی، استدلالی اور تنقیدی ہے۔ انور آفاقی نے کہا کہ ڈاکٹر مستفیض احد عارفی سلجھی ہوئی گفتگو کرتے ہیں اور مضامین میں قاری کے لیے کچھ نہ کچھ نیا پیش کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر احسان عالم نے کہا کہ ڈاکٹر مستفیض احد عارفی کی تحریریں متاثر کرتی ہیں۔ خاص طور سے جب وہ اسلوب پر بحث کرتے ہیں تو ان کا انداز انوکھا اور اختراعی ہوا کرتا ہے، ان کے مضامین اور مقالات ہندوستان کے معتبر رسائل وجرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ڈاکٹر مجیر احمد آزاد نے کہا کہ ڈاکٹر مستفیض احد عارفی سن دو ہزار کے بعد کی نسل کا نوجوان شاعر، ناقد اور ایک ابھرتے ہوئے قلمکار ہیں۔ شاعری میں جدید لب ولہجہ کی وجہ سے متاثر کرتے ہیں اور تنقیدی مضامین بالخصوص اسلوبیاتی مبادیات کے ذریعے ادبی حلقے میں ایک الگ شناخت بنانے کی طرف گامزن ہیں۔ ڈاکٹر عطا عابدی نے کہا کہ ان کے مضامین ایک پختہ ذہن کی عکاسی کرتے ہیں۔ وہ جن موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں ان کے ہر زاویے کو احاطۂ تحریر میں لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا تنقیدی شعور قابل رشک ہے۔ پروفیسر محمد آفتاب اشرف نے کہا کہ اسلوبیاتی مباحث میں شامل مضامین تنوع اور تہ دار ہیں۔ مضمون نگار نے بطور خاص اسلوب، اسلوبیات اور فنکار سے متعلق ادبی تخلیق کو موضوع بناتے ہوئے تفصیل طلب گفتگو کی ہے۔ ان کا انداز استدلالی اور توضیحی ہے اس لیے کہیں کہیں ان کی تحریر میں پیچیدگی در آئی ہے۔ یہ ان کی انفرادیت ہے۔ پروفیسر سید احتشام الدین نے کہا کہ انھوں نے ایسا موضوع انتخاب کیا ہے جو موجودہ دور میں قابل توجہ ہے۔ انھوں نے اسلوبیاتی گفتگو اور مباحث قائم کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔

پریس ریلیز: منصور خوشتر، دربھنگہ، 26 اکتوبر 2022

پریم چند اینڈ دی عرب ورلڈ

نئی دھلی: اردو ہندی کے ناول وافسانہ نگار پریم چند کو

یہ امتیاز حاصل ہے کہ ان کے ناول اور افسانوں کا ترجمہ دنیا کی مختلف زبانوں میں کیا گیا ہے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ پریم چند کی آفاقیت کا یہ عالم ہے کہ ان کے بعض ناول اور افسانوں کا ترجمہ عربی میں بھی کیا گیا ہے، لیکن صرف چار پانچ افسانے اور ایک ناول کا ہی عربی ترجمہ کیوں؟ جب پریم چند نے تین سو سے زائد افسانے لکھے اور ان کا ترجمہ انگلش میں کیا جاچکا ہے تو عربی میں بھی ان کے مزید افسانوں اور ناول کے ترجمے ہونے چاہئیں۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر اسدالدین ڈین فیکلٹی آف ہیومنیٹیز اینڈ لینگویجز جامعہ ملیہ اسلامیہ نے کیا، وہ غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیراہتمام محترمہ شالو اور ڈاکٹر جسیم الدین، گیسٹ فیکلٹی شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی کی مشترکہ تصانیف 'پریم چند اینڈ دی عرب ورلڈ' کی رسم اجرا کی تقریب سے بحیثیت صدر خطاب کررہے تھے۔ مہمان خصوصی پروفیسر امیتابھ چکرورتی ڈین فیکلٹی آف آرٹس دہلی یونیورسٹی نے کہا کہ پریم چند کو ساری دنیا میں پڑھا جارہا ہے، اب عربی زبان میں بھی اہل عرب اور عربی داں حضرات ان کے ناول اور افسانوں کا ترجمہ کررہے ہیں، یہ ان کے ادب کی مقبولیت کی دلیل ہے۔ تقریب کے مہمان اعزازی پروفیسر نعیم الحسن اثری، صدر شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی نے کتاب کی اشاعت پر اظہار مسرت کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستانی ادبا میں پریم چند کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ ان کے ادب سے عرب کے ادبا بھی متاثر ہوئے اور مشہور زمانہ ناول 'گئودان' کا ترجمہ عربی زبان میں کرکے عالم عرب میں پریم چند کے ادب کو متعارف کرایا۔ تقریب کے دوسرے مہمان اعزازی عبدالودود ساجد ایڈیٹر انقلاب نارتھ نے کہا کہ ڈاکٹر جسیم الدین اور محترمہ شالو اس نئی کتاب کو منظر عام پر لانے کے لیے قابل مبارکباد ہیں، انھوں نے بالکل نئے موضوع کا انتخاب کیا۔ محترمہ شالو نے کتاب کے مشمولات کے بارے میں خطاب کیا، جب کہ ڈاکٹر جسیم الدین نے کلمات تشکر پیش کیے۔ تقریب کی نظامت شعبۂ سنسکرت دہلی یونیورسٹی کی ریسرچ اسکالر مدھو نے کی۔ اس موقعے پر سامعین ومیڈیا اہلکار کی بڑی تعداد موجود تھی۔ روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 19 اکتوبر 2022

تلاش

رامپور: گورنمنٹ خاتون پوسٹ گریجویٹ کالج کے شعبہ اردو کی صدر رضیہ پروین کی کتاب 'تلاش' کے اجرا کی ایک پروقار تقریب کا انعقاد مسجد چاہ خزان خاں میں محمد زبیر شمسی صدر گلوبل سوشل ویلفیئر سوسائٹی کی زیرنگرانی ہوا۔

سوشل ویلفیئر سوسائٹی اور مورل سوشل ویلفیئر سوسائٹی کے زیراہتمام اس پروگرام کے آرگنائزر ڈاکٹر اطہر مسعود خاں تھے، کنوینر شارق الرحمٰن خاں تھے۔ گورنمنٹ زنانہ پوسٹ گریجویٹ کالج کی سائیکولوجی کی ڈاکٹر صبیحہ پروین نے اپنے صدارتی خطاب میں رضیہ پروین کو مبارکباد دی اور ان کے روشن مستقبل کی خواہش کی۔ محمد اطہر مسعود خاں اور فیصل شاہ خاں نے سپاس نامہ پیش کیا۔ نعمان غازی نے نظامت کی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 19 اکتوبر 2022

بڑا کون

سولا پور: بھارتیہ اردو وکاس فاؤنڈیشن سولاپور کے زیراہتمام انڈین یوتھ اسوی ایشن سولاپور کے اشتراک سے منعقدہ اظہر فاضل کی افسانچہ نگاری اور محفل افسانچہ میں

مصنف شیخ شکیل اورنگ آباد کے کہانیوں کا مجموعہ بڑا کون کی رسم رونمائی مہمانان کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ اس موقعے پر بطور مہمانان اظہر فاضل، ارشد صدیقی، ندیم مرزا، پرنسپل اقبال تمبولی، غلام ثاقب و دیگر شریک تھے۔ ایوب نلامندو نے مبارک باد پیش کرتے ہوئے کہا موصوف گذشتہ کئی برسوں سے لکھ رہے ہیں اور نگ آباد جیسے ادبی مرکز میں اپنی شناخت بنانے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ اس موقعے پر اسیما شکور کے مضامین کے مجموعہ بارش کی بھی رسم رونمائی عمل میں آئی۔ ابوبکر نلامندو، اسلم سید، سلطان اختر، مظہر الوڑی، آفتاب نلامندو، و دیگر نے پروگرام کو کامیابی بنانے میں اہم رول ادا کیا۔

ریلیز: سلطان اختر، 23 اکتوبر 2022

ذکرِ عتیق

نئی دھلی: مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی نے ہندوستانی مسلمانوں کی فکری قیادت کی ہے۔ ماضی قریب کے ہندوستان

میں ایسے چند ہی لوگ ملیں گے، وہ ہندوستان کی عام صورت حال اور مسلمانوں کے حالات سے اچھی طرح واقف تھے اور اسی امتیازی خصوصیت کی بنا پر مولانا کو قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر محسن عثمانی ندوی نے ماہنامہ الفرقان کی خاص اشاعت 'ذکر عتیق' کی رسم اجرا کے موقعے پر غالب اکیڈمی، بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی میں کیا۔ صدارتی خطاب میں ڈاکٹر سید فاروق نے کہا کہ مولانا ہر بات کو سلیقہ کے ساتھ بیان کرنے کا ہنر رکھتے تھے اور اسی وجہ سے ان کے پڑھنے والوں کا ایک حلقہ تھا۔ جماعت اسلامی ہند کے نائب امیر مولانا محمد جعفر نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ مولانا ایک دیدہ ور صحافی، محقق اور مفسر قرآن تھے۔ ممتاز صحافی اور خبر دار جدید کے ایڈیٹر معصوم مرادآبادی نے کہا کہ ہم نے طالب علمی کے زمانے میں جو رسائل و جرائد پڑھے ہیں اور جنھوں نے ہماری ذہن سازی کی ہے ان میں ماہنامہ 'الفرقان' کا پہلا نمبر ہے۔ بزرگ صحافی منصور آغا نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ میرے لیے آج کی اس محفل میں شرکت باعث سعادت اس لیے ہے کہ آج کے زمانے میں کتنی محفلیں ایسی ہوتی ہیں جس میں کسی 'عتیق' کا ذکر ہو۔ تقریب کی صدارت ڈاکٹر سید فاروق نے کی جب کہ ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی علی گڑھ کے صدر مولانا رضی الاسلام ندوی اور جماعت اسلامی ہند کے نائب امیر مولانا محمد جعفر بطور مہمان خصوصی شریک ہوئے۔ مہمانوں کا استقبال جنید الرحمٰن ندوی نے کیا۔ نظامت کے فرائض مشہور صحافی سہیل انجم نے انجام دیے۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 14 اکتوبر 2022

ہارون شامی نمبر

لکھنؤ: بزمِ لاریب کے زیراہتمام معروف و خوش فکر شاعر ہارون شامی کی شخصیت اور فن 'ہارون شامی نمبر' کی رسم رونمائی کی تقریب مولانا محمد علی جوہر فاؤنڈیشن (امین آباد) میں ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کی موجودگی میں عمل میں آئی۔ صدارت کے فرائض ممتاز صحافی و افسانہ نگار احمد ابراہیم علوی نے انجام دیے۔ نظامت رضوان فاروقی نے کی اور مہمان خصوصی و مہمانانِ اعزازی کی حیثیت سے ڈاکٹر انیس انصاری، واصف فاروقی، پرویز ملک زادہ، سید فیصل رومی شریک تقریب رہے۔ مدیر 'لاریب' رشید قریشی نے 'ہارون شامی نمبر' کی اشاعت پر ادیبوں، شاعروں کی آمد اور مثبت اظہار خیال کو بڑی کامیابی بتایا۔ صدر ذی وقار احمد ابراہیم علوی نے کہا کہ شامی کے یہاں سادگی میں پرکاری کے جوہر نمایاں ہیں۔ ڈاکٹر انیس انصاری کے مطابق 40 برسوں تک پیہم لکھتے رہنا بذات خود کارنامہ ہے۔ پرویز ملک زادہ نے تعلق اور قرب کا اظہار کرتے ہوئے جہاں مدیر لاریب کو مبارکباد پیش کی وہیں کہا کہ ہارون شامی 40 برس قبل ہی بحیثیت شاعر خود کو تسلیم کرا چکے ہیں۔ رضوان احمد فاروقی کی رائے کچھ یوں تھی کہ ہارون شامی کو 'لاریب' سے مزید استحکام و اعتبار ملے گا۔ شاعر و ادیب واصف فاروقی نے کہا کہ ہارون شامی کی شخصیت کی نفاست ان کی شاعری میں رچی بسی ہے۔ معروف شاعر خالد فتح پوری کے مطابق مستقبل میں ہارون شامی پر جو تحقیقی کام ہوگا اس میں 'لاریب' بنیاد کی اینٹ ثابت ہوگا اور اس کے مطالعے کے بغیر بات آگے نہیں بڑھے گی۔ ڈاکٹر ہارون رشید نے کہا کہ مشاعروں کے شاعروں میں جو فنی عیوب نمایاں ہیں ان سے ہارون شامی کی شاعری بہت حد تک پاک ہے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 13 اکتوبر 2022

سہ ماہی 'سیما'

علی گڑھ: انجمنِ محبانِ اردو علی گڑھ کے زیراہتمام خیابانِ ادب ثمر ہاؤس دھرہ علی گڑھ میں ایک ادبی نشست میں

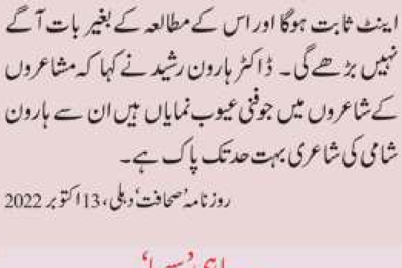

سہ ماہی 'سیما' ادبی مجلّہ علی گڑھ کے سرسید اور اے پی جے عبدالکلام نمبر کا اجرا پروفیسر ذکیہ اطہر صدیقی، پروفیسر صغیر افراہیم، معروف افسانہ نگار آصف اظہار علیگ، انجم قدوائی، ثنا فاطمہ، ادیبہ صدیقی اور طیبہ رحمان کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ نشست کی صدارت پروفیسر ذکیہ صدیقی نے کی۔ اس موقعے پر سہ ماہی 'سیما' کے مدیر اور معروف ادیب ڈاکٹر صغیر افراہیم نے کہا کہ یہ مجلّہ لگاتار ادب کے حوالے سے اپنی خدمات پیش کر رہا ہے، ہماری کوشش یہ رہتی ہے کہ ہم اس میں معروف و منفرد ادبا کی تخلیقات کو جگہ دیتے رہیں۔ اس بار ہم نے سرسید اور اے پی جے عبدالکلام نمبر نکالا ہے جس میں سرسید شناسی کے حوالے سے نہایت ہی قیمتی مضامین یکجا کیے گئے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اس میں میزائل مین اے پی جے عبدالکلام کے سلسلے سے بھی شاندار مضامین ہیں۔ اس کے علاوہ اس میں تنقیدی مضامین کے ساتھ ساتھ عصر حاضر کے ممتاز افسانہ نگاروں کے افسانے اور منفرد لب و لہجہ رکھنے والے شعرا کی غزلیں اور نظمیں موجود ہیں۔ ہم پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ ادبی مجلّہ ادب کے شائقین کو پسند آئے گا اور طلبہ و طالبات بھی اس سے مستفید ہوں گے۔ اس موقعے پر پروفیسر ذکیہ صدیقی نے کہا کہ پروفیسر صغیر افراہیم قابل ستائش ہیں کہ 'سیما' جیسا ادبی مجلّہ نکال کر اردو ادب کی خدمت انجام دے رہے ہیں اور ساتھ ہی ادبی صحافت کا بھی حق ادا کر رہے ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ اس تازہ مجلّے میں سرسید اور اے پی جے عبدالکلام پر جو مضامین ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ ان مضامین کے لکھنے والوں کے ساتھ ساتھ صغیر افراہیم اور مجلّے کی معاون مدیر ثنا فاطمہ کے انتخاب کی داد دینی ہوگی کیونکہ انھوں نے اس حوالے سے ایسے مضامین ترتیب دیے ہیں جو سرسید شناسی میں انتہائی معاون ہیں۔

روزنامہ 'اودھ نامہ' دہلی، 17 اکتوبر 2022

خان بہادر مولوی سید زین العابدین اور علی گڑھ موومنٹ

علی گڑھ: اگر ہم دنیا کی تاریخ پر غور کریں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اس مادہ پرست دنیا میں ہر انسان اپنی حیات جینا چاہتا ہے اس کی فکر اور سوچ کا محور اور دائرہ ہی اپنی محدود زندگی بن چکا ہے۔ ان خیالات کا اظہار علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر ریحان اختر نے 'خان بہادر مولوی سید زین العابدین اور علی گڑھ موومنٹ' کتاب کی رسم اجرا کے موقعے پر اپنے خطاب میں کیا۔ اس حوالے سے کتاب کے مصنف ڈاکٹر ریحان اختر قاسمی نے معلومات دیتے ہوئے بتایا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بانی سرسید احمد خان کے عزیز اور خاص رفیق خان بہادر مولوی سید زین العابدین کی حیات و خدمات پر مبنی کتاب خان بہادر مولوی سید زین العابدین اور علی گڑھ تحریک (انگریزی اور اردو زبان) کا محمد حسن پی جی کالج آڈیٹوریم

درخشاں ہاشمی کے شعری مجموعہ 'عشق دوبارہ ہوسکتا ہے' کا اجرا

محمد ساجد کی مرتب کردہ کتاب 'دہلی والوں کی تحریریں' کا اجرا

میں سابق چانسلر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد ظفر سریش والا، ایم پی سیما دویدی اور ڈاکٹر عبدالقادر خان کے ہاتھوں اجرا ہوا۔ انھوں نے بتایا کہ مولوی سید زین العابدین 14 جون 1832 کو اترپردیش کے ضلع جونپور کے مچھلی قصبہ میں پیدا ہوئے اور 27 ستمبر 1905 کو علی گڑھ میں وفات پائی۔ سید زین العابدین کا مقبرہ اے ایم یو کی تاریخی جامع مسجد میں سرسید احمد خان کے مقبرے کے قریب واقع ہے اور یونیورسٹی میں زین العابدین روڈ بھی ان کے نام سے منسوب ہے۔ انھوں نے کہا کہ سید زین العابدین کا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بانی سرسید احمد خان سے خاص لگاؤ تھا، انھوں نے خود اپنی نگرانی میں سرسید احمد خان کا مقبرہ تعمیر کرایا تھا اور آپ کا مقبرہ بھی یونیورسٹی کی جامع مسجد میں سرسید کے قریب واقع ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 23 اکتوبر 2022

عشق دوبارہ ہوسکتا ہے

مونگیر: جواں سال شاعرہ رخشاں ہاشمی کے پہلے شعری مجموعہ 'عشق دوبارہ ہوسکتا ہے' کا اجرا ہاشمی مسکن رضوی کالونی شاہ زبیر روڈ مونگیر میں ایک عظیم الشان تقریب میں ہوا۔ تاریخی شہر مونگیر کی معروف شاعرہ رخشاں ہاشمی کے کلام کی پذیرائی سالوں سے ہوتی رہی ہے اور قارئین کی خواہش تھی کہ کتابی شکل میں ان کا شعری مجموعہ منظر عام پر آئے۔ اسی خواہش کی تکمیل کے پیش نظر 'عشق دوبارہ ہوسکتا ہے' نامی شعری مجموعہ کو شاندار کتابت وطباعت اور دیدہ زیب پیرہن کے ساتھ منظر عام پر لایا گیا ہے۔ رسم اجرا کی تقریب میں شعرا و ادبا و دانشوران کے بیانات کا اہتمام کیا گیا۔ صدر جلسہ پروفیسر یدونندن جھا دویج نے شاعرہ کے روشن مستقبل اور مزید ادبی خدمات کے لیے دعائیں کیں۔ اس موقعے پر ہندی کے مشہور کوی جیوتی سنہا نے کتاب پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ شاعرہ کا کلام سن کر پاکستان کی معروف مرحومہ شاعرہ پروین شاکر کی یاد آتی ہے۔ جناب راجیو سنگھ نے اپنے اظہار خیال کے دوران کہا کہ اس تصنیف میں شاعرہ نے عشق اور نفرت کے درمیان خط تفریق کھینچی ہے جو بیحد دلچسپ ہے۔ پروفیسر اقبال حسن آزاد نے کتاب کی پرزور ستائش کرتے ہوئے کہا کہ اس کتاب کا عنوان چونکانے والا ہے۔ انھوں نے اس کا ایک شعر بھی پڑھا۔ تقریب سے خطاب کرتے ہوئے مولانا عبداللہ بخاری نے کہا کہ شاعرہ کی محنت وجدوجہد کا عملی نمونہ ان کی یہ تصنیف ہے۔ اس سے نوجوان شعرا کے اندر تحریک پیدا ہونی چاہے۔ انھوں نے اعتراف کیا کہ رخشاں مونگیر کی ایک معتبر شاعرہ ہیں۔ ان کے کلام دلکش اور لائق تحسین ہیں۔ رسم اجرا کی تقریب ساہتیہ پرہری اور اردو فورم کے بینر تلے منعقد ہوئی۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 26 اکتوبر 2022

آبشار حیات

مئو: مدرسہ اسلامیہ کاشف العلوم قصبہ رسول آباد میں تقریب رسم اجرا منعقد ہوئی۔ اس موقعے پر مولانا احمد علی قاسمی رسول آبادی کی کتاب آبشار حیات کا اجرا علما کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے تشریف لائے مولانا بلال عبدالحی حسنی نائب ناظم دارالعلوم ندوۃ العلما نے رسم اجرا کے موقعے پر خطاب کرتے ہوئے کہا کہ آپ سبھی لوگ مبارکباد کے مستحق ہیں کہ مولانا احمد علی قاسمی آپ کے دیار کے ہیں، آبشار حیات میں دراصل قرآن کے متعلق اہم مضامین شامل ہیں، کتاب کے مترجم مولانا ڈاکٹر شیر افگن ندوی مدرس مدرسہ عالیہ عرفانیہ نے کہا کہ مولانا احمد علی قاسمی ایک ذی علم اور باصلاحیت عالم ہیں، ان کے زیر سایہ طالب علم تربیت پانے والا ذی استعداد بھی ہوتا تھا۔ کتاب اور صاحب کتاب کا تعارف مفتی محمد جنید قاسمی استاذ شعبۂ عربی مدرسہ مفتاح العلوم گنج مرادآباد نے پیش کیا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 17 اکتوبر 2022

دہلی والوں کی تحریریں

نئی دهلی: انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں محمد ساجد کی مرتب کردہ کتاب 'دہلی والوں کی تحریریں' کی رسم اجرا کی تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ یہ کتاب کورونا وبا کے دوران دہلی یوتھ ویلفیئر ایسوی ایشن کے زیر انتظام حضرت شاہ ولی اللہ پبلک لائبریری کی سمینار سیریز' کے مقالات کا مجموعہ ہے۔

انور عبداللہ نے استقبالیہ کلمات سے اس تقریب کا باضابطہ آغاز کیا اس دوران انھوں نے ڈائیوا کے 30 سالہ سفر کو حاضرین کے سامنے پیش کیا۔ کتاب کی رسم اجرا پروفیسر شریف حسین قاسمی (سابق صدر شعبہ فارسی)، پروفیسر ریاض عمر (سابق پرنسپل، ذاکر حسین پی جی ایوننگ کالج)، ڈاکٹر اطہر فاروقی (جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند)، محمد نعیم (صدر دہلی یوتھ ویلفیئر ایسوسی ایشن) کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ اس کتاب میں 16 مضامین ہیں جو تین مختلف زبانوں میں لکھے گئے ہیں، یہ تمام مضامین ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ صدر جلسہ پروفیسر شریف حسین قاسمی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اس کتاب میں شامل تمام مضامین ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں، میں نے اس کتاب کو پڑھا ہے، ہر مضمون اپنے طور پر آزادانہ، کافی دلچسپ اور اہم ہے۔ مہمان مکرم پروفیسر ریاض عمر نے کہا کہ کوشش کرنا ہی ایک بڑی کامیابی ہے، مقالات کو اکٹھا کرنا انھیں ترتیب دے کر کتاب کی شکل میں شائع کرنا یقیناً قابل تعریف ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 17 اکتوبر 2022

سہ ماہی 'ادب عالیہ'

نئی دهلی: تسمیہ آڈیٹوریم، بٹلہ ہاؤس میں بین الاقوامی ادبی رسالہ ادب عالیہ کا اجرا عمل میں آیا، جس میں ڈاکٹر سید فاروق نے کہا کہ اس عہد میں ایک اردو ادبی رسالہ نکالنا خوشی کی بات ہے، خدا اس رسالے کو کامیاب بنائے۔ پروفیسر ابن کنول نے رسالہ کے مدیر ڈاکٹر فریاد آزر کو اس اہم کارنامہ پر مبارکباد پیش کرتے ہوئے امید ظاہر کی کہ اردو ادیب اسے اپنائیں گے اور ادب عالیہ میں شائع ہونا فخر کی بات محسوس کریں گے۔ معروف ادیب حقانی القاسمی نے ادب عالیہ کی اصطلاح کو کلاسیکی ادب کا ہم معنی قرار دیا اور اردو ادب کے لیے نیک شگون قرار دیا۔ ڈاکٹر خالد مبشر نے اسے اردو رسائل میں ایک بہترین اضافہ قرار دیا۔ ڈاکٹر ایم آر قاسمی نے ادب عالیہ کو اس دور کا اہم ادبی رسالہ بتایا، جو عالمی طور پر مقبول ہو رہا ہے۔ محفل میں ادب عالیہ کے مدیر ڈاکٹر فریاد آزر نے اردو کے زوال کا ذمے دار خود اہل اردو کو قرار دیتے ہوئے کہا کہ اردو عوام اپنی نئی نسل کو اردو سے نا آشنا رکھ رہے

ہیں اور اس میں انھیں کوئی تکلیف بھی نہیں ہو رہی ہے۔ پروگرام کا دوسرا حصہ ایک مشاعرہ پر مبنی تھا جس کی صدارت پروفیسر شہپر رسول نے کی اور نظامت حامد علی اختر نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 18 اکتوبر 2022

وفیات

جعفر رضا

پریاگ راج: شعبۂ اردو، الہ آباد یونیورسٹی کے سابق صدر پروفیسر جعفر رضا کا 10 نومبر کو کے آنند ہاسپٹل میں انتقال ہوگیا۔

پروفیسر جعفر رضا یکم دسمبر 1939 کو اتراؤں الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے پبلک ہائر سیکنڈری اسکول اتراؤں الہ آباد، مجیدیہ اسلامیہ انٹر کالج، الہ آباد یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی۔ بی کام، ایل ایس جی ڈی کے علاوہ انھوں نے اردو سے ایم اے اور ڈی فل کی ڈگریاں حاصل کیں۔ شعبہ اردو الہ آباد یونیورسٹی میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ ان کی تنقید و تاریخ سے متعلق کتابوں میں پریم چند: کہانی کا رہنما، پریم چند: فن اور تعمیر فن (اردو ہندی ناولوں اور کہانیوں کا تقابلی مطالعہ)، دبستانِ عشق کی مرثیہ گوئی، ہندی میں آدھونک اردو کاویہ ساہتیہ قابل ذکر ہیں۔ ترتیب و انتخاب کے ذیل میں توبۃ النصوح، لغات ہیرا، انتخاب بوستان سعدی، نیرنگ خیال حصہ اول، میر کی چند مثنویاں، کلیات فراق شامل ہیں۔ بچوں کے لیے انھوں نے اقبال کی بال رچنائیں ہندی میں تحریر کی اور بچوں کے ہی کے لیے ان کی ایک کتاب بعنوان 'اردو پہلی کتاب' ہے۔ ان کی شاعری کے دو مجموعے 'برف کی آگ' اور 'احساس کا سفر' ہیں۔ عبدالحلیم شرر پر ان کا مونوگراف ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی سے شائع ہوا۔ پروفیسر جعفر رضا شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی سے سبکدوش ہونے کے بعد شہر کے محلہ شاہ گنج میں رہتے تھے۔ ان کی تدفین شام کو ان کے آبائی وطن موضع اتراؤں میں ہوئی۔ پروفیسر علی احمد فاطمی نے مرحوم کو تعزیت پیش کرتے ہوئے کہا کہ وہ میرے استاد بھی تھے اور کلیگ بھی۔ ان کی کتاب 'پریم چند کہانی کا رہنما' کے سبب ادبی حلقہ میں انھیں خاصی شہرت ملی۔ فنِ مرثیہ نگاری پر وہ اچھی گفتگو کرتے تھے۔ سینئر ترقی پسند ادیب و ناقد ڈاکٹر فخر الکریم نے اپنے تعزیتی کلمات کہا کہ پروفیسر جعفر رضا کا شمار ماہرین پریم چند میں ہوتا تھا۔ ملازمت کے دوران وہ الہ آباد یونیورسٹی میں رہ کر مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ نوجوان ادیب و شاعر ڈاکٹر حسین جیلانی نے کہا کہ میں ان کا براہِ راست شاگرد تھا۔ انھوں نے بی اے اور ایم اے میں مجھے پڑھایا تھا۔ وہ کلاس میں میر انیس اور مرزا دبیر کے مرثیے عمدہ طریقے سے پڑھاتے تھے۔ کلاس میں ان کی بڑی دھاک ہوا کرتی تھی۔

روزنامہ 'قومی بھارت' دہلی 11 نومبر 2022 اور دیگر ذرائع سے

مینیجر پانڈے

نئی دہلی: ہندی کے نامور نقاد اور جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے مرکز برائے ہندوستانی زبان کے سابق صدر ڈاکٹر مینیجر پانڈے کا 6 نومبر کی صبح یہاں انتقال ہوگیا۔

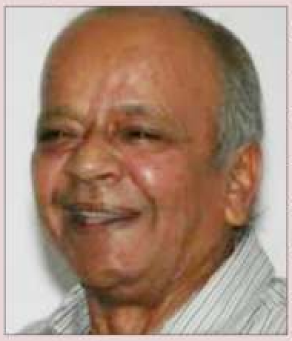

ان کی عمر 81 برس تھی اور گذشتہ کچھ دنوں سے علیل تھے۔ مسٹر پانڈے کے پسماندگان میں ان کی اہلیہ اور دو بیٹیاں ہیں۔ 23 ستمبر 1941 کو بہار کے گوپال گنج ضلع کے لوہاٹی گاؤں میں پیدا ہونے والے مسٹر پانڈے نامور سنگھ کے بعد کی نسل کے سب سے بڑے نقاد تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم گاؤں میں ہوئی اور اعلی تعلیم بنارس ہندو یونیورسٹی میں ہوئی، جہاں سے انھوں نے ایم اے اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ وہ جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے انسٹی ٹیوٹ آف لینگویجز، سنٹر فار انڈین لینگویجز میں ہندی کے پروفیسر تھے۔ وہ جے این یو میں ہندوستانی زبانوں کے مرکز کے صدر بھی تھے۔ اس سے پہلے وہ بریلی کے کالج اور جودھپور یونیورسٹی میں لیکچرر بھی رہ چکے ہیں۔ انھیں ہندی اکیڈمی کے دنکر سمان اور شالاکا سمان سے نوازا جا چکا ہے۔ وہ بھکتی کال اور سر ادب کے ماہر تھے۔ انھیں شہرت ادب کی کتاب اور تاریخ نویسی اور ادبیات میں سماجیات کے کردار سے ملی۔ ان کی مشہور تصنیف مغل بادشاہوں کی ہندی شاعری تھی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 7 نومبر 2022

ڈاکٹر کمار پانی پتی

پانی پت: اردو کے مشہور و معروف شاعر اور انگریزی کے استاد ڈاکٹر آر کے ملہوترا کمار پانی پتی کا 22 اکتوبر

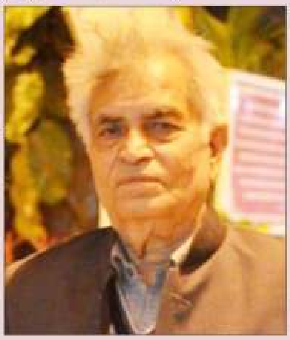

2022 کی دوپہر انتقال ہوگیا۔ ان کی پیدائش یکم جنوری 1938 کو پاکستان کے شیخو پورہ میں ہوئی تھی۔ وہ 1968 میں آئی بی کالج میں انگریزی کے پروفیسر بنے اور 1972 میں ایس ڈی پی جی کالج جوائن کیا۔ وہ اس شعبے کے صدر بھی رہے۔ ہندی، اردو اور انگریزی میں ان کی دو درجن سے زائد کتابیں ہیں۔ عہد ساز ادبی شخصیتیں، عہد نو کی سسکیوں کا ساز ہے میری غزل، یہ گلیاں ہیں مولانا حالی کی گلیاں، مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی کی یاد میں وغیرہ ان کی کتابیں ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے بابائے قوم مہاتما گاندھی کے 150ویں جنم دن کے موقعے پر 'السلام اے ہند کے شاہ شہیداں السلام' کے عنوان سے ایک کتاب بھی مرتب کی تھی اور گاندھی جی کو نذرانہ عقیدت پیش کیا تھا۔ انھیں خواجہ احمد عباس اور کنور مہندر سنگھ بیدی ایوارڈ بھی مل چکے ہیں۔ سال 18-2017 میں مولانا الطاف حسین حالی ایوارڈ سے نوازے گئے تھے۔ 2022 میں ہریانہ اردو اکیڈمی نے فخر ہریانہ ایوارڈ عطا کیا۔ آپ ڈاکٹر دولت رام صابر پانی پتی صاحب کے لائق شاگرد تھے۔ جاگرن کو انٹرویو دیتے ہوئے انھوں نے اردو زبان کے حوالے سے بڑی اہم بات کہی تھی کہ اردو بہت میٹھی زبان ہے، بول چال میں اردو غائب ہوئی تو ادب اور تہذیب بھی کم ہوتی گئی۔ آپ نہایت ہی نیک دل اور مخلص انسان تھے۔ زبان اردو میں ان کی ادبی خدمات لائق ستائش ہیں۔

ڈاکٹر ظنی و بھانازلی اور دیگر ذرائع سے

ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی

نئی دہلی: معروف ماہر اسلامی اقتصادیات ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی کا امریکہ میں 12 مئی کو انتقال ہوگیا۔ انھیں اسلامی اقتصادیات پر خدمات کے اعتراف میں عالم اسلام کا سب سے بڑے شاہ فیصل ایوارڈ سے بھی نوازا گیا تھا۔ انھوں نے دنیا بھر کی متعدد یونیورسٹیز میں خدمات انجام دیں۔ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں بھی ایک زمانے تک پروفیسر رہے۔ وہ کافی دنوں سے علیل چل

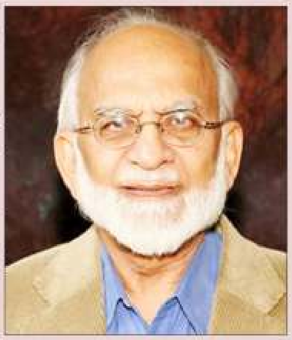

رہے تھے۔ وہ 1931 میں پیدا ہوئے اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ساتھ ساتھ رامپور اور اعظم گڑھ میں تعلیم حاصل کی۔ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں معاشیات کے ایسوسی ایٹ پروفیسر اور اسلامی علوم کے پروفیسر کے ساتھ ساتھ سعودی عرب کے جدہ میں واقع کنگ عبدالعزیز یونیورسٹی میں بھی اعزازی پروفیسر تھے۔ خیال رہے کہ ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی کو سنہ 1982 میں شاہ فیصل ایوارڈ دیا گیا تھا۔ وہ اردو اور انگریزی کے ممتاز ادیب تھے۔ ان کی کتابوں کے تراجم مختلف زبانوں مثلاً عربی، فارسی، ترکی، انڈونیشیائی، ملائشیا، تھائی اور دیگر زبانوں میں ہوچکے ہیں۔ ان کی کتاب سود کے بغیر بینکنگ، جو 1973 میں 2000 کے درمیان تین زبانوں میں 27 ایڈیشنوں میں شائع ہوئی اور دنیا بھر میں 220 لائبریریوں کے پاس دستیاب ہے۔ یہ کتاب شاید ان کی سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ہے۔ انھوں نے یونیورسٹی آف کیلیفورنیا، لاس اینجلس میں سینٹر فار نیئر ایسٹرن اسٹڈیز میں فیلو کے طور پر کام کیا اور جدہ میں اسلامی ترقیاتی بینک کے اسلامک ریسرچ اینڈ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ میں بطور وزیٹنگ اسکالر کام کیا۔ انھوں نے متعدد پی ایچ ڈی کی نگرانی کی ہے۔ اپنے طویل تعلیمی کریئر کے دوران ہندوستان، سعودی عرب اور نائیجیریا کی یونیورسٹیوں میں مقالے لکھے۔ وہ متعدد تعلیمی جرائد کے ایڈیٹر یا مشیر رہے۔ انھوں نے متعدد کمیٹیوں میں خدمات انجام دیں اور دنیا بھر میں متعدد کانفرنسوں میں شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 13 نومبر 2022

وی پاراؤ

شملہ: ہماچل پردیش کے سینئر صحافی اور ماہر تعلیم وی پاراؤ کا 1 نومبر کو انتقال ہوگیا۔ مسٹر راؤ کی عمر 76 سال تھی۔ انھوں نے حیدرآباد کے ایک اسپتال میں آخری

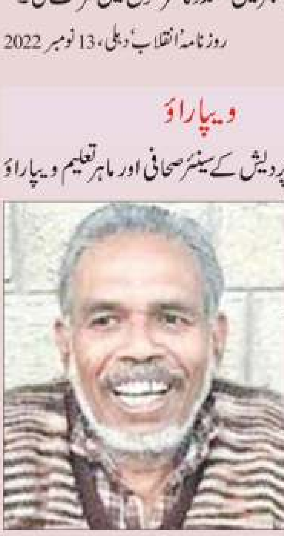

سانس لی۔ وہ گذشتہ کچھ دنوں سے علیل تھے۔ انھوں نے انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ماس کمیونیکیشن (آئی آئی ایم سی) کے علاوہ ہماچل پردیش یونیورسٹی شملہ کے شعبہ صحافت اور ماس کمیونیکیشن میں 1990 سے 2006 تک صحافت کی تعلیم میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ وہ کئی نامور اخبارات سے بھی وابستہ رہے۔ ہماچل پردیش کے وزیر اعلیٰ جے رام ٹھاکر نے وی پاراؤ کے انتقال پر تعزیت کا اظہار کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ شعبۂ صحافت اور صحافت کی تعلیم میں ان کی خدمات کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ ایشور ان کی روح کو سکون دے اور سوگوار خاندان کے افراد کو ہمت دے۔ اس کے علاوہ شملہ کے پریس کلب نے مسٹر راؤ کے انتقال پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا ہے۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 2 نومبر 2022

حامد علی خاں

شاہجہاں پور: بریلی کالج میں شعبۂ اردو کے سبکدوش پروفیسر ڈاکٹر حامد علی خاں کا 12 نومبر کو طویل علالت کے انتقال ہوگیا۔ وہ 80 برس کے تھے۔ شہر کے محلّہ بازوزئی اول میں رہنے والے ڈاکٹر حامد علی خاں گذشتہ چار ماہ سے سخت علیل چل رہے تھے۔ ان کا بریلی کے پرائیویٹ

ہسپتال میں علاج چل رہا تھا۔ ان دنوں وہ گھر پر ہی صاحب فراش تھے۔ 12 نومبر کی صبح 7:30 بجے انھوں نے آخری سانس لی۔ پسماندگان میں اہلیہ نشاط بیگم کے علاوہ چار شادی شدہ بیٹیاں و داماد ہیں۔ ڈاکٹر حامد علی خاں کی کئی تصنیفات شائع ہوچکی ہیں ان میں دل شاہجہاں پوری شخصیت اور فن، مت سہل ہمیں جانو اور روشنی کا سفر وغیرہ ہیں۔ وہ 1980 میں بریلی کالج کے شعبہ اردو اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوگئے تھے۔ وہ ایک ادیب، افسانہ نگار اور مضمون نگار بھی تھے۔ ان کے انتقال پر تمام علمی، ادبی، ملی و سماجی شخصیات نے گہرے رنج و غم کا اظہار کیا ہے۔ بعد نماز ظہر محلّہ کے آبائی قبرستان میں سوگوار کے ماحول میں ان کو سپرد خاک کردیا گیا۔

اردو اور ہندی کے اخبارات سے 16 نومبر 2022

اشرف استھانوی

پٹنہ: سینئر صحافی اور مصنف اشرف استھانوی کا 15 نومبر کو منگل کی شام فقیر باڑہ محلے میں واقع ان کی رہائش میں انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر تقریباً 55 برس تھی۔ ان کی پیدائش 2 فروری 1967 کو استھاواں میں ہوئی تھی۔

گاؤں کے مکتب سے ابتدائی حاصل کرنے کے بعد انھوں نے پٹنہ یونیورسٹی سے بی اے آنرس کیا۔ صحافت کی شروعات روزنامہ 'ہمارا نعرہ' کے رپورٹر کی حیثیت سے کی۔ روزنامہ قومی تنظیم (پٹنہ)، بلٹز (ممبئی)، انقلاب جدید (پٹنہ)، سیکولر بہار، ہفت روزہ چوتھی دنیا (نئی دہلی)، ہفت روزہ عالمی سہارا (نئی دہلی)، وغیرہ سے ان کی بہ حیثیت رپورٹر یا کالم نگار وابستگی رہی ہے۔ 'مسلم ٹوڈے' کے بیورو چیف بھی رہے۔ ان کی پہلی کتاب 'صدائے جرس' کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔ کہانیوں کا مجموعہ 'گزرے لمحوں کا انتظار' کے نام سے شائع ہے۔ ایک کتاب 'فاربس گنج کا سچ' بھی شائع ہوئی تھی۔ ان کے پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ دو بیٹیاں ہیں جن میں ایک بیٹی حافظہ بھی ہے۔ ان کے انتقال پر صحافتی تنظیموں نے تعزیت کا اظہار کیا ہے۔

روزنامہ 'تاثیر' پٹنہ، روزنامہ 'پندار' پٹنہ اور دیگر اخبارات سے 16 نومبر 2022

مظفر احمد لاری

لکھنؤ: مظفر احمد لاری کا بعمر 86 برس گذشتہ شب اپنی رہائش گاہ مقبول لاری منزل واقع سٹی اسٹیشن میں انتقال ہوگیا۔

موصوف شاعر تھے، ایک شعری مجموعے کے مصنف اور لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم اے تھے۔ اور والد پدم شری مقبول احمد لاری کی طرح ستھرا ادبی ذوق رکھتے

تھے۔ انتقال سے دو روز قبل بخار تھا مگر علاج کے باوجود جانبر نہ ہوسکے۔ پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ بیٹے محسن عظیم لاری، دو بیٹیاں، پسر زادے مقبول عظیم ہیں۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 10 نومبر 2022

عزیز الرحمٰن

لکھنؤ: سابق چیئرمین، اترپردیش اردو اکادمی اور تعلیمی میدان میں اپنی خدمات کے لیے پہچانی جانے والی معروف شخصیت عزیز الرحمٰن کا 4 نومبر کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کیمپس کی میڈیکل کالونی میں 85 برس کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ وہ 40 سال سے زائد عرصے تک بھارتیہ جنتا پارٹی سے وابستہ رہے۔ اترپردیش اردو اکیڈمی کے چیئرمین بھی رہے۔ عزیز الرحمٰن نے تعلیمی دنیا میں نمایاں کام کیا۔ انھوں نے دو مختلف کالج قائم کیے ایک لڑکوں کا انٹر کالج اور ایک لڑکیوں کا انٹر کالج جو مادھو سنگھ (ضلع بھدوہی) میں واقع ہے۔ ان دونوں اسکولوں نے اس علاقے کے بچوں کی تعلیمی ترقی میں انقلاب برپا کیا۔ انھوں نے گرلز ڈگری کالج کا قیام بھی شروع کیا تھا۔ عزیز الرحمٰن نے اپنی تعلیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے حاصل کی۔ ان کے پسماندگان میں اہلیہ اور تین بیٹے ہیں۔ ان کے دو بیٹے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں بطور ایسوسی ایٹ پروفیسر کام کر رہے ہیں۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی 10 نومبر 2022

نواب احمد

دیوبند: دیوبند کے مشہور و معروف خطاط محمد احمد مرحوم کے بڑے صاحب زادے اور عیدگاہ وقف کمیٹی دیوبند کے متولی محمد انس صدیقی کے برادر نسبتی نواب احمد کا اچانک ہارٹ فیل ہوجانے سے انتقال ہوگیا۔ ان کے انتقال کی خبر سن کر تمام عزیز و اقارب، رشتہ دار اور متعلقین کا ان کی رہائش گاہ محلّہ ابوالبرکات متصل سفید مسجد پر ہجوم جمع ہوگیا۔ نواب احمد کے اچانک انتقال ہوجانے سے اہل خانہ نہایت دلبرداشتہ اور صدمہ کی حالت میں ہیں۔ اس سانحہ وفات پر دارالعلوم دیوبند کے سابق استاذ حدیث مولانا بلال اصغر اور مولانا قمر عثمانی نے نواب احمد مرحوم کے اہل خانہ سے صدمہ کا اظہار کرتے ہوئے تعزیت مسنونہ پیش کی۔ ان کے علاوہ متاثر خاندان سے تعزیت کرنے والوں نے مرحوم کے لیے دعائے مغفرت کی۔ نواب احمد مرحوم نے اپنی پوری زندگی نہایت خاموش انداز اور بڑی جفاکشی کے ساتھ گزاری، نواب احمد مرحوم پیشہ سے خطاط تھے اور زندگی کی آخری سانسوں تک اسی پیشہ سے وابستہ رہے۔ مرحوم نہایت نیک خصلت اور سادہ لوح، صوم وصلوٰۃ کے پابند انسان تھے۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 11 اکتوبر 2022

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کا رکن کی سالانہ خریدار بننا چاہتا رچاہتی ہوں۔

150 روپے کا ڈرافٹ/ منی آرڈر.................. بتاریخ.............................. بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/150 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

....

پتہ : ....

....

دستخط

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.: magazines@ncpul.in

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

کلیات رشید احمد صدیقی جلد 8 (مضامین)

ترتیب وتدوین: ابوالکلام قاسمی

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 510

قیمت: 235 روپے

عہد وسطیٰ کا ہندوستان (حصہ اوّل)

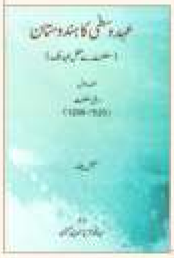

مصنف: ستیش چندر

مترجم: سید محمد عزیز الدین حسین

دوسری طباعت: 2022

صفحات: 348، قیمت: 170 روپے

حالی کی نظمیں

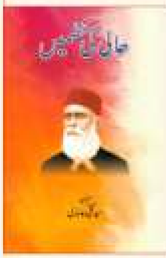

مرتب: سید تقی عابدی

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 66+262

قیمت: 160 روپے

کلیات راجندر سنگھ بیدی (جلد اول)

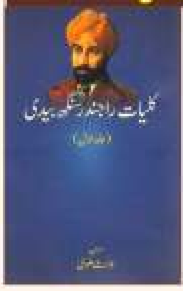

مرتب: وارث علوی

دوسری اشاعت: 2022

صفحات: 970

قیمت: 425 روپے

اردو ڈراما: تاریخ وتجزیہ

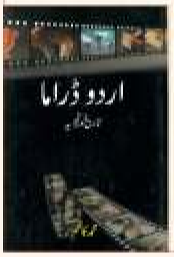

مصنف: محمد کاظم

پہلی اشاعت: : 2022

صفحات: 686

قیمت: 300 روپے

نظری تنقید: مسائل ومباحث

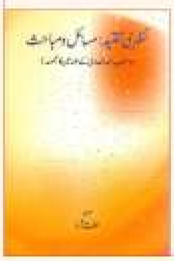

مرتبہ: عفت آرا

دوسری اشاعت: 2022

صفحات: 233

قیمت: 125 روپے

تشریح البدن (جلد دوم)

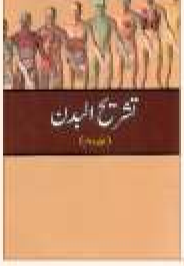

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 460

قیمت: 215 روپے

تاریخ طب یونانی (جلد اول)

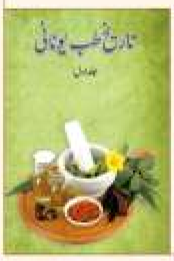

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 448

قیمت: 220 روپے

شعبہ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

उर्दू दुनिया, मासिक, दिसम्बर-२०२२,वर्ष:२४, अंक:१२
URDU DUNIYA Monthly, December-2022, Vol.24, Issue:12
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2020-22
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/11/2022
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month
Total Pages:100

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم وآگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: 90092010045326 ،A/C: IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail : sales@ncpul.in

شاخ : 22-7-110 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلیکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025
LPC DELHI,DELHI PSO,DELHI RMS,DELHI-6